مطالعۂ یہودیت

زوہیب احمد

فروغ زبان پبلشرز

مطالعہ یہودیت
زوہیب احمد

اردو میں یہودیت پر ایک مفصل کتاب

مطالعہ یہودیت

زوہیب احمد

فروغ زبان پبلشرز
لاہور۔ ساہیوال۔ بہاولپور

جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ ہیں
اس کتاب کے حقوق بحق مصنف "زوہیب احمد" محفوظ ہیں۔ کسی بھی قسم کی اشاعت مصنف کی تحریری اجازت کے بغیر نہیں کی جاسکتی۔ خلاف ورزی کی صورت میں مصنف قانونی کاروائی کا حق محفوظ رکھتا ہے۔
قانونی مشیر: معظم علی حسنین (ایل ایل بی، ایل ایل ایم، ایڈووکیٹ ہائی کورٹ)

نام کتاب	مطالعہ یہودیت
مصنف	زوہیب احمد
ناشر	فروغ زبان پبلشرز
طبع	اول
اشاعت	2021ء
قیمت	400روپے
آئی ایس بی این	978-969-7988-04-4
آن لائن خریداری	http://books.geonline.pk

التماس: اللہ کے فضل و کرم سے انسانی طاقت اور بساط کے مطابق کتاب کی پروف ریڈنگ، تسہیل، طباعت اور جلد بندی میں نہایت احتیاط برتی گئی ہے۔ تاہم غلطی کا احتمال بہر حال باقی رہتا ہے۔ بشری تقاضے اپنی جگہ ہیں۔ لہذا کتاب میں اگر سہواً کوئی غلطی رہ گئی ہو یا صفحات درست نہ ہوں تو مصنف، ناشر، پروف ریڈرز اور طابع ہر قسم کے سہو پر اللہ غفور الرحیم سے عفو و کرم کے خواست گار ہیں۔ قارئین سے گزارش ہے کہ کتاب میں اگر کسی بھی قسم کی غلطی یا خامی نظر آئے تو از راہ کرم مطلع فرمادیں تاکہ آئندہ ایڈیشن میں درستگی عمل میں لائی جاسکے۔

انتساب

کلیہ اصول الدین، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد کے اساتذہ کے نام جن کی رہنمائی سے میرے اندر مذاہب عالم کے مطالعہ کا شوق پروان چڑھا۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

لِكُلٍّ جَعَلۡنَا مِنۡكُمۡ شِرۡعَةً وَّمِنۡهَاجًا ؕ وَلَوۡ شَآءَ اللّٰهُ لَجَعَلَكُمۡ اُمَّةً
وَّاحِدَةً وَّلٰكِنۡ لِّيَبۡلُوَكُمۡ فِىۡ مَاۤ اٰتٰٮكُمۡ فَاسۡتَبِقُوا الۡخَيۡرٰتِ ؕ اِلَى اللّٰهِ
مَرۡجِعُكُمۡ جَمِيۡعًا فَيُنَبِّئُكُمۡ بِمَا كُنۡتُمۡ فِيۡهِ تَخۡتَلِفُوۡنَ ۙ ﴿القرآن 5:48﴾

ہم نے تم میں سے ہر ایک کے لیے ایک شریعت اور ایک راہِ عمل مقرر کی۔ اگرچہ تمہارا خدا چاہتا تو تم سب کو ایک اُمّت بھی بنا سکتا تھا، لیکن اُس نے یہ اِس لیے کیا کہ جو کچھ اُس نے تم لوگوں کو دیا ہے اس میں تمہاری آزمائش کرے۔ لہٰذا بھلائیوں میں ایک دُوسرے سے سبقت لے جانے کی کوشش کرو۔ آخر کار تم سب کو خدا کی طرف پلٹ کر جانا ہے، پھر وہ تمہیں اصل حقیقت بتا دے گا جس میں تم اختلاف کرتے رہے ہو۔

فہرست عنوانات

پیش لفظ .... ح

پہلا باب: تعارف 1

یہودیوں کے مختلف نام 3

عبرانی 3

اسرائیلی 3

سامی 4

یہودی 4

یہودی کون ہے؟ 5

پیدائشی یہودی 5

ملحد یہودی 7

مرضی سے بننے والے یہودی 9

موجودہ اسرائیلی قانون 12

یہودیت کے ابتدائی بزرگ 13

ابراہیمؑ 14

اسحاقؑ 17

یعقوبؑ 17

مشقی سوالات 18

دوسرا باب: موسیٰؑ سے ربیوں تک 21

دورِ خروج 23

موسیٰؑ اور بنی اسرائیل کی تشکیل نو 23

ارضِ موعود 24

قاضیوں کا دور 25

قاضی کا انتخاب 26

قاضیوں کے دور کی تاریخ 26

بادشاہوں کا دور 27

ساؤل کا دور 27

داؤدؑ کا دور 28

سلیمانؑ کا دور 30

متحدہ اسرائیل کی تقسیم 31

شمالی ریاست کی علیحدگی 31

شمالی ریاست کی تباہی 32

جنوبی ریاست و ہیکل الٰہی کی تباہی 33

جلاوطنی کا زمانہ 34

بابلی دور 35

فارسی دور 36

بابلی اور فارسی دور کے اثرات 37

جلاوطنی کے بعد کا زمانہ 37

ہیکل کی تعمیر نو 38

فتوحات سکندر 39

یونانی جرنیلوں کا دور 40

ہیلینیت کا عروج 41

یونانیوں کا یروشلم پر قبضہ 42

مکابی خاندان کی حکومت 43

رومیوں کا دور.......................46

جولیس سیزر کا عہد 46

ہیروڈ کی حکومت 47

مجلس صنہادرین......................49

رومیوں کے خلاف بغاوتیں 50

ہیکل کی دوسری تباہی 51

یروشلم سے بے دخلی 52

یہودیت کی نئی تشریحات 53

مسیحیت کا عروج 55

بابلی یہودیت 56

بابل کی طرف ہجرت 57

بابل میں ربیائی یہودیت کا فروغ 57

مشقی سوالات 58

تیسرا باب: عہد اسلامی سے عصر حاضر تک 65

مسلم دور حکومت کے یہودی..........67

عہد نبویؐ........................... 67

عہد عمر ابن خطابؓ 68

عباسی دور 71

اموی سپین 72

مرابطی دور........................ 74

موحدون کا دور 75

فاطمی دور........................ 76

ایوبی دور 78

مملوک دور....................... 78

خلافت عثمانیہ 79

یہودی ثقافت پر مسلم اثرات 83

یورپی یہودیوں کی زندگی 83

صلیبی سپین کے یہودی باسی 84

دیگر ممالک میں یہودی زندگی 86

یہودی نشاۃ ثانیہ 90

سامی مخالفت کا عروج 92

خود مختار یہودی ریاست کا حصول...... 93

محبان صہیون کا کردار 94

صہیونیت کا کردار.................. 95

فلسطین پر حملہ 96

اسرائیل کا قیام 96

سامی مخالفت کی نئی لہریں 98

مشقی سوالات 100

چوتھا باب: کتب مقدسہ 107

تنخ 109

توریت 111

نبی 114

کتابیں 116

مشہور تراجم 118

زبانی قانون 121

مشنا 121

جیمارا 123

تلمود 123

دیگر مذہبی کتب و اصناف 124

غیر ملہم کتب 124

ہلاخا 125

سیدور 126

مدراش 126

بحر میت کے مخطوطات 127

مشقی سوالات 127

پانچواں باب: عقائد و عبادات 131

عقائد 133

خدا اور تصور خدا 134

منتخب قوم 136

احکام عشرہ 137

ابن میمون کے تیرہ اصول 138

مسیح موعود 139

حیات بعد الموت 140

نبوت 141

عبادات 142

قربانی 142

قدیم مقدس زیارتیں 144

روزہ 145

نماز 147

صدقات 149

مشقی سوالات 152

چھٹا باب: تہذیب و ثقافت 155

بنیادی رسوم رواج 157

ختنہ 158

تقریب کفارہ 160

بار/بات متسواہ 161
سبت 162
شادی 165
وفات اور ماتم 166
تہوار 168
یہودی کیلنڈر 169
روش ہشانہ 170
یوم کپور 172
سکوت 173
پیشاخ 175
شووس 177
تیشا باؤ 178
ہنوخا 178
پیوریم 179
اسرائیلی تہوار 179
دیگر یہودی تہوار 181
مشقی سوالات 182
ساتواں باب: فرقے 187
قدیم فرقے 189
سامری 190
حسیدی 191
فریسی 191
صدوقی 193
اسینی 194
زیلوٹ 196
تھراپیٹی 197
قرائٹ 198
عصر حاضر کے فرقے 200
اصلاح شدہ یہودیت 201
رجعت پسند یہودیت 206
راسخ العقیدہ یہودیت 210
نواشتراکی یہودیت 213
انسانیت پسند یہودیت 214
سیاہ یہودیت 214
مشقی سوالات 215
آٹھواں باب: روحانی نظام 221
یہودی روحانیت کے ابتدائی مظاہر 223
ابراہیمؑ کے روحانی تجربات 224
حزقی ایل کے روحانی تجربات 224
مرکبہ روحانیت 225

تخلیق اور صفروت................226

حسیدی اشکناز 228

قبالہ 230

بہیر اور قبالہ کی ترویج............230

نبوی قبالہ 231

زوہر وصفروت کی نئی تشریحات 232

لوری قبالہ.......................237

حسیدیت 239

مشقی سوالات 241

کتابیات........................ 245

پیش لفظ

تمام تعریفیں اللہ کے لیے جو معبود بر حق ہے اور لاکھوں درود نبی آخر الزماں، **محمد مصطفی** ﷺ پر جن کی ذات تمام جہانوں کے لیے باعث رحمت ہے۔ علمائے اسلام کو یہ فخر حاصل ہے کہ ان کے معاشی، معاشرتی یا قومی حالات چاہے کچھ بھی رہے ہوں انہوں نے خدمتِ دین کے لیے ہمیشہ خود کو وقف کیے رکھا ہے۔ ان کی یہ کاوشیں اسلامی علوم، مثلاً قرآن، حدیث، فقہ، سیرت یا اسلامی تاریخ تک ہی محدود نہیں رہیں بلکہ انہوں نے دیگر مذاہب پر بھی حسبِ ضرورت اور حسبِ استطاعت اپنا نقطہ نظر قلم بند کرنے کی کوشش کی ہے۔ عصر حاضر کے مسلمانوں نے اسلامی علوم کی نسبت دیگر مذاہب کے مطالعہ پر کم توجہ دی ہے۔ اردو جیسی پُر شکوہ زبان کا دامن اس ورثہ سے خالی ہوتا جا رہا ہے۔ طلبہ کو پڑھنے کے لیے جو کتب دستیاب ہیں ان میں سے بیشتر سالوں پرانی ہو چکی ہیں۔ نئی مذہبی کتب، تحریکوں اور مناہج کا مزاج اس قدر بدل چکا ہے کہ ان پرانی تصانیف سے دیگر مذاہب کو سمجھنا متعدد مقامات پر لا حاصل محسوس ہوتا ہے۔ البتہ کچھ کتب اب بھی ایسی ہی شاندار ہیں کہ ان کی اہمیت پر زمانے نے کسی قسم کا گرد و غبار چڑھنے نہیں دیا۔ البتہ یہ ضرور ہوا ہے کہ ہمارے کتب خانوں میں ان کے نہ ہونے یا کتب خانوں میں ہمارے نہ ہونے کی وجہ سے ہم ان سے مستفید نہیں ہو سکے۔

عبد الحلیم شررؒ (1860 - 1926) کی **تاریخ ارض المقدس** بھی ایسی ہی ایک جامع تصنیف ہے جس کی اہمیت زمانہ گزرنے کے ساتھ ساتھ مزید بڑھتی نظر آتی ہے۔ 1925 میں چھپنے والی اس کتاب کے دو حصے ہیں: پہلے حصے کو مصنف نے "تاریخ یہود" کا نام دیا ہے اور اس میں یہودیوں کی تاریخ کے ساتھ ساتھ ان کے مذہبی ارتقا کو بھی مختصراً بیان کیا گیا ہے۔ بیت المقدس کی دوسری تباہی کے ساتھ یہ حصہ ختم ہو جاتا ہے اور "مسیح اور مسیحیت" کے عنوان سے دوسرا حصہ شروع ہوتا ہے جس میں آپؑ کی پیدائش سے پہلے تک کی مسیحیت کی تاریخ اور عقائد پر گفتگو کی گئی ہے۔ وصفی انداز میں لکھا گیا اس کا پہلا حصہ جہاں مصنف کے زور قلم کو ظاہر کرتا ہے وہیں موضوع پر مصنف کے وسعتِ مطالعہ کا منہ بولتا ثبوت بھی ہے۔ کتاب کے مآخذ میں بائیبل کے علاوہ عربی اور انگریزی تصانیف بھی استعمال کی گئی ہیں۔ زیادہ تر تواریخ کو عیسوی

کیلنڈر کی بجائے محمدی کیلنڈر (مثلاً سنہ 586ق محمد) کے حساب سے درج کیا گیا ہے۔ بعض مقامات پر واقعات کا اسلامی تراث سے تقابل کر کے درست قول بیان کرنے کی کوشش بھی کی گئی ہے۔ شررکا بنیادی مقصد چونکہ بیت المقدس کی تاریخ رقم کرنا تھا لہذا یہودیوں کی مجموعی تاریخ اور خاص طور پر مسلمانوں، صلیبیوں اور یورپ کی دیگر اقوام کے ساتھ گزرے ان کے شب و روز کے متعلق معلومات اس کتاب میں شامل نہیں ہیں۔

یہودیت: تاریخ، فطرت اور عزائم کے عنوان سے چھپنے والی ایک اور اہم کتاب کے مصنف یوسف ظفر (اصل نام، شیخ محمد یوسف)(1914-1972) ہیں جو کہ ایک نامور ادیب تھے۔ اردو میں یہ ان گنی چنی کتابوں میں سے ایک ہے جن کے مصنفین نے یہودیت کے مطالعہ میں تلمود کو بھی بطور ماخذ استعمال کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ کتاب وصفی اور مناظرانہ طرز بیان کا مجموعہ ہے جس سے ظفر کی زبان دانی کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ مصنف نے چار ہزار سالہ تاریخ کو بیان کرتے ہوئے یہودیوں کے ان اعمال کی طرف اپنے قارئین کی توجہ بھی مبذول کروائی ہے جو عبرانی بائبل کے مطابق گناہ کے زمرہ میں آتے ہیں اور یہودی مذہبی پیشواؤں کی ان کاوشوں کا بھی ذکر کیا ہے جو انہوں نے اپنے مذہب کی ترویج میں صرف کی ہیں۔ کتاب کے آخری ابواب میں فلسطین پر یہودی قبضے کے متعلق معلومات پیش کرتے وقت صاحب کتاب نے یورپی مصنفین کی تحریروں کے ذریعے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ جدید اسرائیل کا قیام کسی طرح بھی منصفانہ نہیں ہے۔ یہود نے یہاں خود غرضی اور بے توجہی سے کام لیتے ہوئے فلسطینی عربوں کا حق غصب کیا ہے۔

یہودیت و مسیحیت کے عنوان سے احسان الحق رانا کی ایک کتاب 1981 میں منظر عام پر آئی۔ کتاب کے ابتدائی صفحات سے پتہ چلتا ہے کہ مصنف نے کتاب کا مسودہ مکمل کر کے مختلف مسیحی علما کو رائے زنی کی دعوت دی تھی۔ کتاب کی اشاعت سے پہلے ہی پنجاب پولیس نے ایک مسیحی معالج، ایل پیٹرک، کی درخواست پر مصنف اور مسودے کو زیر حراست لے لیا۔ رانا پر مقدمہ چلا جس میں بعدازاں انہیں بَری کر دیا گیا۔ مختلف یورپی مصنفین کی تصنیفات کے ذریعے یہودی و مسیحی کتبِ مقدس کا تنقیدی مطالعہ اور بائبل و قرآن کے ذریعے یہودیت و مسیحیت کی تاریخ و عقائد کا بیان اس کتاب کے بڑے موضوعات ہیں۔ آخر میں ان مسیحی علما کے بیانات بھی

درج ہیں جن کو مصنف نے کتاب کا مسودہ بھیجا تھا۔ ان بیانات کے مطابق: "ساری کتاب مسیحیت کے بارے میں غلط بیانیوں سے پُر ہے" یا "جتنی کتابیں مسیحیت کے خلاف آج تک لکھی گئی ہیں یہ کتاب سب سے زیادہ بو گھس کمزور ہے۔"[1] مصنف کے پیش کردہ نتائج سے اختلاف کی گنجائش تو نکل سکتی ہے تاہم اسے "تعصب سے پُر" کہنا شاید ناانصافی ہو جبکہ مصنف نے ملک بھر کے بیسیوں مسلم و غیر مسلم علما کو اس کتاب کے مسودے کی نقول اس لیے بھجوائی ہوں کہ اشاعت سے پہلے ممکنہ حد تک اس کو بہتر کیا جا سکے۔

ابوالاعلی مودودیؒ کی مختلف تصنیفات سے یہودیت پر لکھی جانے والی تحریروں کو اکٹھا کر کے **یہودیت قرآن کی روشنی میں** کے عنوان مرتب شدہ ایک کتاب بھی اس موضوع پر دستیاب ہے۔ اس کتاب کا دوسرا ایڈیشن 1985 میں شائع ہوا۔ جیسا کہ عنوان سے ظاہر ہے کہ اس کتاب میں قرآنی نقطہ نظر سے یہودیت کا مطالعہ کر کے یہودیوں کے بارے میں اسلامی تصور پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ متعدد مقامات پر قرآن اور عبرانی بائیبل کے مشترکہ مضامین کا تقابل کر کے ایک حد تک یہودی نقطہ نظر بھی قارئین کے سامنے رکھا گیا ہے۔ **یہودیت قرآن کی روشنی میں** کے عنوان ہی سے 1987 میں ایک کتاب عبدالکریم پاریکھ نے تصنیف کی تھی جس میں بھی تقریباً اسی انداز میں یہودیت سے متعلق قرآنی آیات کے ذریعے یہودیت پر گفتگو کی گئی ہے۔ پاریکھ کا خیال تھا کہ مسلمانوں کی یہودیت سے لاعلمی درحقیقت قرآن کے ایک چوتھائی حصے سے لاعلمی کے مترادف ہے۔ اول الذکر کتاب کا آخری باب اس لحاظ سے منفرد ہے کہ اس میں جدید اسرائیلی ریاست کے قیام کے متعلق گفتگو کی گئی ہے۔ اس ریاست کے قیام کا پس منظر بتاتے ہوئے یہ استدلال کیا گیا ہے کہ تیرہ سو سال قبل مسیح، یہودیوں نے فلسطین میں موجود دیگر اقوام کی نسل کشی کے ذریعے اس پر بزور طاقت قبضہ کیا تھا۔[2] سلطنت عثمانیہ کے زوال نے انہیں ایک موقع اور عطا کیا کہ وہ برطانوی راج کو فلسطینی عربوں کے خلاف استعمال کر کے بزور قوت اپنی نئی ریاست بھی اس جگہ قائم کر لیں۔ مزید براں، اس باب میں ان عربوں اور ترکوں کی نشاندہی بھی کی گئی ہے جو صاحب کتاب کے مطابق مسلم ریاستوں کے زوال کا سبب بنے۔ اقوام متحدہ کی اس مجلس انصاف کو بھی آڑے ہاتھوں لیا گیا ہے جس نے 33 فیصد یہودیوں کو فلسطین کا 55 فیصد رقبہ دینے کا اعلان کیا تھا۔ امریکہ کی اس تاریخی روایت کا بھی ذکر کیا گیا ہے جس کے

مطابق وہ ابتدا ہی سے اسرائیل کی یک طرفہ حمایت کر رہا ہے۔ اس طرح یہ کتاب یہودی مذہب اور صہیونی بالادستی کے خلاف مسلمانوں کا ردعمل سمجھی جاسکتی ہے جس کا بھرپور اظہار بعد میں لکھی جانے والی کتب میں بھی دکھائی دیتا ہے۔ آخری باب میں مصنف نے یہودی اور صہیونی کو مترادف معنوں میں استعمال کرتے ہوئے ان راسخ العقیدہ یہودیوں کو نظر انداز کر دیا ہے جو فلسطین پر صہیونی قبضے کی علی الاعلان مخالفت کرتے تھے/ہیں۔

نہ صرف درج بالا کتب بلکہ اس موضوع پر لکھی گئی دیگر تصنیفات بھی زیادہ تر اس فرق کو ملحوظ خاطر نہیں رکھتیں جس کی وجہ سے یہودیت کی بجائے صہیونیت کا بیان موضوعِ سخن بن جاتا ہے، مثلاً **صہیونیت قرآن مجید کے آئینے میں** کے عنوان سے مختار صدیقی کی ایک تصنیف بھی موجود ہے جو اولین یہودیوں کو بھی صہیونیوں کے طور پر پیش کرتی ہے۔ مسلمانوں کے نزدیک، جدید اسرائیلی حکمرانوں کا فلسطینی عربوں سے یک طرفہ سلوک اور مسجد اقصیٰ کے مذہبی تقدس کی پامالی آئے دن ان کے جذبات مجروح کرنے کا سبب بنتی ہے۔ صہیونی طرزِ عمل کی مخالفت اس لحاظ سے ان کا ایک فطرتی ردعمل ہے جس کو دبانا متعدد تاریخی حقائق چھپانے کے مترادف ہے جو نہ صرف اسلام یا یہودیت بلکہ مجموعی انسانی تاریخ سے بھی ناانصافی کے زمرہ میں آسکتا ہے۔

1985 میں چھپنے والی **رسول اکرمؐ اور یہود حجاز** کو اس حوالے سے یہ اعزاز حاصل ہے کہ اس میں اولین مسلم یہودی تعلقات پر محققانہ گفتگو کی گئی ہے۔ برکات احمد کی کتاب **محمد اینڈ دی جیوز** کا یہ ترجمہ مشیر الحق کا کیا ہوا ہے۔ تراجم پر بحث کو راقم الحروف نے اس پیش لفظ میں شامل نہیں کیا تاہم اس ترجمے میں بقول مصنف کے اردو دان طبقے کی آسانی پیشِ نظر رکھتے ہوئے نئی تبدیلیاں اور تشریحات شامل کی گئی ہیں جو انگریزی میں چھپنے والی کتاب میں موجود نہیں۔ عہد نبوی کے مسلم یہودی تعلقات کو سمجھنے کے لیے ہمارے پاس **سیرت ابن اسحاق** سے بہتر کتاب موجود نہیں ہے۔ خود اس دور کے یہودیوں کی کوئی ایسی تصنیف دستیاب نہیں جس سے ان کے واقعات کے متعلق یہودی نقطہ نظر سے واقفیت حاصل ہو سکے۔ اس لیے مسلم و غیر مسلم محققین ابن اسحاقؒ (704-767) کی روایات کے ذریعے ہی آپؐ اور حجاز میں موجود مختلف یہودی قبائل کے تعلقات کو جاننے کے لیے مجبور ہیں۔ عموماً مسلمانوں کی کتب میں مشہور یہودی قبائل بنو قینقاع، بنو قریظہ اور بنو نضیر کو ان واقعات کا ذمہ دار مانا جاتا ہے جن کی وجہ سے اس دور

کے مسلم یہودی تعلقات میں کشیدگی آئی۔ اس ضمن میں چونکہ غیر مسلم مصنفین بھی ابن اسحاقؒ کی روایات کو موضوعِ تحقیق بناتے ہیں لہذا ان روایات کا تنقیدی جائزہ لیتے وقت وہ زیادہ تر ایسے واقعات کو موضوعِ سخن بناتے ہیں جن سے مسلمانوں کی کوتاہیاں سامنے لائی جا سکیں۔ یہودی محققین بطور خاص ان قبائل کی مدینہ سے بے دخلی، بنو قریظہ کے یہودیوں کا قتل اور خیبر کی فتح کو اہمیت دیتے ہیں (زیر نظر کتاب میں بھی راقم الحروف کا بنیادی مقصد یہودی نقطہ نظر اردو خواں قارئین کے سامنے لانا ہے جس کی وجہ سے اس کتاب کا تیسرا باب بھی زیادہ تر ان نظریات پر مبنی ہے جو یہودی پیش کرتے ہیں)۔ برکات احمد نے وصفی انداز میں ان واقعات کو مفصل بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس ضمن میں انہوں نے مسلم دور حکومت میں رہنے والے یہودیوں کے حالات بھی جزوی طور پر ذکر کیے ہیں۔

یہودیوں کی چالیس بیماریوں کے عنوان سے ایک کتاب 1999 میں مسعود اظہر نے لکھی جس میں زیادہ تر اسلامی کتب کے ذریعے یہودیوں کی برائیاں بیان کرتے ہوئے مصنف نے مسلمانوں کو تنبیہ کی ہے کہ وہ بھی فی زمانہ اسی قسم کے غیر اخلاقی اعمال اپنا رہے ہیں جن کے بارے میں قرآن مجید نے انہیں خبردار کیا تھا۔ اسی نوعیت کی ایک کتاب حبیب اللہ چشتی نے **قرآن یہود اور ہم** کے عنوان سے 2006 میں شائع کی۔ اس کتاب میں بھی یہودی اور یہودیت کو تعصب کے مترادفات کے طور پر پیش کیا گیا ہے اور مسلمانوں کو ان کی برائیوں سے بچنے کی تنبیہ کی گئی ہے۔ پینتیس صفحات پر مشتمل ایک کتابچہ بعنوان **مسلمانوں کے بدترین دشمن یہودی**، محمد رضا مرکزی کی تصنیف ہے جس میں یہودیوں کی برائیاں، صہیونیوں کے قبضہ فلسطین اور ان کے مستقبل کے عزائم پر مناظرانہ نوعیت کی بحث کی گئی ہے۔ **یہودی مغرب اور مسلمان** کے عنوان سے چھپنے والی ایک اور کتاب بھی اس حوالہ سے دستیاب ہے جس کے مصنف عبید اللہ فہد فلاحی ہیں۔ یہ کتاب مصنف کے 1978 سے 2010 کے درمیان چھپنے والے مقالات کو یکجا کر کے مرتب کی گئی ہے جن میں انہوں نے مناظرانہ انداز میں یہودیوں کے خلاف تقریباً انہیں عنوانات کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے جن کی تفصیلات اوپر گزر چکی ہیں۔

رضی الدین سید کی **یہودی مذہب: مہد سے لحد تک** کو اس حوالے سے استثنا حاصل ہے کہ اس کتاب میں یہودی رسم و رواج اور روزمرہ کے معمولات کو جس دقتِ نظری سے بیان کیا

گیا ہے اس سے پہلے اردو ادب میں شاید ایسی نظیر نہیں ملتی۔ 2010 میں چھپنے والی اس کتاب کے اب تک پانچ ایڈیشنز آ چکے ہیں۔ دو حصوں پر مبنی اس کتاب کو ایک جلد میں اکٹھا کر دیا گیا ہے۔ پہلے حصے میں مصنف نے وصفی انداز میں یہودی عقائد، رسوم و رواج، عبادات، مقدس کتب اور روز مرہ کے معمولات پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ بصری تفہیم کے لیے کتاب کو تصاویر سے مزین کیا گیا ہے۔ کتاب کا اشاریہ بھی اس کی افادیت کو بڑھاتا ہے۔ یہ حصہ بالخصوص ان طلبہ کے لیے مفید ہے جو یہودی تہذیب و ثقافت پر تحقیق کے خواہاں ہوں۔ چونکہ اردو دان طبقے میں ایسے لوگ نایاب ہیں جو عبرانی زبان سے آشنا ہو۔ چنانچہ انگریزی کتب کے ذریعے یہودیت کا مطالعہ محققین کا ایک عمومی مزاج ہے۔ انگریزی میں بہت سی عبرانی اصطلاحات، مثلاً متسواہ، سبت، ہلاخا وغیرہ کو جوں کا توں لاطینی حروف میں لکھ دیا جاتا ہے تاکہ اجنبی ناموں اور مقامات وغیرہ کو وضاحت سے بیان کرنے میں آسانی ہو۔ ان اصطلاحات کو اردو میں ڈھالنا کافی دشوار ہو جاتا ہے۔ خاص طور پر "ص"، "س" جیسے ہم آواز الفاظ میں فرق کرنا ممکن نہیں ہوتا۔ اس دشواری سے بچنے کے لیے زیادہ تر مصنفین کسی مخصوص اصطلاح کے پہلے استعمال پر انگریزی متبادل بھی اردو کے ساتھ مہیا کر دیتے ہیں۔ اس کتاب میں ان انگریزی اصطلاحات کی اچھی خاصی تعداد تو موجود ہی ہے لیکن ان کی تکرار بھی کی گئی ہے جو مطالعہ کو بوجھل کر دیتی ہے۔ اسی طرح بعض جملوں اور نثر پاروں کی تکرار بھی کتاب میں موجود ہے۔ مزید براں اس حصے کے مطالعے سے اس بات کا احساس بار بار ہوتا ہے کہ مصنف نے یا تو صرف راسخ العقیدہ یہودیوں کی آرا اپنے قارئین کے سامنے رکھی ہیں یا ان کی دیگر یہودی فرقوں، مثلاً اصلاح شدہ، رجعت پسند یا نو اشتراکی یہودیوں (جو تعداد میں راسخ العقیدہ یہودیوں سے زیادہ ہیں) سے آشنائی نہیں ہے۔ کتاب کے دوسرے حصے میں متفرق موضوعات کو توریت، قرآن اور چند دیگر کتب کی مدد سے بیان کیا گیا ہے جو عام مطالعہ کے لیے مفید ہے۔ **یہودی سیاست: ماضی سے حال تک** کے عنوان سے سید کی ایک اور تصنیف بھی چھپ کر منظر عام پر آ چکی ہے۔ 2018 میں چھپنے والی کتاب میں مصنف نے مختلف مسلم و عیسائی دانشواروں کے بیانات کی مدد سے صہیونیوں کو سازشی قرار دیا ہے۔ البتہ وہ یہ خیال ضرور رکھتے ہیں کہ: "ایک یہودی اپنی جگہ پر تو شریف ہو سکتا ہے لیکن ایک صہیونی کبھی امن کا پیامبر نہیں ہو سکتا۔"[3]

محمد فرمان عرفان کی **قدیم یہودی فرقوں کی تاریخ** کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ یہ اردو زبان میں بنیادی مآخذ کے ذریعے خصوصیت کے ساتھ یہودیت پر لکھی گئی چند گنی چنی کتابوں میں سے ایک ہے۔ مصنف نے کتاب کے ابتدائی ابواب میں یہودیت کی تاریخ بیان کی ہے جو ابراہیمؑ سے شروع ہو کر بابل میں ربیائی یہودیت کے عروج تک کے عرصے کو تفصیل سے بیان کرتی ہے۔ یہودیوں کے سیاسی، معاشرتی اور مذہبی حالات کو سمجھنے کے لیے یہ تاریخ خاصی اہمیت کی حامل ہے۔ مصنف کا بنیادی مقصد اس بات کا بیان ہے کہ ابتدائی یہودی فرقے کس طرح وجود میں آئے؟ کیوں ان میں تعصب اور شدت پسندی کو رواج ملا؟ اور مذہبی لحاظ سے ان فرقوں میں کیا فرق ہے؟ مصنف نے بنیادی مآخذ استعمال کرتے ہوئے ان سوالات کے جوابات دینے کی کوشش کی ہے۔ کتاب میں بہت سی تصاویر بھی شامل کی گئی ہیں جو نظری تفہیم کے علاوہ قارئین کو بصری تفہیم بھی فراہم کرتی ہیں۔ اگرچہ اہم وقدیم یہودی فرقوں پر سیر حاصل گفتگو کی گئی ہے تاہم کتاب کا ایک بڑا حصہ یہودی تاریخ پر صرف کر دینے سے سامری، حسیدی یا زیلوٹ جیسے فرقوں کو اہمیت نہیں مل پائی۔

ابولبابہ شاہ منصور کی **عالمی یہودی تنظیمیں** صہیونیت کے خلاف لکھی گئی کتاب ہے جو ان کے مختلف مضامین کا مجموعہ ہے۔ 2016 میں اس کتاب کا چوتھا ایڈیشن شائع ہوا۔ مصنف کے مطابق یہودیوں کی مسلمانوں کے ساتھ جنگ قیامت تک جاری رہے گی۔ چنانچہ ان کے ساتھ صلح کی کوئی گنجائش نہیں نکل سکتی۔ انہوں نے یہودیوں کو مسلمانوں کے دشمن اور شیطان کے آلہ کار بتایا ہے۔ ان کے خیال میں فری میسن صہیونیوں کی ایک ایسی تنظیم ہے جس میں متعدد پاکستانی بھی شامل ہیں۔ یہ تنظیم عالمی صہیونی ریاست بنانے کے لیے کوشاں ہے۔ اگرچہ یہ کتاب مناظرانہ انداز میں لکھی گئی ہے لیکن اس میں ایسے نکات، اصطلاحات اور مضامین کی تشریح کی گئی ہے جو یہودیت کی مروجہ تشریحات، تاریخ اور فرقوں کو سمجھنے میں معاون ہیں۔

اسلام اور اہل کتاب کے عنوان سے محمد طاہر القادری کی ایک تصنیف بھی 2014 میں منظر عام پر آئی جس میں قرآن وحدیث کی رو سے اہل کتاب کی تعریف، حیثیت اور احکامات کے متعلق گفتگو کی گئی ہے۔ اس کتاب کا مقصد چونکہ مسلمانوں کو اہل کتاب سے متعلق احکامات سے روشناس کروانا تھا لہذا اس میں یہودیت کی تشریح قرآن و حدیث کی روشنی میں کی گئی ہے۔

یہودی مذہب کو سمجھنے کے لیے اس کتاب سے یا اس سے ملتی جلتی کتب سے زیادہ معلومات نہیں ملتیں۔اس کتاب کی نمایاں خصوصیت اس کا بین المذاہب مکالمہ کی اہمیت پر روشنی ڈالنا ہے۔

اردو میں مذاہب عالم پر لکھنے والے مصنفین نے یہ کوشش کی ہے کہ دنیا کے مشہور مذاہب کا تقابلی جائزہ لیں۔ان مصنفین کی کوششوں ہی کی وجہ سے اردو خواں طبقے میں مذاہب عالم کے علمی مطالعے کا ذوق کچھ حد تک بنا رہا ہے۔اس کام کو دو بڑے حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ پہلا حصہ ان کتب پر مبنی ہے جو ملکی جامعات کی نصابی ضروریات کی تکمیل کے لیے لکھی گئیں۔ پاکستانی جامعات میں تقابل ادیان کا مضمون بی ایس اور ایم فل کے طلبہ کو پڑھایا جاتا ہے اس وجہ سے یہ کتب امتحانی پرچوں کو مد نظر رکھ کر لکھی جاتی رہی ہیں۔ دوسری طرز کی کتب وہ ہیں جن کے مخاطبین ہر خاص و عام ہیں۔ان دونوں اقسام میں موضوعات اور ماخذات کی یکسانیت ان کے نتائج میں مماثلت کی وجہ بنتی ہے۔ان کتب میں سے جو راقم الحروف کو دستیاب ہو سکیں ان میں یہودیت کے حوالے سے لکھے گئے کام کا مختصر جائزہ درج کر دیا گیا ہے۔

مذاہب عالم از احمد عبد اللہ 1958 میں چھپنے والی ایک اہم تصنیف ہے۔اب تک اس کتاب کے متعدد ایڈیشن سامنے آ چکے ہیں۔ راقم الحروف نے اس کتاب کے 1964 اور 2002 میں چھپنے والے دو ایڈیشن دیکھے ہیں۔ دونوں نسخوں میں خاصا فرق ہے۔ متعدد جگہ ترمیم و اضافے کیے گئے ہیں۔یہودیت پر اس کتاب میں ایک مختصر باب موجود ہے جسے دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ پہلے حصے میں یہودیت کی مختصر تاریخ اور تعلیمات کو **انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا** اور **انسائیکلو پیڈیا آف ریلیجن اینڈ ایتھکس** کے اقتباسات اور تشریحات کے ذریعے بیان کیا گیا ہے اور دوسرے حصے میں اسرائیلی ریاست کے قیام کی تاریخ ہے جس کے مآخذ میں زیادہ تر مغربی مصنفین کی کتب سے استفادہ کیا گیا ہے۔

تاریخ مذاہب، رشید احمد کی تقابل ادیان کے موضوع پر لکھی گئی ایک ضخیم تصنیف ہے جس کا پہلا ایڈیشن غالباً 1963 میں شائع ہوا۔اس کتاب میں وصفی انداز میں یہودیت پر لکھا گیا ایک علیحدہ باب موجود ہے جس کی ابتدا یہودیت کی تین چار صفحات پر مبنی مختصر تاریخ سے کیا گیا ہے۔ مصنف نے عبرانی بائیبل اور چند یورپی مصنفین کی کتب سے یہودی تصور خدا میں ارتقا پر بحث کرتے ہوئے یہ تجویز کیا ہے کہ بنی اسرائیل میں ایک خدا کی عبادت کے علاوہ درخت پرستی،

حیوان پرستی آباپرستی اور قبائلی خداؤں کے تصوارات بھی رائج رہے ہیں۔ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مصنف کا بنیادی مقصد مذاہب کی ابتدائی تاریخ کو ملحوظ خاطر رکھنا تھا اس وجہ سے انہوں نے یہودیوں کے مذہبی ارتقا، روحانی نظام، ربیائی یہودیت، یا عصر حاضر کی یہودیت وغیرہ کے موضوعات کو زیر نظر نہیں رکھا۔ یہودی کتبِ مقدسہ، عبادات، معابد، تہواروں اور روز مرہ کے معمولات کا مختصر تعارف کرواتے وقت قدیم یہودیت ہی پر توجہ دی گئی ہے۔ کرائٹ اور سامری فرقوں کا ذکر کیا گیا ہے جبکہ فیریسیوں اور صدوقیوں جیسے قدیم فرقوں کے متعلق معلومات فراہم نہیں کی گئیں۔

غلام نبی امجد جنہیں عام طور پر جی۔این۔امجد کے نام سے پہچانا جاتا ہے نے 1977 میں **اسلام اور دنیا کے مذاہب** کے عنوان سے مسلم مبلغین کے لیے ایک کتاب تصنیف کی تھی جس کا پہلا باب یہودیت کے متعلق ہے۔ وصفی انداز میں لکھا گیا یہ باب تقریباً 66 صفحات پر مبنی ہے جس میں مصنف نے یہودیت کی مختصر تاریخ، کتب مقدسہ، اخلاقی قوانین اور تصور خدا پر کلام کیا ہے۔ یہ کتاب اس موضوع پر لکھی جانے والی ان چند کتب میں سے ایک ہے جس میں یہودی مذہب کو یک طرفہ انداز میں نہیں پڑھا گیا۔ مصنف نے اس مذہب کی اچھائیوں کا بھی ذکر کیا ہے اور یورپی مصنفین کی یہودیت کے خلاف تنقید کو بھی موضوع سخن بنایا ہے۔

1986 میں زیور طبع سے آراستہ ہونے والی عماد الحسن آزاد فاروقی کی **دنیا کے بڑے مذاہب** میں یہودیت کو یہودیت ہی کے معنی میں وصفی نقطہ نظر سے بیان کیا گیا ہے۔ دنیا کے آٹھ بڑے مذاہب پر لکھی جانے والی اس کتاب میں یہودیت کو 43 صفحات ہی مل سکے ہیں جس میں سے بھی ساٹھ فیصد سے زائد یہودی تاریخ کے بیانیہ کی نذر ہو گئے۔ اگرچہ یہودیت کے بیان میں تاریخ، عقیدے کی سی اہمیت رکھتی ہے جس کو اس قدر جامع انداز میں بیان کرنا ایک لائق تحسین کام ہے لیکن اس تاریخی بیانیے نے متعدد دیگر موضوعات سے مصنف کو صرفِ نظر برتنے پر مجبور کر دیا۔ پاکستانی جامعات کے نصاب میں شامل "تقابل ادیان" کے مضمون کو پڑھانے کے لیے اس کتاب کی اہمیت مسلمہ ہے۔

محمد مظہر الدین صدیقی کی **اسلام اور مذاہب عالم: تقابلی مطالعہ** بھی وصفی انداز میں لکھی گئی ایک اہم کتاب ہے جو 1997 میں شائع ہوئی۔ اس کتاب کا چوتھا باب جو تقریبا 50 صفحات

پر مبنی ہے، یہودیت کا بیان ہے۔ اس میں یہودیوں کی عہد روماتک کی تاریخ، عقائد اور فرقوں پر وصفی انداز میں گفتگو کی گئی ہے۔ حوالہ جات کی غیر موجودگی کی وجہ سے اس کتاب کے مآخذ کے بارے میں درست معلومات تو میسر نہیں۔ البتہ کتاب کی ترتیب اور مصنف کے طرز بیان سے اندازہ ہوتا ہے کہ نہ صرف بائیبل اور تلمود بلکہ یہودی و مسیحی تاریخ پر لکھی گئی تنقیدی کتابیں بھی ان کے پیش نظر رہی ہیں۔

میاں منظور احمد نے چند اردو و عربی کتب کی مدد سے **تقابل ادیان و مذاہب** کے عنوان سے ایک کتاب 2004 میں مرتب کی ہے جس میں بقول ان کے انہوں نے مذاہب عالم پر غیر جانبدارانہ اور منصفانہ تقابلی گفتگو کی ہے۔ اس کتاب میں تقریباً20 صفحات کا ایک باب یہودیت کے لیے مختص کیا گیا ہے جس میں مناظرانہ انداز میں یہودیوں کی عہد روماتک کی تاریخ، فلسطین کے قیام اور قدیم یہودی فرقوں اور عبادت گاہوں کا مختصر تعارف شامل ہے۔ مصنف کے نتائج اور یہودیوں کے خلاف یک طرفہ رویے کے حوالے سے اس میں ایسا کچھ خاص نہیں ملتا جو پہلے لکھی جانے والی کتب میں بیان نہ کر دیا گیا ہو۔

محمد یوسف خان جو کہ جامعہ اشرفیہ لاہور میں بطور استاد مقرر رہے ہیں نے تقابل ادیان کے عنوان سے 2005 میں چھپنے والی اپنی کتاب میں یہودیت پر ایک 30 صفحات کا باب تصنیف کیا ہے جس میں عہد روماتک یہودیت کی تاریخ، اسرائیل کے قیام، مقدس کتب، قدیم فرقوں اور تہواروں پر گفتگو کی گئی ہے۔ یہ کتاب مناظرانہ اور وصفی طرز بیان کا امتزاج ہے۔ محمود الرشید حدوٹی جن کا تعلق بھی جامعہ اشرفیہ لاہور سے ہی ہے، نے بھی **مطالعہ مذاہب** کے عنوان سے ایک کتاب تصنیف کی جس میں یہودیت پر 15 صفحات کا ایک باب شامل ہے۔ مناظرانہ انداز میں لکھا جانے والا یہ باب بھی تقریباً انہیں موضوعات کو بیان کرتا ہے جو اس سے پہلے مطالعہ ادیان پر لکھی جانے والی کتب میں آ چکے ہیں۔

مکالمہ بین المذاہب کے عنوان سے غالباً 2007 میں ولی الدین مظفر کی بھی ایک تصنیف سامنے آئی۔ یہ کتاب اپنی نوعیت میں منفرد اس لیے ہے کہ مظفر کا تعلق جامعہ فاروقیہ کراچی سے ہے جو کہ پاکستان کا ایک مشہور مدرسہ ہے۔ مدارس اپنے مناظرانہ کام کی وجہ سے پہچانے جاتے ہیں جبکہ اس کتاب میں مکالمہ کی کوشش کی گئی ہے جو اپنی نوعیت میں مختلف ہے۔

یہ کتاب ولی الدین مظفر کے محاضرات ہیں جو ان کے شاگردوں نے مرتب کیے۔ کتاب میں یہودیت کے مطالعہ کے لیے تقریباً 30 صفحات کا ایک باب مختص ہے جس میں مختصراً عہد روما تک یہودیت کی تاریخ اور یہودی فرقوں، تہواروں، مقدس کتب اور جدید اسرائیلی ریاست کے قیام پر گفتگو کی گئی ہے۔ مصنف کے مآخذ چونکہ چند عربی و اردو کتب پر مبنی ہیں لہذا کتاب میں بیان کردہ یہودی مذہب کی تشریحات اسلامی تعلیمات کی روشنی میں کی گئی ہیں۔

2010 میں انیس احمد فلاحی مدنی کی **مذاہب عالم: ایک تقابلی مطالعہ** کا پہلا ایڈیشن چھپا جس میں یہودیت پر تقریباً 100 صفحات کا ایک باب باندھا گیا ہے۔ اس باب میں مصنف نے یہودیت کی مختصر تاریخ، جدید اسرائیل کا قیام اور یہودی کتب مقدسہ، عقائد اور فرقوں پر تقابلی نقطہ نظر پیش کیا ہے جو بعض مقامات پر مناظرانہ انداز اختیار کر جاتا ہے۔ یہودیت پر لکھا گیا یہ باب مذاہب عالم کے تقابلی مطالعے کی بجائے اسلام اور یہودیت کا تقابلی مطالعہ معلوم ہوتا ہے۔ مصنف کے مآخذ زیادہ تر عبرانی بائیبل اور قرآن مجید کے بیانات ہیں۔ اس کے علاوہ عربی، اردو (جن میں سے بیشتر کتب کا تعارف اس مقدمے میں بیان کر دیا گیا ہے) اور چند ایک انگریزی کتب بھی استعمال کی گئی ہیں۔

اسی نوعیت کی ایک اور کتاب **مذاہب عالم کا تقابلی مطالعہ** ہے جس کے مصنف غلام رسول چیمہ ہیں۔ تقریباً 900 صفحات پر مبنی یہ کتاب 2010 میں شائع ہوئی۔ اس کتاب کے چھٹے باب میں یہودیت پر تقریباً 75 صفحات لکھے گئے ہیں۔ مصنف نے مختصراً یہودی تاریخ، عقائد، کتب مقدسہ اور اسرائیل کے قیام پر اپنے تاثرات قلم بند کیے ہیں۔ باب کے مآخذ میں عبرانی بائیبل، قرآن مجید اور چند اردو اور انگریزی کتب شامل ہیں۔ بڑی حد تک کتاب کے طرز تحریر کو وصفی کہا جا سکتا ہے تاہم مصنف کا یہودیت کے خلاف یک طرفہ رویہ بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ انہوں نے متعدد حوالوں سے عبرانی بائیبل میں تحریف کو ثابت کرنے کی کوشش بھی کی ہے اور یہی کتاب ان کا ایک بڑا ماخذ بھی ہے جس سے وہ یہودی مذہب کی وضاحت کی کوشش کرتے ہیں۔ یہی طریقہ کار مسلم علما کی بیشتر تحریروں میں اختیار کیا گیا ہے جس سے ایک ظاہری تضاد جنم لیتا ہے۔ مصنفین نے اس تضاد کی طرف توجہ نہیں دی لہذا اس ضمن میں کوئی وضاحت بھی درج نہیں کی گئی۔

درج بالا کتب کے علاوہ اردو ادب میں یہودیت پر لکھے گئے تحقیقی مضامین بھی دستیاب ہیں جن میں سے بیشتر یا تو مختلف فقہی مسائل، مثلاً شادی، طلاق یا حلال و حرام وغیرہ کے موضوعات پر اسلام اور یہودیت کا تقابل پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں یا مدینہ کے یہودیوں اور صہیونیت و اسرائیل کے قیام سے متعلق آرا قارئین کے سامنے رکھتے ہیں۔ بہت کم ایسے مضامین دستیاب ہیں جو بطور خاص یہودیت کے کسی پہلو پر لکھے گئے ہیں۔ چند ایک مضامین کو چھوڑ کر بقیہ مضامین کے زیادہ تر مآخذ میں یا تو وہی کتب شامل ہیں جن کا مختصر تعارف اس مقدمہ میں درج ہے یا مختلف تفاسیر، تراجم یا چند ایک انگریزی کتب سے مدد لی جاتی ہے جو بیشتر غیر یہودیوں کی لکھی ہوتی ہیں۔ ان مصنفین کے مآخذ میں تلمود، جو کہ یہودی فقہی احکامات کو جاننے کا ایک بڑا ذریعہ ہے، بہت کم دیکھنے میں ملتی ہے۔ اسی طرح **شولحان عاروخ** یا خاص ہلاخا سے متعلق تصنیفات کا حوالہ بھی راقم الحروف کی نظر سے نہیں گزرا۔

طلبہ کی طرف سے لکھے گئے ایم فل یا ڈاکٹریٹ کے مقالات میں بھی یہی رجحان عموماً پایا جاتا ہے (بوجہ طوالت ان کا مفصل ذکر نہیں کیا جا سکا)۔ بہت کم طلبہ ایسے ہوتے ہیں جنہیں انگریزی اور عربی سے اتنی آشنائی ہوتی ہے کہ وہ دیگر مذاہب کی کتب سے کما حقہ مستفید ہو سکیں۔ وہ جو انگریزی پڑھنا جانتے ہیں ان کے لیے کتب کی دستیابی ایک کٹھن مرحلہ ہوتا ہے۔ اس لیے ان کی معلومات کے مآخذ کا بیشتر حصہ بھی اردو میں یہودیت پر لکھی گئی کتب اور مضامین پر مشتمل ہوتا ہے۔ بہت سی اردو میں لکھی گئی مذہبی کتب جن میں تفاسیر، تاریخ اور سیرت وغیرہ کی کتب شامل ہیں میں بھی چونکہ اسرائیلی روایات اور مذہب کے متعلق گاہے بگاہے گفتگو کرنی پڑتی ہے اس وجہ سے کچھ طلبہ یہودیت کے مطالعے کے لیے ان اسلامی کتب کو بطور ماخذ استعمال کرتے ہیں۔ اس یکسانیت کی وجہ سے ان کے عمومی نتائج میں بھی مماثلت ہوتی ہے۔

یہ وقت کی ایک اہم ضرورت ہے کہ یہودیت کو حتی الامکان یہودیوں کے نقطہ نظر سے بھی سمجھا جائے۔ چنانچہ زیر نظر کتاب میں یہودی تاریخ، تہذیب و ثقافت، کتب مقدسہ، عقائد، عبادات اور روحانیت کو سمجھنے کے لیے یہودیوں کی کتب کو فوقیت دی گئی ہے۔ مسلمانوں کی تصانیف میں سے قدیم یہودی تاریخ، اجنبی اصطلاحات اور ناموں کو بیان کرنے کے لیے عبد الحلیم شرر کی "تاریخ یہود" کو مد نظر رکھا گیا ہے۔ اردو میں لکھی گئی بیشتر کتب عہد روما تک کی

یہودیت کی تاریخ کو بیان کرتی ہیں جس کا اہم ذریعہ عبرانی بائیبل کو بنایا جاتا ہے۔اس لیے ربیائی یہودیت اور اس کی تاریخ کو ان کتب میں جگہ نہیں ملتی۔ عقائد و عبادات کے اختلاف نے عصر حاضر کے یہودیوں کو مختلف فرقوں میں تقسیم کر دیا ہے جن کے مطالعے کی طرف بھی زیادہ توجہ نہیں دی گئی۔ لہذا عصر حاضر میں یہودیت کے بیان کو عموماً صہیونیت تک ہی محدود کر دیا جاتا ہے۔

اسی طرح یہودی روحانی نظام کے متعلق تصانیف تو اردو میں شاید ناپید ہیں۔اس ضمن میں راقم الحروف کو بشیر احمد ڈار کی **تاریخ تصوف: قبل از اسلام** کے علاوہ کوئی اور کتاب دستیاب نہیں ہو سکی۔اس کتاب میں بھی مصنف نے مشہور یہودی فلسفی فیلو(20ق۔م-50)کے افکار کو موضوع سخن بنایا ہے یا مرکبہ روحانیت پر چند صفحات تحریر کیے ہیں۔ قبالہ جیسی مشہور یہودی روحانی تحریک پر انہوں نے اس لیے نہیں لکھا کہ ان کا خیال ہے کہ "یہ مسلمانوں کے پیدا کردہ تصوف اور فلسفہ کے زیر اثر ظہور پذیر" ہوئی تھی۔[4] یہودیت کو اردو میں اس انداز میں بیان کیا جاتا رہا ہے کہ قدیم اسرائیلیوں اور عصر حاضر کے یہودیوں میں فرق نہیں کیا جاتا۔ایک آدھ دور یا چند فرقوں کو ہی یہودیت کا بیان سمجھ لیا جاتا ہے۔ یہودیت، تاریخ کے مختلف ادوار میں پروان چڑھی ہے جنھوں نے اس کے ارتقا میں خاطر خواہ کردار ادا کیا ہے۔ان ادوار کو مندرجہ ذیل حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:

1. ابتدائی عبرانیوں کا مذہب۔ جب اولاد ابراہیمؑ خانہ بدوش قبائل کی طرح زندگی گزار رہی تھی۔ان کا گزر بسر زیادہ تر مویشیوں کی تجارت سے منسلک تھا۔عبادات کے لیے کوئی خاص جگہ متعین نہیں تھی۔ ہیکل سلیمانی کی تعمیر تک بنی اسرائیلیوں کے مذہب کو یہودیت کا نام نہیں دیا گیا۔
2. ہیکل کی تعمیر نو سے ہیکل کی دوسری تباہی تک کا عرصہ جس میں یہودیت باقاعدہ مذہب کے طور پر رواج پائی۔ اس دور میں یہودی عبادات، رسوم و رواج اور زندگی کو ہیکل کے ساتھ منسلک کیا جانے لگا تھا۔
3. ہیکل کی تباہی کے بعد یہودیت کا مذہبی ارتقا۔ اس دور میں ہیکل سے منسلک عبادات اور قربانیوں کو ادا کرنا ممکن نہیں رہا اور یہودی شرعی لحاظ سے ان عبادات کو ادا کرنے سے معذور تصور کیے جانے لگے۔ یہ دور ربیائی یہودیت کے فروغ کا دور تھا۔اس دور نے انہیں ایسے

مسائل میں الجھا دیا کہ وہ ان کا حل عبرانی بائیبل سے تلاش کرنے میں ناکام رہے۔ لہذا تلمود جس کی بنیاد عبرانی بائیبل پر رکھی گئی تھی، تصنیف ہوئی۔

4. عصر حاضر کی یہودیت جس کے ماننے والے عقائد وعبادات میں ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ اس دور میں جہاں ایسے یہودی موجود ہیں جو خدا کے وجود ہی کے منکر ہیں وہیں ایسے یہودی بھی موجود ہیں جو عبرانی بائیبل اور ربیائی یہودیت کے قدیم تصورات کو اپنانے کی کوشش کرتے ہیں۔

ضرورت اس امر کی ہے کہ تاریخی ارتقا کو پیش نظر رکھ کر یہودیت کا مطالعہ کیا جائے۔ نیز یہ کہ عصر حاضر کے بہت سے یہودی، عبرانی بائیبل کو مستند تاریخی ماخذ نہیں سمجھتے۔ ان کا خیال ہے کہ عبرانی بائیبل نے تاریخ کو مؤرخین کے نقطہ نظر سے بیان نہیں کیا لہذا یہ عین ممکن ہے کہ بعض مقامات میں تاریخی حوالوں اور عبرانی بائیبل میں تضاد پایا جائے۔ اسی طرح کچھ یہودی تلمود کو بھی مستند تاریخی ماخذ نہیں سمجھتے۔ ان کا خیال ہے کہ تلمود کا بنیادی مقصد تاریخ کی بجائے ربیائی یہودیت کا بیان ہے۔ انہیں مسائل کو سامنے رکھتے ہوئے زیر نظر کتاب میں کوشش کی گئی ہے کہ عبرانی بائیبل کے علاوہ دیگر یہودی مآخذ سے بھی استفادہ کیا جائے۔ اس ضمن میں کتاب ہذا کے چوتھے باب میں بعض ایسے تاریخی واقعات کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے جن کے بارے میں عبرانی بائیبل اور مؤرخین مختلف الآرا ہیں۔

اردو زبان میں یہودیت کی ایک ایسی تاریخ مرتب کرنے کی اشد ضرورت ہے جو عبرانی بائیبل کے علاوہ دیگر مآخذ، مثلاً قدیم مصری، یونانی اور فارسی تواریخ کو استعمال کرتے ہوئے اولین عبرانیوں کے حالات سے واقفیت دلا سکے۔ تواریخ ویسے بھی یہودیت کا ایک گنجلک اور الجھا ہوا پہلو ہیں۔ کسی واقعہ کی مستند تاریخ کے بارے میں بھی مصنفین میں اس قدر اختلاف ہے کہ بڑی آسانی سے دہائیوں اور بعض اوقات صدیوں کا فرق سامنے آجاتا ہے۔ اس حوالے سے ولیم البرائٹ (1891-1971)، ایڈون تھیلی (1895-1986) یا گیرشن گالی وغیرہ کے تیار کردہ کیلنڈر استعمال کرنے کو فوقیت دی جاتی ہے تاہم ان مؤرخین کی فراہم کردہ تواریخ میں بھی پانچ دس سال کا فرق عام سی بات ہے۔ چنانچہ یہ ضروری نہیں کہ کتاب ہذا میں فراہم کردہ تواریخ اور دیگر یہودی کتب میں موجود تواریخ یکساں ہوں۔

اردو میں عبرانی الفاظ و اسما کو مختلف انداز میں لکھا جاتا رہا ہے، مثلاً تلمود کو اردو میں تالمود بھی لکھ دیا جاتا ہے۔ زیر نظر کتاب میں کوشش کی گئی ہے کہ جب ایسی کسی اصطلاح یا نام کا استعمال کیا جائے تو اولین استعمال پر اس کے مختلف تلفظ بھی درج کر دیے جائیں، مثلاً تلمود کو ابواب کے اندر جہاں پہلی جگہ استعمال کیا گیا ہے وہاں اس کو "تلمود/تالمود" لکھا گیا ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ تلمود کو دونوں طرح سے اردو میں لکھا جاتا رہا ہے۔ عبرانی میں بھی بعض الفاظ کو دو طرح لکھا جاتا ہے، مثلاً مرکبہ کو مرکوا بھی لکھا جاتا ہے۔ چنانچہ ایسے الفاظ کے اولین استعمال پر بھی دونوں تلفظ درج کر دیے گئے ہیں۔ زیر نظر کتاب میں بہت سی عبرانی اصطلاحات کو بھی پہلی دفعہ اردو میں ڈھالا گیا ہے۔ عبرانی اور عربی اور اردو میں کافی مماثلت پائی جاتی ہے۔ اسی مماثلت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے زیر نظر کتاب میں عبرانی اصطلاحات کو اس طرح اردو میں بیان کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ اجنبیت سے بھی بچا جا سکے اور عبرانی اصلاحات کا حسن بھی برقرار ہے۔ اس ضمن میں خطا کا اندیشہ بہر حال موجود ہے۔ کچھ تکنیکی دشواریاں اپنی جگہ ہیں کیونکہ عبرانی کے کچھ الفاظ کو اردو میں درست تلفظ کے ساتھ ادا کرنا ممکن نہیں، مثلاً عبرانی حرف "צ" کا اردو متبادل موجود نہیں ہے۔ اس وجہ سے اس کو اس کے قریب ترین حرف "س" کے ذریعے بیان کر دیا گیا ہے۔

اس طویل پیش لفظ کے علاوہ کتاب کو آٹھ ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلے تین ابواب میں یہودیت کا تعارف، تاریخ اور مذہبی ارتقا کو مختصراً بیان کیا گیا ہے۔ یہودی تاریخ کم و بیش چار ہزار سال پر مبنی ہے جس کو سمجھے بغیر اس مذہب کے کئی اہم پہلو تشنہ رہ جاتے ہیں۔ چوتھے باب میں یہودی کتبِ مقدسہ اور مختلف مذہبی اصناف کا تعارف کروایا گیا ہے۔ پانچویں باب میں یہودی عقائد و عبادات پر بحث کی گئی ہے۔ چھٹے باب میں ایک مذہبی یہودی کی روزمرہ زندگی کا خاکہ اور تہذیب و ثقافت کا مختصر بیان شامل ہے۔ ساتواں باب یہودیت کے مشہور قدیم و جدید فرقوں و تحریکوں کا بیان ہے۔ آٹھویں باب میں یہودی روحانی نظام، جس میں تخلیق کائنات کا بیان بھی شامل ہے، کا تعارف کروایا گیا ہے۔ ہر باب کے آخر میں قارئین خصوصاً طلبہ کی آسانی کے لیے مشقی سوالات موجود ہیں۔ یہودی روحانیت کے بیان میں **زوہر** کو خاص اہمیت حاصل ہے جبکہ زیر نظر کتاب میں براہ راست **زوہر** سے استفادہ نہیں کیا جا سکا۔ اس لیے اہم یہ ہے کہ یہودی

روحانیات کے بنیادی مآخذ کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اس موضوع پر مزید تحریریں لکھی جائیں۔

میں ان تمام صاحبان کا شکر گزار ہوں جن کے قیمتی مشوروں اور مدد سے یہ کام ممکن ہو سکا۔ میرے استاد گرامی، محمد اکرم جو کہ شعبہ تقابل ادیان، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی میں بطور اسسٹنٹ پروفیسر اپنے فرائض منصبی سرانجام دے رہے ہیں، اس ضمن میں خصوصی شکریے کے مستحق ہیں۔ ان کے توجہ دلانے پر میں نے اس کتاب کو لکھنے کا ارادہ کیا۔ محمد طاہر المصطفی، بسمہ محمود، سدرہ شعیب، محمد عثمان، محمد طفیل، زارا ظفر، محسن عباس، سارہ ارشاد اور فہد اسلام جنجوعہ بھی خصوصی شکریہ کے مستحق ہیں جنہوں نے اس کتاب کی پروف ریڈنگ میں میری مدد کی۔ میں اپنے والدین اور رفیق حیات، آرزو احد کا بھی شکر گزار ہوں جنہوں نے گھریلو کاموں میں مجھے مشغول رکھا تاکہ میں اکتاہٹ کا شکار نہ ہو جاؤں۔ محمد قیصر مشتاق اور محمد مدثر علی جن سے میں نے زانوئے تلمذ بھی طے کیا اور جنہوں نے اس کتاب کے ابتدائی مسودے کو دیکھ کر ممکنہ حد تک میری رہنمائی بھی فرمائی، اس ضمن میں خصوصی شکریہ کے مستحق ہیں۔ مریم شاہ جو بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی میں ماسٹرز کی طلبہ ہیں، نے کتاب کے بعض حصوں کی تکمیل میں میری مدد کی۔ میں ان کا بھی شکریہ ادا کرتا ہوں۔ گینادی شلوپمپیر جو کہ تل ابیب یونیورسٹی میں ہندی اور اردو زبان کے استاد ہیں اور رائے بارسادھے جو کہ کولمبیا یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کر رہے ہیں نے عبرانی اصطلاحات کو اردو میں ڈھالنے میں مدد کی۔ میں ان دونوں احباب کا بھی شکر گزار ہوں۔

کتاب کی تکمیل کے بعد راقم الحروف نے متعدد بین الاقوامی یونیورسٹیوں میں موجود یہودیت کے اساتذہ سے ای میل کے ذریعے رابطہ کرنے کی کوشش کی۔ بیسیوں ای میلز کے بعد بھی کسی ایسے فرد تک رسائی نہ ہو سکی جو یہودیت اور اردو دونوں کو اچھی طرح جانتا بھی ہو اور وقت دینے پر بھی آمادہ ہو۔ البتہ پیٹرک بوون، نورس جاٹ آفریدی، ریوون فائرسٹون اور جولیا فلپس کوہن کی ان کوششوں کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا جو انہوں نے اس ضمن میں میرے لیے کیں اور کتاب جزوی طور پر یہودی محققین کی نظر سے گزر سکی۔

چارلس کوہن جو کہ جامعہ وسکونسن، امریکہ میں ایک عرصہ تک یہودیت کے پروفیسر کے طور پر کام کرتے رہے، راقم الحروف سے اس کتاب کی تکمیل کے دوران رابطے میں رہے۔ انہوں نے اس کتاب کی ترتیب، یہودیت کے مزاج کو وضاحت سے سمجھنے اور موضوع سے متعلق

مواد کی نشاندہی میں میری مدد کی۔ میں ان کا بہت شکر گزار ہوں اور انہیں کی ایک بات سے اس حصے کا اختتام کرتا ہوں کہ: "ہم دونوں قوموں کو یہ بات سمجھ لینی چاہیے کہ ہم مزید ایک دوسرے کی روایات سے لاعلم نہیں رہ سکتے۔ ہمیں ایک دوسرے کے ساتھ ایمانداری اور عزت سے بات کرنا ہوگی؛ وہ بھی اس نقطہ نظر سے کہ ہم ایک دوسرے سے سیکھنا چاہ رہے ہوں۔ اپنے مذہب کی حمایت اور دوسرے کو قائل کرنا ہمارے پیشِ نظر نہیں ہونا چاہیے۔"

زوہیب احمد
اکتوبر 2021
zohaib.ahmad@iub.edu.pk

حوالہ جات

[1] احسان الحق رانا، **یہودیت و مسیحیت** (لاہور: مسلم اکادمی، 1981ء)، 347-48۔
[2] ابوالاعلیٰ مودودی، **یہودیت قرآن کی روشنی میں** (لاہور: ادارہ ترجمان القرآن، 2000ء)، 290۔
[3] رضی الدین سید، **یہودی سیاست: ماضی سے حال تک** (لاہور: شرکت الامتیاز، 2018ء)، 9۔
[4] بشیر احمد ڈار، **تاریخ تصوف: قبل از اسلام** (لاہور: مکتبہ جدید پریس، 2013ء)، 79۔

پہلا باب: تعارف

یہودیوں کے مختلف نام

"یہودی" عبرانی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی "یہودا کے قبیلہ سے" کے ہیں۔
یہودیت کا شمار دنیا کے قدیم ترین مذاہب میں ہوتا ہے جس کی تاریخ تقریباً 1500 سے 2000 سال قبل مسیح بیان کی جاتی ہے۔ تاریخی اعتبار سے اسے الہامی مذاہب میں سب سے قدیم مذہب مانا جاتا ہے۔ عصر حاضر میں یہودیوں کی کل تعداد تقریباً 14.7 ملین ہے۔ یہودیوں کو مختلف ادوار میں مختلف ناموں سے پکارا جاتا رہا ہے۔ ان میں سے ہر ایک نام کی تاریخ، اہمیت اور استعمال مختلف ہے۔ یہودیت میں ناموں کی اسی اہمیت کے پیش نظر ان ناموں کا مختصر تعارف ذیل میں درج کیا جارہا ہے۔

باب اول کے اہم نکات

1. عبرانی، اسرائیلی، یہودی اور سامی میں فرق۔
2. یہودی کسے کہا جاسکتا ہے۔
3. پیدائشی، ملحد اور مرضی سے بننے والے یہودی۔
4. یہودیت کی ابتدا۔
5. ابراہیمؑ سے کیا گیا عہد خداوندی۔
6. اسحاقؑ، یعقوبؑ اور یوسفؑ کے ادوار۔

عبرانی

پہلے پہل یہودیوں کو "عبرانی" کہا جاتا تھا۔
عبرانی بائبل جسے تنخ اور عہد نامہ قدیم بھی کہا جاتا ہے یہودیوں کی مقدس کتاب ہے جس میں لفظ عبرانی کا اولین اطلاق آبرام/ابراہیمؑ کو بیان کرنے کے لیے کیا گیا ہے۔[1] لفظ عبرانی کا ماخذ یا تو "ابر" ہے جو آبرام کے اجداد میں سے کسی کا نام تھا یا اس کا ماخذ "ایور" ہے جس کا مطلب "دوسری جانب کا" ہے۔ چونکہ وہ دریائے فرات کی دوسری جانب سے آئے تھے اس لیے عبرانی کہلائے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ وہ روحانی واخلاقی طور پر اپنی قوم سے دوسری جانب تھے اس لیے انہیں عبرانی کہا جانے لگا۔ جب یہودیوں کو اس نام سے پکارا جائے تو اس سے مراد ابراہیمؑ، اسحاقؑ، یعقوبؑ اور یوسفؑ کے ادوار ہیں۔

اسرائیلی

یہودیوں کے لیے عبرانی کے علاوہ "اسرائیلی" کا لفظ بھی استعمال کیا جاتا ہے جس کے

لُغوی معنی ہیں کہ "خدا لڑتا ہے۔" یہ یعقوبؑ کا لقب تھا۔ عبرانی بائیبل کے مطابق ایک دفعہ وہ کنعان کی جانب سفر کر رہے تھے اور تنہا تھے کہ ایک آدمی آیا اور ساری رات ان سے کشتی لڑتا رہا۔ جب صبح کی روشنی شروع ہونے لگی تو اس آدمی نے یعقوبؑ سے کہا کہ اس کو جانے دیں لیکن باوجود زخمی ہونے کے یعقوبؑ نے اس آدمی کو پکڑے رکھا اور کہا کہ وہ اس وقت تک اس کو نہیں چھوڑیں گے جب تک کہ وہ ان کو برکات سے نہ نوازے۔ تب اس نے کہا: "اِس کے بعد تیرا نام یعقوب نہ رہیگا، بلکہ اسرائیل ہو گا۔ اور میں نے تجھے یہ نام دیا ہے، کیونکہ تو خدا سے اور آدمیوں سے لڑا ہے اور غالب ہوا۔"[2] اس وقت سے یعقوبؑ، اسرائیل کے لقب سے بھی پہچانے جانے لگے۔ انہیں کی نسبت سے یہودی اپنی سرزمین کو بھی "اسرائیل" کا نام دیتے ہیں۔ یہودی مذہبی ادب میں بھی اس لفظ کا استعمال کثرت سے ہے۔ موجودہ اسرائیلی ریاست، جس کا قیام ایک متنازعہ مسئلہ ہے، کے یہودی و غیر یہودی باشندوں کے لیے بھی اسرائیلی کا لفظ بولا جاتا ہے۔ اس لحاظ سے اس نئ اسرائیلی ریاست میں بسنے والا شخص مسیحی یا مسلمان ہونے کے باوجود اسرائیلی بھی کہلاتا ہے۔

یہودیوں کے مختلف نام

1. عبرانی
2. اسرائیلی
3. سامی
4. یہودی

سامی

مشرق وسطی کے لوگ جن میں یہودی اور عرب شامل ہیں، سام بن نوحؑ کی اولاد تصور کیے جاتے ہیں۔ اسی نسبت سے یہودیوں کو سامی بھی کہا جاتا ہے اور ان کے مذہب کو سامی مذاہب میں شامل کیا جاتا ہے۔ اس لفظ سے سامی زبانوں کا گروہ بھی مراد لیا جا سکتا ہے۔ عبرانی، جسے یہودیوں کی مقدس زبان کا درجہ حاصل ہے وہ بھی زبانوں کے سامی گروہ ہی میں شامل ہے۔ تاریخ کے مختلف ادوار میں یہودی دیگر قوموں کی نفرتوں کا شکار رہے ہیں جس وجہ سے یہودیوں کے خلاف نفرت کو بیان کرنے کے لیے "سامی مخالف" کی اصطلاح بھی استعمال کی جاتی ہے۔

یہودی

یعقوبؑ کے بارہ بیٹوں میں سے ایک کا نام یہودا تھا۔ اسی بیٹے سے جو قبیلہ آباد ہوا اس کے

باسی یہودی کہلائے۔ یہودیوں کے تیسرے بادشاہ، سلیمانؑ کی وفات کے بعد اسرائیلی قوم دو ریاستوں میں بٹ گئی تھی۔ان میں سے ایک ریاست کا نام "اسرائیل "اور دوسری کا نام "یہودا" تھا۔اسرائیل کو "شمالی ریاست "اور یہودا کو "جنوبی ریاست" بھی کہا جاتا تھا۔پہلے پہل صرف یہودا کے باسی یہودی کہلائے۔بعد میں جب اسرائیل کو اشوریوں نے تباہ کر دیا تو تمام قوم یہودی کہلائی۔عصرِ حاضر میں بھی انہیں اسی نام سے پکارا جاتا ہے۔

یہودی کون ہے؟

تمام یہودی ایک ہی نسل سے تعلق نہیں رکھتے۔نہ ہی سب کا خون، رنگ اور قومیت ایک سی ہے۔ دیگر مذاہب کے پیروکاروں کی طرح یہودی بھی مختلف رنگوں، نسلوں اور قومیتوں میں بٹے ہوئے ہیں۔اگر آج کے امریکہ، برطانیہ یا جرمنی میں سفید فام یہودی موجود ہیں تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ سیاہ فام یہودیوں کا وجود نہیں ہے۔ایک محتاط اندازے کے مطابق دنیا میں تقریباً ایک لاکھ سیاہ فام یہودی موجود ہیں۔ان میں وہ یہودی بھی شامل ہیں جو 1970 سے 1990 کے دوران ایتھوپیا سے اسرائیل بذریعہ ہوائی جہاز لائے گئے۔جدید دنیا سے کٹے ہونے کی وجہ سے یہ لوگ قدیم یہودیت کے پیروکار تھے۔اسی طرح پانچ ہزار کے قریب یہودیوں کا ایک گروہ ہندوستان میں بھی آباد تھا جو نسلاً تو یہودی سمجھے جاتے تھے لیکن ثقافتی اعتبار سے ہندوؤں سے مشابہ تھے۔چنانچہ ایسے بہت سے سوالات اٹھتے ہیں جو مذہبی اعتبار سے یہودی اور یہودیت کے مزاج سے واقفیت کی طرف رغبت دلاتے ہیں۔درج ذیل بحث سے یہ معلوم کرنے میں آسانی ہو گی کہ یہودی کون ہے؟ یہودیت کا جوہر اصلی کیا ہے؟اور یہودی ہونے کے لیے کیا شرائط ہیں؟

پیدائشی یہودی

زیادہ تر یہودیوں کے نزدیک کسی کے یہودی ہونے کی دلیل اس کا یہودیت کو بطور عقیدہ قبول کرنا یا اپنی زندگی میں لاگو کرنا نہیں بلکہ اس کا یہودی پیدا ہونا ہے۔اسی بات کے پیشِ نظر یہودی اس بات پر متفق ہیں کہ یہودی عورت کے بطن سے پیدا ہونے والی اولاد یہودی کہلائے گی۔چنانچہ مشنا/ مشناہ جو یہودی فقہی قوانین کا اولین مجموعہ کہلاتا ہے اس ضمن میں متنبہ کرتا ہے

"وہ جو ایک یہودی عورت کا بیٹا ہے وہ تمہارا بیٹا ہے اور وہ جو کسی غیر یہودی عورت کا بیٹا ہے وہ تمہارا بیٹا نہیں وہ اس عورت کا بیٹا ہے۔"[3] ایسا یہودی جس کی ماں یہودی ہو "پیدائشی یہودی" کہلائے گا۔ فی زمانہ اس شرط کا اطلاق سہل معلوم ہوتا ہے کیونکہ بچے کی پیدائش پر اس کا اندراج کروا کر ولادت کا سرٹیفکیٹ حاصل کرنا یا ڈی این اے کی تشخیص کے ذریعے والد یا والدہ کی نشاندہی کرنے جیسی سہولیات کی فراوانی ہے۔ یہودی تاریخ جو جنگ و جدل کی یاداشتوں، غلامی کی داستانوں اور نہ ختم ہونے والی ہجرتوں سے معمور ہے اس بات کی عکاس ہے کہ یہودی قرار دیے جانے کی یہ نسل پرستانہ شرط خود یہودیوں کے لیے کیسی کٹھن رہی ہے۔ تاہم یہ نسلی تعصب تاریخ میں ان کے لیے اعتماد، ہمدردی اور بھائی چارے کی نوید بھی تھا۔ ان کی زندگی میں ایسے متعدد مواقع آئے جب وہ تھوڑے تھے اور غیر یہودیوں پر بھروسا نہیں کر سکتے تھے۔ اس وقت یہ نسلی امتیاز ان کے لیے اطمینان کا باعث تھا کہ وہ کسی غیر پر نہیں بلکہ اولادِ یعقوبؑ پر اعتماد کر رہے ہیں۔

کسی کے یہودی ہونے کو ماں کے ذریعے جاننے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اگلے وقتوں میں بچے کے والد کی تشخیص میں شک ہو سکتا تھا جبکہ والدہ کے متعلق خال خال ہی ایسا مسئلہ بنتا تھا۔ لہذا یہودیوں نے یہودیت کی پرکھ کے لیے ماں کی شرط رکھی۔ دوم یہ کہ بچے کی پیدائش اور پرورش کی ذمہ داری زیادہ تر ماں ہی نبھاتی رہی ہے۔ چنانچہ ماں ہی کو اس سلسلے میں ذمہ دار مانا گیا۔ اس لحاظ سے کسی یہودی عورت کے لیے یہ فخر کی بات ہے کہ اس کے بطن سے پیدا ہونے والی اولاد یہودی قوم کی شناخت ہے۔

پیدائشی یہودی کو تمام یہودی فرقوں میں بالاتفاق یہودی ہونے کا درجہ حاصل ہے۔ کچھ یہودی فرقوں کے نزدیک تو اگر کوئی پیدائشی یہودی، یہودیت کی پیروی نہ بھی کر رہا ہو تو بھی وہ یہودی ہی رہے گا لیکن اس کے رتبے میں فرق آ جائے گا۔ اسی طرح ایسا شخص جس کی ماں تو یہودی ہو لیکن باپ یہودی نہ ہو تو وہ بھی پیدائشی یہودی ہی ہو گا لیکن رتبے کے لحاظ سے کمتر ہو گا۔ تلمود/تالمود جسے یہودیوں کے شرعی قانون کا درجہ حاصل ہے، ایسے یہودی کے لیے ممزیر کی اصطلاح استعمال کرتی ہے۔ ممزیر سے مراد ایسا شخص بھی ہے جس کے ماں باپ کے تعلقات یہودی قانون یعنی ہلاخا کے مطابق درست نہ ہوں، مثلاً خونی رشتہ داروں کی اولاد ممزیر کہلائے گی لیکن یہ ناجائز نہیں سمجھی جائے گی کیونکہ بچہ باقاعدہ شادی کے بعد پیدا ہوا ہے۔

بعض یہودیوں کے نزدیک پیدائشی یہودی اپنا مذہب چھوڑ دینے کے بعد بھی یہودی رہ سکتاہے۔دوسرے لفظوں میں اگر کوئی یہودی،عیسائیت یا اسلام قبول کرلیتاہے تو بھی وہ یہودی ہو سکتاہے۔البتہ "اصلاح شدہ یہودیت"جو عصر حاضر میں یہودیت کاایک بڑا مذہبی فرقہ ہے اس بارے میں مختلف نظریہ رکھتا ہے۔ اس فرقے کے نزدیک جو انسان یہودیت چھوڑ کر کسی دوسرے مذہب کو اپنا چکا ہو،یہودی نہیں ہو سکتا۔مزید براں،یہ فرقہ پیدائشی یہودی کی ماں کے لیے بھی یہودی ہونالازمی نہیں سمجھتا۔اصلاح شدہ یہودیوں کے ہاں اگر کسی کا باپ یہودی ہو تو بھی وہ پیدائشی یہودی ہی تصور کیا جائے گا لیکن ایسے انسان کا یہودیت کی بنیادی تعلیمات سے واقف ہوناضروری ہے۔یہ چیز یہودیوں کے درمیان اختلاف کا باعث بھی ہے۔"رجعت پسند" اور "راسخ العقیدہ" عصرِ حاضر کے دو بڑے یہودی فرقے ہیں۔یہ دونوں فرقے اس ضمن میں اصلاح شدہ یہودیوں کی آرا کے حق میں نہیں ہیں۔اس لیے شادی بیاہ کے وقت مختلف یہودی گروہ اس معاملے میں باہم اختلاف کا شکار رہتے ہیں کہ اصلاح شدہ یہودیوں کی شادی راسخ العقیدہ یا رجعت پسند یہودیوں کے ہاں ہو بھی سکتی ہے یا نہیں۔ہر سال ایک بڑی تعداد میں اس قسم کے مقدمات اسرائیلی عدالتوں میں فیصلوں کے لیے پیش کیے جاتے ہیں۔اس لیے مختصراً یہ کہا جاسکتا ہے تمام یہودیوں کا اس بات پر اتفاق ہے کہ جس شخص کی ماں یہودی ہو گی وہ پیدائشی یہودی تصور کیا جائے گا۔ جس شخص کا باپ یہودی ہو گا وہ اصلاح شدہ یہودیوں کے نزدیک یہودی تصور کیا جائے جبکہ رجعت پسند اور راسخ العقیدہ یہودیوں کے ہاں اس کی یہودیت مشکوک ہو گی۔

ملحد یہودی

کچھ یہودیوں کے نزدیک ملحد اور لادین ہو جانے والا پیدائشی یہودی بھی یہودی ہی رہے گا۔چونکہ یہودیت میں نسل اور مذہب دونوں ہی کسی شخص کو یہودی بناتے ہیں اس لیے "ملحد یہودی" ایک باہم متضاد اصطلاح نہیں ہے۔کچھ راسخ العقیدہ یہودی یہ بھی کہتے ہیں کہ توریت کی محبت کسی کی یہودیت کے ثبوت کے لیے کافی ہے اگرچہ اس کا خدا پر یقین ہو یا نہیں۔ مطالعہ مذاہب کے کسی طالب علم کے لیے جو سامی مذاہب کے بنیادی عقائد سے واقفیت رکھتا ہو یہ بات عجیب ہے جبکہ یہودیوں کے لیے ایسا ہونا عین ممکن ہے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ یہودیت بنیادی طور پر ایک ایسا مذہب ہے جو عقیدے سے زیادہ اعمال پر توجہ دیتا ہے۔اس لحاظ سے بعض یہودی

یہ سمجھتے ہیں کہ جو یہودی توریت کے احکامات پر عمل کر رہا ہے وہ ہر حال میں یہودی ہی رہے گا۔ وہ اس بات کی دلیل عبرانی بائبل سے لیتے ہیں جس کے مطابق: "تب تم ان سے کہنا، خداوند فرماتا ہے۔ اس لئے کہ تمہارے باپ دادا نے مجھے چھوڑ دیا اور دوسرے خداؤں کے طالب ہوئے اور ان کی عبادت کی اور مجھے (خدا کو) ترک کیا اور میری شریعت پر عمل نہیں کیا۔"[4] اس بیان کے آخری حصے میں پہلے خدا کا ذکر ہے کہ اس کو چھوڑ دیا گیا اور بعد میں یہ تنبیہ ہے کہ شریعت پر بھی عمل نہیں کیا گیا۔ یہ اس بات کی طرف اشارہ ہو سکتا ہے کہ خدا کو اگر ترک کر ہی دیا ہے تو شریعت پر ہی عمل جاری رکھا گیا ہوتا۔ اس ضمن میں شاید اہم ترین بیان پانچویں صدی کے ایک ربی (یہودی عالم) کا ہے جن کے مطابق اس سے مراد یہ ہے کہ "کاش وہ مجھے ترک کر دیتے اور میری توریت کو برقرار رکھتے۔"[5] "ربیائی یہودیت" جس میں اعمال کی طرف زیادہ توجہ دی گئی ہے چھٹی صدی عیسوی سے یہودیت کی اہم قسم ہے۔ اس دور کے کسی ربی کی بات نہایت اہمیت کی حامل سمجھی جاتی ہے۔ اسی بنیاد پر کچھ یہودی ایسے منکرین خدا کو بھی یہودی ہی سمجھتے ہیں جو پیدائشی یہودی ہوں۔

یہودیوں کی مختلف اقسام

1. پیدائشی یہودی
2. ملحد یہودی
3. مرضی سے بننے والے یہودی

یہ رویہ تمام یہودیوں کے لیے قابل قبول نہیں، مثلاً موسیٰ ابن میمون (1138-1204) ایک ایسے عہد ساز یہودی عالم تھے جنہوں نے یہودیت کے بنیادی عقائد تشکیل دیے اور تیرہ اساسی اصول متعین کیے جو فی زمانہ بھی بیشتر یہودیوں کے ہاں مقبول ہیں۔ ان اصولوں کی ابتدا ہی خالق کل، واحد لاشریک، لا مکاں، ماورائے مادہ اور نہ تھکنے والے ابدی خدا پر یقین سے ہوتی ہے۔[6] اس وجہ سے ایسا یہودی جو خدا ہی پر یقین نہیں رکھتا ابن میمون کے اصولوں پر پورا نہیں اترتا۔ اسی طرح رجعت پسند یہودی اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ خدا پر اعتقاد یہودی ہونے کے لیے ایک لازمی امر ہے۔ یہودیت میں بدعتی کے لیے "مینیم" کی اصطلاح استعمال کی جاتی ہے۔ یہودیوں کے خیال میں مینیم کا آنے والی دنیا یعنی آخرت میں کوئی حصہ نہیں ہے۔ ناچمن (وفات 320) جو کے چوتھی صدی عیسوی کے ایک مشہور ربی تھے نے مینیم سے مراد ایسا انسان بھی لیا ہے جو خدا پر اعتقاد کا منکر ہو۔[7] اس کے علاوہ توریت پر یقین نہ رکھنے والا بھی

مینیم ہی سمجھا جاتا ہے۔ مختصراً یہ کہا جا سکتا ہے کہ ربی خود اس ضمن میں تضاد کا شکار ہیں کہ ایسا پیدائشی یہودی جو خدا کا منکر ہو یہودی ہو سکتا ہے یا نہیں۔ ان میں سے ایک گروہ یہ سمجھتا ہے کہ ایسا انسان چونکہ پیدائشی یہودی ہے لہذا جو کچھ بھی ہو وہ یہودی ہی رہے گا جبکہ دوسرا گروہ یہ سمجھتا ہے کہ منکر خدا یہودی نہیں ہو سکتا۔

مرضی سے بننے والے یہودی

عموماً یہ سمجھا جاتا ہے کہ یہودیت نسل کے اعتبار سے چلنے والا مذہب ہے اور کوئی انسان اپنی مرضی سے یہودی نہیں بن سکتا۔ اگرچہ عبرانی بائیبل میں یہودیت اختیار کرنے کے لیے یا مذہبی تبدیلی کے لیے کوئی خاص اصطلاح موجود نہیں لیکن کچھ ایسی اصطلاحات کا ذکر اس میں موجود ہے جن سے اس عمل کی مختلف صورتوں کے متعلق علم ہوتا ہے، مثلاً بعض یہودی مفکرین نے لکھا ہے کہ تنخ نے "ہتیاہید" کی اصطلاح ان فارسیوں کے لیے استعمال کی ہے جو یہودیوں کے ڈر سے یہودی بن گئے تھے۔ "امیلم" کی اصطلاح ان غیر یہودی اقوام کے لیے استعمال کی گئی ہے جنہیں مختون کیا گیا۔ "نِلواہ" ان اجنبیوں کو کہا گیا جنھوں نے خدا سے تعلق جوڑا۔[8] اگر ان یہودی مفکرین نے ان اصطلاحات کے درست معنی اخذ کیے ہیں تو ان سے یہ واضح اشارہ ملتا ہے کہ قدیم عبرانیوں کے دور ہی سے یہودیت کو بھی دیگر مذاہب کی طرح اختیار کیا جا سکتا تھا۔

عبرانی بائیبل میں بھی اس ضمن میں اشارات موجود ہیں کہ پیدائشی یہودیوں کے علاوہ بھی دیگر لوگ یہودی بن سکتے ہیں، مثلاً مذکور ہے: "وہ غیر ملکی جو تمہارے درمیان رہتے ہیں ان سے ایسا سلوک کرو جیسا اپنے درمیان پیدا ہونے والے باشندوں سے کرتے ہو۔ ان سے ایسی محبت کرو جیسی خود سے کرتے ہو۔"[9] توریت کی کتاب استثنا میں مزید وضاحت کے ساتھ ان عورتوں کا بیان ہے جو جنگی قیدی ہونے کے باوجود یہودیوں کی بیویاں بن سکتی ہیں:

> تم جنگ میں اسیر شدہ کسی خوبصورت عورت کو دیکھ سکتے ہو تم اسے پانا چاہ سکتے ہو اور اپنی بیوی کے طور پر رکھنے کی خواہش کر سکتے ہو۔ تمہیں اسے اپنے خاندان میں اپنے گھر لانا چاہیے۔ اسے اپنے بال منڈوانے اور اپنے ناخن کاٹنے چاہیے۔ اسے اپنے پہنے ہوئے ان کپڑوں کو جب وہ قیدی تھی اتارنا چاہیے اسے تمہارے گھر میں رہنا چاہیے اور ایک ماہ تک اپنے ماں باپ کے لئے رونا چاہیے۔ تب تم اس کے ساتھ شوہر کی طرح رہ سکتے ہو اور وہ تمہاری بیوی بن جائے گی۔[10]

بعض مصنفین نے یہ بھی ذکر کیا ہے کہ مرضی سے بننے والے یہودی خدا کے محبوب ہیں کیونکہ ان لوگوں نے خود اپنی کوشش سے یہودیت کو اختیار کیا ہے۔ چنانچہ جو ایسے لوگوں کو ستاتا ہے وہ خدا کو ستانے کی کوشش کرتا ہے۔[11] بہت سے یہودی، یہودیت کو صرف ایک مذہب ہی نہیں سمجھتے بلکہ ان کے نزدیک یہ تہذیب، ثقافت اور قومیت کے عناصر پر مبنی ایک نظام بھی ہے۔ اس میں جہاں نسلیت اہم ہے وہیں مذہب کو بطور تہذیب و ثقافت اپنا کر اس کے احکامات کی پیروی کرنا بھی شامل ہے۔ لہٰذا وہ یہودی گروہ جو یہ سمجھتے ہیں کہ خدا صرف یہودی نسل ہی کا خدا نہیں بلکہ مالکِ کل کائنات بھی ہے وہ اپنی کتبِ مقدسہ ہی سے استدلال کر کے یہ بتاتے ہیں کہ یہودیت کو باقاعدہ مذہب کے طور پر بھی اپنایا جا سکتا ہے۔ اس ضمن میں جیمارا/ گمارا جو تلمود کا ایک اہم جزو ہے درج ذیل اشارہ دیتی ہے:

> ربیوں نے سکھایا: اگر آج کل کوئی خود کو یہودی بننے کے لیے پیش کرے تو ہم اسے کہتے ہیں: تم کیوں یہودی بننا چاہتے ہو؟ کیا تم نہیں جانتے کہ ان دنوں اسرائیلی آشفتہ، صعوبت کے مارے، پریشان، ذلیل اور ستائے ہوئے ہیں۔ اگر وہ یہ جواب دے: میں جانتا ہوں اور میں اس قابل نہیں تو ہم اسے قبول کر لیتے ہیں اور اسے کچھ نرم اور کچھ سخت وصیتیں سکھاتے ہیں۔۔۔[12]

کچھ مسیحی کتبِ مقدسہ سے بھی اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ مسیحؑ کے زمانے میں یہودی اپنے مذہب کی تبلیغ کے لیے لمبے لمبے سفر تک کیا کرتے تھے۔ عیسائیوں کی مقدس کتاب جسے عہد نامہ جدید کہتے ہیں میں بیان ہے: "اے شریعت کے عالمو، اے فریسیو! میں تمہارا انجام کیا بتاؤں تم توریا کار ہو تمہاری (بتائی ہوئی) راہوں کی پیروی کرنے والوں کی ایک ایک کی تلاش میں تم سمندروں کے پار مختلف شہروں کے دورے کرتے ہو۔ اور جب اس کو دیکھتے ہو تو تم اس کو اپنے سے بدتر بنا دیتے ہو اور تم نہایت برے ہو جیسے تم جہنم سے وابستہ ہو۔"[13] فریسی یہودیوں کا ایک مشہور فرقہ ہے۔ اس لیے درج بالا اقتباس سے پتہ چلتا ہے کہ مسیحؑ کے دور میں یہودی تبلیغ کے مقصد کے لیے سفر کیا کرتے تھے۔ اسی بنا پر یہ استدلال کیا جاتا ہے کہ اس دور کی یہودیت میں تبلیغ عام تھی۔ حتیٰ کہ ان لوگوں کو بھی خوش آمدید کہا جاتا تھا جو خدا پر یقین تو رکھتے تھے تاہم ختنہ جو یہودی روایت میں نہایت اہم تصور کیا جاتا تھا کروانے سے ڈرتے تھے۔ ایسے لوگوں کو "خدا سے ڈرنے والے" کہا جاتا تھا۔ بعض یہودی یہ بھی کہا کرتے تھے کہ جو شخص نوحؑ کو دیے گئے قوانین کی

پیروی کرتا ہے اس کا آخرت میں حصہ ہے۔[14]

کچھ تاریخی واقعات سے بھی اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ ماضی میں لوگ یہودیت کو بطور مذہب اپناتے رہے ہیں، مثلاً یوسف ابن شرحبیل (عہد 517-527) چھٹی صدی عیسوی کا ایک مشہور یمنی بادشاہ گزرا ہے۔ اس کا اصل نام ذو نواس تھا اور اس نے یہودیت کو بطور مذہب اپنایا اور اپنی ریاست میں موجود مسیحیوں پر ظلم و ستم کے پہاڑ اس لیے توڑے کہ روم میں بسنے والے مسیحی، یہودیوں پر ظلم کیا کرتے تھے۔[15] کچھ بااثر یہودی حکمران جبراً بھی لوگوں کو یہودیت میں داخل کیا کرتے تھے، مثلاً ہیروڈ (عہد 37-4 ق۔م) ایک مشہور یہودی حکمران گزرا ہے جسے رومیوں نے بنی اسرائیل پر حاکم مقرر کیا تھا۔ ہیروڈ کے والدین اصل میں ادومی تھے جنہیں مکابیوں کے دور میں زبردستی یہودی بنایا گیا تھا۔

درج بالا بحث سے ہر گز یہ مراد نہیں کہ عصرِ حاضر کی یہودیت تبلیغی یا مشنری مزاج کی حامل ہے۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق اس وقت دنیا میں 14.7 ملین یہودی آباد ہیں جو دیگر مذاہب کے پیروکاروں کی نسبت ایک محدود تعداد تصور کی جاتی ہے۔ یہودیوں کی اس کم تعداد کا ایک بنیادی سبب ان کا تبلیغ نہ کرنا بھی ہے۔ یہودی یہ سمجھتے ہیں کہ دنیا کے تمام لوگ خدا کے ہاں قابلِ قبول ہیں یہاں تک کہ وہ کچھ بنیادی اخلاقیات کی پیروی کر رہے ہوں۔ اگر وہ یہودی بن جاتے ہیں تو انہیں توریت کے تمام احکامات کی پیروی کرنی ہو گی۔[16] یعنی یہودیت کو باقاعدہ اختیار کرنے کے بعد یہودی شریعت کو پوری طرح اپنانا ہو گا۔ اسی لیے کچھ یہودی یہ بھی کہتے ہیں کہ تمام یہودی، یہودیت کی پیروی نہیں کرتے لیکن وہ لوگ جو یہودیت کی پیروی کرتے ہیں یہودی ہیں۔ اس لحاظ سے یہودیوں کا یہ سمجھنا کہ کسی غیر یہودی کا رسمی طور پر یہودی بننا کسی خاص امتیاز کا حامل نہیں ہے، انہیں اپنے مذہب کی تبلیغ کی طرف مائل نہیں کرتا جو ان کی تعداد میں کمی کا باعث بھی ہے۔ عصر حاضر میں عمومی شرائط جن پر عمل پیرا ہو کر کوئی بھی شخص یہودی بن سکتا ہے درج ذیل ہیں:

1. توریت میں مذکور 613 وصیتوں یعنی متسواہ/مِتس واہ جن کا تعلق عبادات وغیرہ سے ہے کے تقاضوں کو پورا کرنا۔
2. بریت میلا یعنی مردوں کے لیے ختنہ کروانا۔

3. مِک وے یعنی مقدس تالاب میں غسل کرکے پاکی حاصل کرنا۔
4. خدا کے حضور قربانی دینا۔[17]

اصلاح شدہ یہودیوں کے ہاں میلا اور مک وے کسی کے یہودی بننے کے لیے ضروری نہیں۔ یہی کافی ہے کہ ان کا علم اس شخص کو ہو جو یہودی بننا چاہ رہا ہے۔ مزید یہ کہ وہ شخص متسواہ کی ان تشریحات پر عمل کرے جو اصلاح شدہ یہودیوں نے متعین کی ہیں۔ کچھ یہودی اس ضمن میں یہ بھی شامل کرتے ہیں کہ نئے فرد کہ لیے ضروری ہے کہ وہ کسی یہودی خاندان کے ساتھ کچھ عرصہ بسر کرے اور ان سے یہودی طور اطوار اور مذہب سیکھے۔ اس کے برعکس ایک نظریہ اور بھی ہے کہ یہودی بننا انسان کے جذبہ ایمانی پر منحصر ہے۔ اگر وہ پُرعزم ہے کہ وہ یہودیت کو بطور مذہب اپنا لے گا تو اس کی یہودیت کی بنیادی باتوں سے آگاہی کافی ہے۔ اس کے لیے ضروری نہیں کہ وہ کسی یہودی خاندان کے ساتھ وقت بھی گزارے۔[18] یہودیت میں ابراہیمؑ کو اولین بزرگ مانا جاتا ہے۔ جب وہ 99 برس کے ہوئے تو خدا نے انہیں اپنا عہد دیا۔ اس واقعہ سے یہ نتیجہ بھی نکلتا ہے کہ یہودی بننے کے لیے عمر کی کوئی انتہائی حد مقرر نہیں ہے۔ انسان جب چاہے یہودیت اختیار کر سکتا ہے۔

موجودہ اسرائیلی قانون

جیسا کہ پچھلی بحث سے یہ واضح ہوتا ہے کہ یہودیت میں غیر یہودیوں کو بھی خوش آمدید کہا جاتا ہے۔ چنانچہ جدید اسرائیل میں شہریت ان لوگوں کو بھی دی جاتی ہے جو پیدائشی یہودی نہیں ہوتے۔ اس کے لیے 1950 میں "قانونِ واپسی" تشکیل دیا گیا۔ یہ قانون کسی شخص کے یہودی ہونے کی تعریف اس طرح کرتا ہے کہ ہر وہ آدمی یہودی ہے "جو ایک یہودی عورت سے پیدا ہوا یا جس نے یہودیت کو قبول کیا اور وہ کسی دوسرے مذہب کا رکن نہیں ہے۔"[19] ایسے شخص کو اسرائیل کی شہریت کے لیے موزوں تو سمجھا جاتا ہے لیکن اس نو یہودی کو بعض معاملات کے لیے دوسرے یہودیوں کی حمایت حاصل ہونا ضروری ہے، مثلاً اسرائیل میں شادی کے لیے اسے یہ ثابت کرنا ہو گا کہ اس نے کسی راسخ العقیدہ یہودی کی نگرانی میں یہودیت کو قبول کیا ہے اور اس کو ملک کے اعلی ربیائی ادارے نے منظور کیا ہے۔ 2019 میں اسرائیل کے مشہور اخبار ہاریتز نے یہ بیانیہ بھی شائع کیا تھا کہ ربی اعظم نے کچھ شادیوں کے اجازت نامے دینے کے لیے ڈی این

اے ٹیسٹ کروانے پر زور دیا تاکہ شادی سے پہلے جوڑوں کی یہودیت کو پرکھا جا سکے۔[20] اسی اخبار نے یہ بھی شائع کیا کہ یہودی اب خود یہ ناپسند کرتے ہیں کہ انہیں رنگ، نسل یا خون کی رو سے پرکھا جائے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ یہودیت نسل اور خون سے ماورا ہے۔ 2019 ہی کے ایک سروے کے مطابق تقریباً 32 فیصد اسرائیلی یہودی اس بات کو بھی ناپسند کرتے ہیں کہ ربی اعظم یا کوئی اور ان کی یہودیت کو پرکھے۔ البتہ 50 فیصد سے زائد اس حق میں ہیں کہ شادی غیر یہودیوں میں نہیں کی جانی چاہیے۔[21]

یہودیوں کی آرا میں عدم اتفاق کے حوالے سے ان کے اپنے ہاں ایک لطیفہ رائج ہے جو اس ضمن میں بھی صادق آتا ہے کہ جب تین یہودی ایک ساتھ آئیں تو یہ یقین کر لینا چاہیے ان کی آرا چار ہوں گی۔ اسی طرح کسی کے یہودی ہونے یا نہ ہونے کے بارے میں بھی اختلاف ہے۔ یہودی ریاست کا نسل پرستانہ نظریہ اس قدر اہمیت کا حامل رہا ہے کہ کسی فرد کے ذاتی عقیدے کے برعکس اس کا نسلی امتیاز اس کی مذہبی حیثیت متعین کر سکتا ہے۔ مختصراً یہ کہا جا سکتا ہے کہ:

1. جو بچہ یہودی ماں کے بطن سے پیدا ہو وہ یہودی کہلائے گا۔
2. اصلاح شدہ یہودی ایسے شخص کو بھی یہودی ہی گردانتے رہے ہیں جس کا صرف باپ ہی یہودی ہو۔
3. ایسا شخص بھی یہودی ہے جو ربیوں کی بیان کردہ بنیادی اخلاقیات کی پیروی کر رہا ہے۔
4. یہودیت کو اپنی مرضی سے بھی اختیار کیا جا سکتا ہے۔ مختلف یہودی مذہبی فرقے ایسے یہودی کے رتبے کا تعین خود کرتے ہیں۔
5. ہر وہ فرد بھی یہودی ہو سکتا ہے جو ایک خدا پر ایمان لائے، توریت کے احکامات پر عمل کرے اور کسی دوسرے مذہب کو اختیار نہ کرے۔

یہودیت کے ابتدائی بزرگ

جدید تحقیقات کے مطابق یہودیت کی تاریخ تقریباً چار ہزار سال پرانی ہے۔ آثار قدیمہ کے لیے ہونے والی کھدائیوں کے دوران میسوپوٹیمیا، فلسطین، ترکی اور شام سے ایسی مذہبی کتب، ذاتی استعمال کی چیزیں اور دریافتیں ہوئیں ہیں جن سے ابتدائی یہودیت کے متعلق معلومات ملتی ہیں۔ خود عبرانی بائیبل یہودیت کی ابتدا کو دنیا کی تخلیق کے ساتھ جوڑتی ہے اور نوحؑ

کی کشتی اور طوفان کے ذریعے زندگی کی دوسری ابتدا کے متعلق نظریات فراہم کرتی ہے۔ سام بن نوحؑ کو بھی ابراہیمؑ کا جدامجد بیان کیا گیا ہے اور اسرائیلیوں کو آرامیوں کی اولاد بھی کہا گیا ہے۔ اس بارے میں مذکور ہے: "تب تم خداوند اپنے خدا کے سامنے یہ کہو گے: میرے آباؤ اجداد گھومنے پھرنے والے آرامی تھے وہ مصر پہنچے اور وہاں رہے جب وہ وہاں گئے تب اس کے خاندان میں بہت کم لوگ تھے لیکن مصر میں وہ ایک طاقتور کثیر تعداد والی عظیم قوم بن گئی۔"[22]

یہودی خود اپنی ابتدا کو ابراہیمؑ کے حوالے سے بیان کرنا پسند کرتے ہیں۔ آپؑ کو اولین بزرگ سمجھا جاتا ہے۔ یہودیوں میں بزرگوں کی تین نسلیں مشہور ہیں جن میں آپؑ کے علاوہ آپؑ کے بیٹے اسحاقؑ اور ان کے بیٹے یعقوبؑ کی اولاد شامل ہیں۔ ایک اندازے کے مطابق یہ دور 2000–1550 یا 1500–1200 قبل مسیح پر محیط ہے۔

توریت میں عبرانیوں کے مذہب کے لیے کوئی خاص اصطلاح مہیا نہیں کی گئی۔ نہ ہی یہ پتہ چلتا ہے کہ ابتدا میں ان لوگوں نے خود اپنے مذہب کے لیے کیا نام تجویز کیا تھا۔ معلوم تاریخ سے محققین یہ نظریہ قائم کرتے ہیں کہ یہودیت کو یہ نام یہودا کی وجہ سے ملا جو کہ یعقوبؑ کے بیٹے تھے۔ اس سے پہلے تک یہودیت کے لیے کوئی خاص نام مختص نہیں تھا۔ چونکہ یہ لوگ عبرانی کہلاتے تھے اس لیے ان کے مذہب کو بھی "قدیم عبرانیوں کا مذہب" کہہ دیا جاتا ہے۔ اس لحاظ سے یہودیت، عبرانیوں کے اسی مذہب کی ارتقائی شکل ہے جو ہیکل سلیمانی کے دوسری دفعہ بننے کے بعد رواج پائی۔ اس سے پہلے تک اس مذہب کو یہودی مذہب یا یہودیت کا نام نہیں دیا گیا تھا۔[23] قدیم عبرانی مذہب کے متعلق تاریخی معلومات کا ایک بڑا ذریعہ عبرانی بائبل ہے لیکن اسے بہت سے یہودی مؤرخین ایک مستند تاریخی کتاب نہیں سمجھتے۔ اس کے تاریخی حوالوں کی توثیق کے لیے ہمارے پاس فی الحال کوئی دوسرا ذریعہ بھی موجود نہیں ہے۔ اسی وجہ سے درج ذیل تفصیلات کو "یہودیوں کی تاریخ" کی بجائے "عبرانی بائبل میں مذکور عبرانیوں کی تاریخ" کہنا زیادہ درست ہو گا۔

ابراہیمؑ

ابراہیمؑ تقریباً 2200 سال قبل مسیح عراق کے ایک قصبے اُر/اور میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے زندگی کا ایک بڑا حصہ سفر میں گزارا۔ اُر سے وہ شام اور پھر کنعان گئے۔ کنعان سے مصر اور

پھر دوبارہ کنعان واپس آئے۔ان کے والد جنہیں توریت نے تارح کے نام سے یاد کیا ہے، سام بن نوح کی اولاد میں سے تھے۔تارح ایک ماہر بت تراش تھے۔چونکہ ان کی قوم بت پرست تھی اس لیے اپنی بت تراشی کی وجہ سے تارح کو ان میں خصوصی مرتبہ حاصل تھا۔اپنے والد کے برعکس ابراہیمؑ ایک خدا پر یقین رکھتے تھے اور انہیں اپنی قوم کا مشرکانہ رویہ پسند نہ تھا۔ وہ اس بات کے قائل تھے کہ عقلی طور پر یہ ممکن نہیں کہ خداایک سے زائد ہوں۔ عبرانی بائبل سے پتہ چلتا ہے کہ ان کے ایک خدا پر اس قوی اعتقاد کی وجہ سے خدا بھی ان پر مہربان ہوااوران سے مخاطب ہو کر کہا:

بزرگ

1. ابراہیم 2. اسحاق
3. یعقوب

> تواپنے ملک اوراپنے لوگوں کو چھوڑ کر چلا جا۔تواپنے باپ کے خاندان کو چھوڑ کراس ملک کو چلا جا جسے میں دکھاؤں گا۔ میں تجھے خیر و برکت عطا کروں گا اور تجھے ایک بڑی قوم بناؤں گا۔ پھر تیرے نام کو خوب شہرت دوں گا۔لوگ تیرے نام کا استعمال دوسرے لوگوں کو دُعادینے کے لئے کریں گے اور کہا کہ تیرے ساتھ بھلائی کرنے والوں کو میں برکت دوں گا۔وہ جو تیری بُرائی چاہنے والے ہیں میں اُن کو سزادوں گا۔تیری معرفت سے اہل دُنیا برکت پائیں گے۔[24]

"کتاب پیدائش" توریت کی پہلی کتاب ہے۔اس کتاب کا بارہواں باب اس ضمن میں تفصیلاً ابراہیمؑ کا قصہ بیان کرتا ہے کہ انہوں نے اپنا گھر بار چھوڑ کر خدا کے حکم پر کنعان ہجرت کی۔ وہ اپنی بیوی سارہؓ اور بھتیجے لوطؑ کو ساتھ لے گئے۔ خدانے ان سے کہا کہ یہ ملک ان کی نسل کو واپس دے دیا جائے گا۔ کنعان سے وہ مصر چلے گئے۔ سارہؓ حسین و جمیل تھیں تو ابراہیمؑ نے ان سے کہا کہ وہ کسی سے اس بات کا تذکرہ نہ کریں کہ وہ ان کی بیوی ہیں۔اگر کوئی پوچھے تو خود کو ان کی بہن کہیں تاکہ مصری لوگ انہیں چھیننے کے لیے ابراہیمؑ کو نقصان نہ پہنچائیں۔ فرعونِ مصر نے جب یہ دیکھا کہ آپؑ ان کے بھائی ہیں تو اس نے آپؑ کو بہت سامال وزر دیالیکن سارہؓ کو اپنی بیوی بنانے کے لیے قبضہ میں لیا۔خدا کا عذاب اس پر اترا جس پر وہ بہت پریشان ہوااور سارہؓ، ابراہیمؑ اور ان کے اہل واعیال کو مصر سے باہر نکال دیا۔اس وقت تک آپؑ بے اولاد تھے۔سارہؓ کو اس بات کا ادراک تھا کہ ان سے آپؑ کی کوئی اولاد نہیں ہے۔اولاد کے حصول کے لیے انہوں نے اپنی

لونڈی ہاجرہؑ کو آپؑ کی زوجیت میں دیا جن سے اسماعیلؑ پیدا ہوئے۔ اسماعیلؑ کی پیدائش آپؑ کی خوشیوں کا پیش خیمہ ثابت ہوئی۔

خدا نے آپؑ کو اپنا عہد دیا جسے عہد ابراہیمی کہا جاتا ہے۔ یہ عہد عبرانیوں کی تاریخ میں نہایت اہمیت کا حامل ہے اور "ارض موعود"، "منتخب قوم"، "ختنہ" اور "عبرانیوں اور دیگر قوموں میں فرق" سمیت بہت سے مذہبی نظریات کو سمجھنے میں مدد دیتا ہے۔ یہ عہد نہ صرف آپ کی نسل بلکہ ہر اس شخص کے لیے تھا جس کو آپؑ نے اپنے ساتھ شامل کر لیا تھا۔ یہی عہد بریت میلا یعنی ختنہ کی بھی بنیاد ہے۔ خدا نے ان سے وعدہ کیا کہ ان کی اولاد اس کثرت سے ہو گی کہ آسمان کے ستاروں اور ریت کے ذروں کی طرح گنی نہ جا سکے گی۔ ان کی نسل کے لیے ایک خاص سرزمین مختص کی جائے گی۔ اس حوالے سے توریت میں مذکور ہے:

> تو بہت ساری قوموں کا باپ ہو گا۔ تیرا نام اَبرام کے بجائے ابراہیم رکھتا ہوں۔ اب اِس کے بعد تجھے ابراہیم ہی پُکاریں گے۔ اس لیے کہ اِس کے بعد کئی نسلوں کے لئے تیری حیثیت جدّ اعلیٰ کی ہو گی۔۔۔ یہ معاہدہ ہمیشہ رہے گا۔ میں تیرا اور تیری نسلوں کا خدا ہوں گا۔ تُو جس کنعان کی طرف سفر کر رہا ہے وہ تجھے تیری ساری نسلوں کو ہمیشہ کے لئے دُوں گا۔۔۔ تو اور تیری نسل اس معاہدے کا ضرور پالن کرے کہ ہر ایک مرد کا ختنہ ضرور کیا جانا چاہیے۔[25]

کتابِ پیدائش میں یہ بھی مذکور ہے کہ خدا نے سارہؑ کو بھی ایک بیٹے سے نوازا جن کا نام اسحاقؑ رکھا گیا۔ خدا نے ابراہیمؑ کو بتایا کہ اگرچہ وہ اسماعیلؑ کو بھی برکت سے نوازے گا اور ان کی اولاد سے بارہ بڑے قبیلے وجود میں آئیں گے تاہم ان سے کیا ہوا عہد اسحاقؑ ہی کے ذریعے آگے بڑھے گا۔ یہودی روایات کے مطابق خدا نے انہیں اسحاقؑ کی قربانی کا حکم دے کر آزمایا۔ وہ اس آزمائش میں بھی پورے اترے۔ انہوں نے خود کو اور اپنے اہل و عیال میں موجود تمام مردوں کو مختون کیا۔ اس طرح ان میں اور خدا کے درمیان ایک روحانی ہی نہیں بلکہ جسمانی عہد بھی تشکیل پا گیا۔

ابراہیمؑ وہ پہلے شخص نہیں تھے جن کے ساتھ خدا نے عہد کیا۔ عبرانی بائبل کے مطابق اس سے پہلے نوحؑ اور ان کے بعد میں آنے والوں اور یہاں تک کہ ان کی کشتی سے نکلنے والے ہر جاندار کے ساتھ خدا نے ایک معاہدہ کیا تھا کہ وہ دوبارہ انہیں پانی کے طوفان کے ذریعے تباہ و برباد نہیں کرے گا۔ جس طرح ابراہیمؑ کو کثرت اولاد کی خبر دی گئی تھی جو اس زمانہ کے لوگوں کے

لیے باعثِ برکت ورحمت تھی،اسی طرح نوحؑ کو کہا گیا تھا کہ "اے نوح تیری اور تیری اولاد کی نسل کا سلسلہ کثرت سے بڑھے اور پوری زمین میں پھیل جائے۔"[26] اس معاہدے میں خدا نے آسمان پر چھانے والی قوس وقزح نشانی کے طور پر منتخب کی تھی تاکہ اس کو دیکھ کر وہ اپنا معاہدہ یاد کر سکیں۔اس لحاظ سے ابراہیمؑ کے ساتھ کیا گیا یہ عہد، نوحؑ کے ساتھ کیے گئے عہد کا تسلسل بھی سمجھا جاسکتا ہے اور شاید یہی بڑی وجہ ہے کہ ربی یہ سمجھتے ہیں جو شخص نوحؑ کو دیے گئے عہد کی پاسداری کررہا ہو وہ بھی یہودی ہی کہلائے گا۔

اسحاقؑ

ابراہیمؑ بت پرستوں کے درمیان اسحاقؑ کی شادی نہیں کرنا چاہتے تھے۔انہوں نے اپنے ایک ملازم کو میسوپوٹیمیا بھیجا تاکہ ان کے بیٹے کے لیے کوئی لڑکی ڈھونڈ کر لائے۔اس نوکر نے خدا سے دعا کی اور بیتوایل کی بیٹی ربقہ کو اسحاقؑ کے لیے پسند کیا۔ابراہیمؑ 175 برس زندہ رہ کر فوت ہو گئے۔اسحاقؑ کے ہاں دو بیٹے پیدا ہوئے جن میں سے ایک کا نام عیساؤ اور دوسرے کا نام یعقوبؑ تھا۔اسحاقؑ بھی اپنے والد کی طرح ایک جگہ قیام نہ کرپائے۔اپنے والد کی طرح وہ بھی خانہ بدوش تھے اور مویشیوں کی تجارت سے منسلک رہے۔ جس جگہ وہ پڑاؤ ڈالتے وہاں کے لوگ ان کی افرادی قوت اور مال وزر دیکھ کر انہیں وہاں سے نکل جانے کو کہہ دیتے کیونکہ وہ ایک امیر آدمی تھے جن کے لیے خدا نے مٹی کو سونا بنادیا تھا۔

یعقوبؑ

جب اسحاقؑ بوڑھے ہو گئے اور انہوں نے عیساؤ کے ذریعے عہد خداوندی کو آگے بڑھانے کا سوچا تو ربقہ نے یعقوبؑ کے حق میں اسحاقؑ سے دعا کروانے کے اسباب کر دیے۔ایسا کرنے سے اگرچہ اسحاقؑ نے یعقوبؑ کے حق میں برکت کی دعا کر دی لیکن اس سے دونوں بھائیوں میں ناراضگی پیدا ہو گئی اور یعقوبؑ کو بھی اپنے دادا اور والد کی طرح اپنے گھر کو خیر آباد کہنا پڑا۔وہ حاران اپنے ایک چچا کے پاس چلے گئے۔انہوں نے دو شادیاں کیں اور ان کے بارہ بیٹے پیدا ہوئے۔جب ان کے بھائی عیساؤ کی ناراضگی دور ہو گئی تو وہ کنعان واپس آئے۔واپسی ہی کے سفر میں ان کو "اسرائیل" کا لقب ملا۔ان کے بارہ بیٹوں میں سے ایک کا نام یوسفؑ تھا جن سے انہیں بہت پیار تھا۔آپؑ کے دیگر بھائی اسے یک طرف رویہ سمجھتے ہوئے ان سے حسد کرنے لگے اور

اس تدبیر میں لگے رہے کہ کسی طرح یعقوبؑ اور یوسفؑ میں علیحدگی ہو جائے۔ یہ حسد اور بھی بڑھ گیا جب یوسفؑ نے ایک خواب کے متعلق ان کو آگاہ کیا کہ "ایک سورج، چاند اور گیارہ ستارے میرے سامنے جھک کر مجھے سجدہ کرتے ہیں۔"[27] بھائیوں کو لگا کہ یوسفؑ اُن پر حکومت کرنا چاہ رہے ہیں۔ انہوں نے دھوکے سے ان کو ایک کنویں میں قید کر دیا اور پھر مصر کے اسماعیلی تاجروں کے ہاتھ فروخت کر دیا۔ اپنے والد کو انہوں نے بتایا کہ یوسفؑ کو کسی درندے نے چیر پھاڑ کر کھا لیا ہے۔ دوسری طرف مصر میں یوسفؑ کی قسمت نے یاوری کی اور وہ ترقی کرتے کرتے عزیز مصر بن گئے۔ عبرانی بائیبل سے پتہ چلتا ہے کہ اگرچہ اس ترقی کی راہ میں بہت سی مشکلات بھی آئیں لیکن خدا ان کا مددگار بنا۔ بعد میں انہوں نے اپنے بھائیوں کو معاف کر دیا اور اپنے والد سمیت انہیں بھی مصر بلا لیا۔ یوسفؑ کی وفات بھی مصر ہی میں ہوئی۔ آپ کی وفات کے بعد عبرانی مصر ہی میں قیام پذیر رہے۔ یہی وہ دور تھا جب خانہ بدوش عبرانی ترقی کرتے کرتے ایک قوم کی حیثیت سے ابھر رہے تھے۔ ان اولین عبرانیوں کو یہودی قوم کی ابتدا مانا جاتا ہے۔

مشقی سوالات

مختصر سوالات

1. لفظ یہودی کے معنی کیا ہیں؟
2. یہودیوں کو پہلے کس نام سے پکارا گیا تھا؟
3. ابراہیمؑ کو عبرانی کیوں کہا جاتا تھا؟
4. اسرائیلی کسے کہتے ہیں؟
5. دو یہودی ریاستیں کون سی تھیں؟
6. پیدائشی یہودی کون ہوتا ہے؟
7. نسلی امتیاز یہودیوں کے لیے باعث اطمینان کیسے ہے؟
8. ربیائی یہودیت میں زیادہ توجہ کس طرف رہی ہے؟
9. ملحد یہودی کون ہے؟
10. ممزیر کسے کہتے ہے؟
11. موسیٰ ابن میمون کون تھے؟
12. یہودیت میں مینیم کسے کہتے ہیں؟
13. قانونِ واپسی کیا ہے؟
14. یہودیوں کا جدِ امجد کون ہے؟
15. ابراہیمؑ نے کن علاقوں کے سفر کیے؟
16. قانونِ واپسی یہودی کسے کہتا ہے؟
17. ابراہیمؑ کے والد کون تھے؟
18. سارہؓ اور ہاجرہؓ کون تھیں؟
19. عبرانی بائیبل کے مطابق اسماعیلؑ کو خدا
20. عبرانی بائیبل کے مطابق اسحاقؑ کو خدا

نے کن برکات سے نوازا؟

نے کن برکات سے نواز ؟

21. یہودیوں کے مطابق خدا نے اپنا عہد کس کے ذریعے جاری رکھا؟

22. کوہ سینا پر خدا نے یہودیوں سے کیا عہد لیا؟

23. بزرگوں کے دور سے کیا مراد ہے؟

24. اسحاقؑ کون تھے؟

25. یعقوبؑ کون تھے؟

26. عہد نوحؑ کیا ہے؟

یوسفؑ کے بھائی ان سے کیوں حسد کرنے لگے؟

تفصیلی سوالات

1. یہودی کون ہے، تفصیلی بحث کریں۔

2. یہودیت کی ابتدا پر نوٹ لکھیں۔

3. ملحد یہودی کون ہے اور مختلف یہودی فرقے اسے کیا مقام دیتے ہیں۔

4. کیا یہودیت بطور مذہب قبول کی جا سکتی ہے؟ تفصیلی بحث کریں۔

5. یہودیوں کے ہاں عہد خداوندی کی اہمیت پر نوٹ لکھیں۔

6. یہودیت میں بزرگوں کا دور تفصیلاً بیان کریں۔

حوالہ جات

[1] پیدائش 13:1

[2] پیدائش 28:32

[3] B. Yebamoth 17a

[4] یرمیاہ 11:16

[5] Pesikta D'Rav Kahanna 15.5

[6] Moshe Halbertal, *Maimonides: Life and Thought* (New Jersey: Princeton University Press, 2015), 135.

[7] B. Sanhedrin 38b

[8] Dan Cohn-Sherbok, *Judaism: History, Belief and Practice* (London: Routledge, 2003), 572.

[9]احبار 34:19
[10]استثناء 21:11-13

[11]Cohn-Sherbok, *Judaism: History, Belief and Practice*, 573.
[12] Yebamot XLVII

[13]متی 23:15
[14]Lavinia Cohn-Sherbok and Dan Cohn-Sherbok, *A Short History of Judaism* (Oxford: Oneworld, 1994), 51.
[15]Solomon Grayzel, *A History of the Jews: From the Destruction of Judah in 586 BC to the Present Arab Israeli Conflict* (New York: The Jewish Publication Society of America, 1968), 225.
[16] Dan Cohn-Sherbok, *Judaism* (London: Routledge, 1999), 28.
[17]B. Keritot 8b
[18] Nicholas de Lange, *An Introduction to Judaism* (Cambridge: Cambridge University Press, 2004), 3.
[19]https: //mfa.gov.il/mfa/mfa-archive/1950-1959/pages/law%20of%20return%205710-1950.aspx, accessed on 13 March 2021.
[20] https: //www.haaretz.com/israel-news/.premium-israeli-rabbinate-accused-of-using-dna-testing-to-prove-jewishness-1.6902132, accessed on 13 March 2021.
[21] https: //www.haaretz.com/israel-news/.premium-most-israelis-don-t-want-the-rabbinate-deciding-for-them-who-is-a-jew-1.7332605, accessed on 13 March 2021.

[22]استثناء 26:5
[23]Charles L. Cohen, *The Abrahamic Religions: A Very Short Introduction* (New York: Oxford University Press, 2020), 11.
[24]پیدائش 12:1-3
[25]پیدائش 10:17-4
[26]پیدائش 9:7
[27]پیدائش 37:9

دوسرا باب: موسیٰؑ سے ربیوں تک

دورِ خروج

عبرانی بائیبل سے پتہ چلتاہے کہ عبرانی قوم جب مصر میں آباد تھی تو ان کی تعداد میں کافی اضافہ ہو گیا جس پر مصر کا بادشاہ فکر مند ہوا۔اس نے اپنے سپاہیوں کو حکم دیا کہ ہر نئے پیدا ہونے والے عبرانی لڑکے کو قتل کر دیا جائے تاکہ ان کی تعداد نہ بڑھ سکے۔عبرانیوں کا چار سو سال فرعونوں کی غلامی میں رہنے کے بعد مصر سے نکل کر کنعان جانا خروج کہلاتا ہے۔ یہ دور تقریباً 1275-1250 قبل مسیح پر محیط ہے۔توریت کی دوسری کتاب بھی اسی نسبت سے "خروج" کہلاتی ہے۔

باب دوم کے اہم نکات

1. عہد خروج میں عبرانیوں کی حالت۔
2. قاضیوں کے دور کی اہمیت۔
3. داؤدؑ و سلیمانؑ کے ادوار۔
4. متحدہ بنی اسرائیل کی تقسیم۔
5. شمالی و جنوبی ریاست کی تباہی۔
6. جلاوطنی میں گزرا بابلی و فارسی دور۔
7. ہیکل کی تعمیر نو۔
8. یونانی دور میں یہودیوں کے حالات۔
9. مکابیوں کی مختصر حکومت۔
10. رومی دور اور مسیحیت کا عروج۔
11. تلمود کی تشکیل۔
12. بابل میں ربیائی یہودیت کا استحکام۔

موسیٰؑ اور بنی اسرائیل کی تشکیل نو

رمسیس/رعمسیس/رامسیس/ریمیس دوم (1290–1224 ق۔ م) کے دور تک یہی روایت چلی آتی رہی کہ اسرائیلیوں کے بیٹوں کو قتل کر دیا جاتا اور ان کی بیٹیوں کو زندہ چھوڑ دیا جاتا تاکہ وہ مصریوں کی باندیاں بنیں۔بنی اسرائیل میں عمرام/عمران اور یوکابد نامی میاں بیوی رہا کرتے تھے جن کے ہاں موسیٰؑ (1300-1271 ق۔ م) کی پیدائش ہوئی جو بعد میں اپنی قوم کے نجات دہندہ بنے۔توریت کے بیان کے مطابق تین ماہ تک ان کی والدہ یوکابد نے ان کو چھپا کر رکھا تاکہ فرعون کے سپاہی ان کے بچے کو قتل نہ کر دیں۔وہ خوف میں مبتلا رہنے لگیں اور پھر ایک دن دل پر پتھر رکھ کر انہوں نے ایک ٹوکری میں اپنے لخت جگر کو ڈالا اور دریائے نیل کے حوالے کر دیا۔ اس ٹوکری کو فرعون کی بیٹی نے اٹھالیا۔موسیٰؑ کی پرورش فرعون کے محل ہی میں ہوئی۔عبرانیوں پر فرعون کے مظالم دیکھ کر موسیٰؑ نے اس کو روکنے کی کوششیں کیں جو رنگ نہ لا سکیں۔

سینا/حورب نامی پہاڑ پر خدا سے موسیٰؑ کی پہلی ملاقات ہوئی۔انہیں ایک جھاڑی میں آگ نظر آئی جب وہ اسے دیکھنے لیے آگے بڑھے تو خدا نے انہیں پکارا اور بتایا کہ اپنے لوگوں کو پریشانیوں سے نکالنے کے لیے انہیں چنا گیا ہے۔[1] اسی وقت خدا نے انہیں اپنا نام "یہوہ" بتایا اور معجزے عطا کیے۔ موسیٰؑ اپنے بھائی ہارونؑ کے ساتھ فرعون کے دربار میں گئے اور اسے بتایا کہ خدا چاہتا ہے کہ عبرانیوں کو غلامی سے آزادی دی جائے تاکہ وہ کنعان جاسکیں۔فرعون نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا۔اس پر دس وبائیں نازل ہوئیں۔خدا نے اسرائیلیوں کی اولادوں کو ان وباؤں سے محفوظ رکھا اور قربانی کا حکم دیا۔ آخری وبا کے بعد فرعون نے انہیں خروج کی اجازت دی لیکن ابھی وہ راستے ہی میں تھے کہ اس نے فیصلہ بدل لیا اور انہیں سزا دینے کے لیے لشکر سمیت نکلا لیکن دریا برد ہوا۔

ارضِ موعود

بنی اسرائیل سے خدا کے عہد	
1. عہد نوح	2. عہد ابراہیمی
3. عہد موسوی	4. عہد کاہنت
5. عہد داؤدی	

ارضِ موعود سے مراد وہ سرزمین ہے جس کو دینے کا خدا نے بنی اسرائیل سے وعدہ کیا تھا۔بنی اسرائیلی اسی سرزمین کے حصول کے لیے موسیٰؑ کے ساتھ مصر سے نکلے تھے۔کوہ سینا پر خدا اور ان کے درمیان ابراہیمؑ سے کیے گئے عہد کی تجدید ہوئی جس کے مطابق انہیں خدا پر ایمان لانا تھا اور اس کے احکامات کی پیروی کرنی تھی۔یہ عہد جو نہ صرف مذہبی بلکہ سیاسی بھی تھا تمام بنی اسرائیل سے باندھا گیا۔توریت میں مذکور ہے کہ "خداوند اپنا وعدہ کر کے صرف تم لوگوں کے ساتھ ہی معاہدہ نہیں کر رہا ہے۔بلکہ وہ معاہدہ ہم سبھی کے ساتھ کر رہا ہے جو یہاں آج خداوند اپنے خدا کے سامنے کھڑے ہیں لیکن یہ معاہدہ ہماری اُن نسلوں کے لئے بھی ہے جو آج یہاں ہم لوگوں کے ساتھ نہیں ہیں۔"[2] روایات کے مطابق اس وقت ان تمام بنی اسرائیلیوں کی روحیں موجود تھیں جنھوں نے دنیا پر وقت گزارا یا گزاریں گے۔اس نئے عہد کے مطابق بھی خدا نے انہیں رہنے کے لیے زمین دینے کا وعدہ کیا اور زندگی گزارنے کے لیے توریت یعنی "قانون" دیا۔اسی عہد کی روسے بنی اسرائیل کنعان کی سرزمین کو ارضِ موعود کہتے ہیں۔یہ نیا عہد انہوں نے قبول کر لیا اور خوش ہوئے کہ خدا نے توریت دے کر ایک طرح سے اپنے عہد کو ایک آئینی حیثیت

دے دی تھی۔ انہیں واضح طور پر بتادیا گیا تھا کہ اگر وہ خدا کا حکم مانیں گے تو اس کے مقرب بنیں گے۔ انہیں سبت کی پیروی بھی کرنی ہو گی جو ایک طرح سے ان کے درمیان عہد خداوندی کی نشانی ہو گی۔

اسی طرح کا ایک اور عہد خدا نے ہارونؑ کی نسل سے بھی باندھا۔ موسیٰؑ کے ساتھ سفر کے دوران بنی اسرائیلیوں سے مختلف گناہ سرزد ہوئے جن میں شرک اور زنا جیسے کبیرہ گناہ بھی شامل تھے۔ ان گناہوں کی پاداش میں خدا نے ان میں ایک بیماری نازل کی جس سے ان کے ہزاروں لوگ مر گئے۔ یہ بیماری اس وقت ختم ہوئی جب ہارونؑ کے پوتے فینحاس نے ایک گناہ گار اسرائیلی کو قتل کر دیا۔ اس پر خوش ہو کر خدا نے ایک معاہدہ کیا اور کہا" وہ اور اس کے بعد کی نسل میرے ساتھ ایک معاہدہ کرے گی۔ اس کے مطابق وہ ہمیشہ کاہن رہیں گے کیونکہ وہ اپنے خدا کے لئے غیرت مند تھا۔ اس طرح اس نے بنی اسرائیلیوں کے لئے تلافی کی۔"[3]

اسی سفر کے دوران وہ مشہور واقعہ بھی پیش آیا جس کے مطابق موسیٰؑ کی غیر موجودگی میں بنی اسرائیل نے خدا کے ساتھ کیے ہوئے معاہدے کی خلاف ورزی کرتے ہوئے ایک بچھڑے کو معبود بنا لیا جس کی وجہ سے انہیں ارضِ موعود کے حصول کے لیے دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا۔ وہ ایک عرصہ تک صحراؤں میں بھٹکتے رہے۔ بعد ازاں، کنعانیوں کے ساتھ مختلف جنگیں ہوئیں جن میں فتح یاب ہو کر یہ لوگ 1200 یا 1250 قبل مسیح میں شام کے ایک علاقے میں بس گئے۔ یہ جنگیں انہوں نے یشوعؑ/یوشع بن نون کی سربراہی میں لڑیں کیونکہ موسیٰؑ نے انہیں اپنا جانشین مقرر کیا تھا۔ انہیں کی رہنمائی میں بنی اسرائیل دریائے اُردن پار کر کے کنعان آئے تھے۔ انہوں نے اپنی قوم کے لیے بارہا جاسوسی بھی کی[4] اور موسیٰؑ کی زندگی میں ان کے مددگار بھی بنے۔ ان کے نام سے عبرانی بائبل میں ایک کتاب "یشوع" بھی ہے۔ یہ ان کی جاندار تقریریں اور قائدانہ صلاحیتیں ہی تھیں جنہوں نے جنگجو کنعانیوں کو بھی بنی اسرائیل کے سامنے سرنگوں کر دیا۔

قاضیوں کا دور

موسیٰؑ کی وفات کے بعد اسرائیلیوں میں قاضیوں کے دور کی ابتدا ہوتی ہے جو تعداد میں بارہ تھے۔ یہ دور بھی ہنگاموں پر مبنی تھا تاہم مصریوں کی غلامی سے بہت بہتر تھا۔ وہ اپنی مذہبی

رسومات آزادانہ جاری رکھ سکتے تھے۔ البتہ ان میں سیاسی اتحاد نہ تھا۔ وہ بکھرے ہوئے تھے جس کی وجہ سے دشمن ان پر بآسانی حملہ آور ہوتے رہتے تھے۔ اس دور کا ایک اہم پہلو یہ بھی تھا کہ در در بھٹکنے والے اسرائیلی اب ایک زرعی قوم بننے لگے تھے۔ قاضیوں نے مختلف وقفوں کے ساتھ تقریباً ایک سو پچاس سال حکومت کی۔ ان میں: عتنی ایل، اہود، شمجر، دبورہ، جدعون، تولع، یائیر، افتاح بن جلعاد، ابصان، ایلون، عبدون اور سمسون شامل ہیں۔ انہیں کی نسبت سے بنی اسرائیل کا یہ دور قاضیوں کا دور کہلایا۔

قاضی کا انتخاب

قاضی کا انتخاب ایسے کیا جاتا تھا کہ ایک ایسے فرد کو چن لیا جاتا جو مذہب سے واقف اور اسرارِ سلطنت سے آگاہ ہوتا۔ عبرانی بائیبل کے مطابق اس چناؤ میں خدا کی مرضی شامل ہوتی تھی۔ جیسا کہ ذکر ہے: "تب خداوند نے قائدین کو چنا جو کہ قاضی کہلائے۔ ان قاضیوں نے بنی اسرائیلیوں کو اُن دشمنوں سے بچایا جنہوں نے ان کی ملکیت کو ہڑپ لیا تھا۔"[5] یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ان کا انتخاب وقتی ضرورت کے تحت اچانک کیا جاتا تھا۔ بنی اسرائیل جب گناہوں کی دلدل میں دھنسے ہوتے اور قرب و جوار کی اقوام کے عتاب کا شکار ہوتے تو وہ خدا کو پکارتے۔ ان کی پکار پر خدا قاضی مقرر کر دیتا جو ان کی حفاظت کرتے اور امن و امان قائم رکھتے۔

قاضیوں کے دور کی تاریخ

یہ دور کتنا عرصہ جاری رہا اس کے متعلق کوئی یقینی بات نہیں کی جا سکتی۔ عموماً یہ سمجھا جاتا ہے کہ یہ دور چار سو سال پر محیط تھا۔ کچھ محققین اس دورانیے کو ایک سو ساٹھ سال بھی گردانتے ہیں۔[6] ایک نظریہ یہ بھی ہے کہ یہ سوا سو سال (تقریباً 1150–1025 ق۔م) پر مبنی تھا۔ اس اختلاف کی وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ یہ زمانہ اسرائیلیوں کے لیے نسبتاً پُر امن ہونے کے باوجود ہنگامہ خیز تھا۔ خاص طور پر کنعانی آئے دن نئی شورش بپا رکھتے جس سے جنگ و جدل کا سامان پیدا ہو جاتا۔ نتیجتاً قاضیوں کے دور میں مختلف وقفے آتے رہے۔ کبھی کوئی اسرائیلی حاکم بن بیٹھتا تو کبھی کوئی بت پرست قابض ہو جاتا۔ چنانچہ زمانے کے دورانیے کا تعین مؤرخین کے نظریات کے ساتھ مشروط ہے۔

اسرائیلیوں نے اس دور میں بھی اپنی باغیانہ روش برقرار رکھتے ہوئے شرک اور بت پرستی جاری رکھی۔[7] انہوں نے اس بارے میں قاضیوں کی بھی نہ سنی اور کنعانیوں میں مروجہ خداؤں بعل اور عستارت کی عبادت کرنے لگے۔ عبرانی بائبل میں یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ اسرائیلیوں نے اپنی نسل کو داغدار کیا اور غیر عبرانیوں، مثلاً حتیوں اور اموریوں میں بھی شادیاں کرتے رہے۔ اس کے برعکس ایسے لوگ بھی ان میں موجود تھے جنہوں نے سنتِ ابراہیمیؑ کو جاری رکھتے ہوئے قربان گاہیں تعمیر کیں جہاں واحد، لاشریک خدا کی عبادت ہوتی تھی۔[8] اس کے علاوہ عہد موسیؑ کی یادگار، تابوتِ سکینہ بھی ان کے پاس موجود تھا۔ یہودی روایات کے مطابق یہ تابوت خدا کے کہنے پر موسیؑ نے بنوایا تھا اور اس کے اندر پتھر کی دو سلیں رکھی تھیں جن پر احکام عشرہ لکھے ہوئے تھے۔ نیز یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ اس صندوق میں موسیؑ اور ہارونؑ کے دور کے تبرکات بھی تھے۔ اس دور میں ان کی تعداد میں اضافہ ہوا اور ارد گرد کی قومیں ان کی مطیع بن کر ان میں مدغم ہونے لگیں۔

یہودیت کے ابتدائی ادوار

1. بزرگوں کا دور
2. دور خروج
3. قاضیوں کا دور
4. بادشاہوں کا دور

بادشاہوں کا دور

عبرانی بائبل میں تسلسل سے ذکر کیا گیا ہے کہ خدا کی نافرمانیوں کی وجہ سے یہ بڑھتی ہوئی طاقت بھی اسرائیلیوں کے کام نہ آ سکی۔ انہیں اطراف سے ایک یونانی النسل قوم جس کا نام فلسطین تھا، اٹھی اور ان کو جنگ و جدل کے ہر میدان میں شکست سے دوچار کرنے لگی۔ یہ قوم پہاڑی سلسلوں اور بحیرہ روم کے ساحلی حصوں میں موجود زرخیز میدانوں پر قابض تھی۔ بنی اسرائیل اس کا مقابلہ نہ کر سکے اور غلام بنے۔ اس کے بعد ان میں بادشاہوں کا دور شروع ہوتا ہے جو تقریباً 1020 سے 586 قبل مسیح تک ہے۔

ساؤل کا دور

بیس سال بنی اسرائیل نے فلسطینیوں کی غلامی میں گزارے۔ بعد میں سموئیلؑ/شموئیلؑ (تقریباً 1070-1012 ق۔م) کی قائدانہ صلاحیت ان کے کام آئی۔ آپؑ ہی کی رہبری میں

انہوں نے فلسطین کو شکست دی۔ خدا کی طرف سے آپؑ کو ایک عصا اور ایک کھوکھلا سینگ جس میں تیل بھرا ہوا تھا عطا کیا گیا۔ انہیں یہ بتایا گیا کہ جس شخص کے قریب آنے سے اس سینگ میں موجود تیل ابلنے لگے اور عصا کی لمبائی اس شخص کے قد کے برابر ہو تو وہی شخص بنی اسرائیل کا بادشاہ بنے گا۔ بن یامین قبیلے کا ایک فرد جس کا نام ساؤل / طالوت (وفات 1010 ق۔م) تھا اپنے گدھے کو ڈھونڈتے ڈھونڈتے ان کے پاس آنکلا۔ اس کے آتے ہی سینگ میں موجود تیل ابلنے لگا۔ سموئیلؑ نے جب عصا، ساؤل کے جسم کے ساتھ لگایا تو عصا کی لمبائی اور اس کا قد برابر نکلا۔ آپؑ نے سینگ میں موجود تیل اس کے سر پر لگا دیا۔ یہ ایک طرح سے اس کی بادشاہی کا اعلان تھا۔ ساؤل یہودیوں کا پہلا بادشاہ تھا۔ اس کے دور میں اسرائیلی قرب وجوار کی اقوام پر حاکم رہے۔ جب ساؤل نے بھی دیگر اسرائیلیوں کی طرح خدا کی نافرمانی کی تو زوال اس کا مقدر بن گیا۔ سموئیلؑ نے یہ کہتے ہوئے اس کا ساتھ چھوڑ دیا کہ اس کی بادشاہت، خدا نے ختم کر دی ہے۔[9] پس وہ ایک طاقتور سلطنت بنانے سے محروم رہا۔

داؤدؑ کا دور

داؤدؑ (1010–970ق۔م) ایک ماہر فلاخن باز اور سنگ انداز تھے۔ آپ بیت اللحم کے ایک چھوٹے سے قصبے میں پلے بڑھے۔ آپ کے والد کا نام یسی تھا۔ یسی کے تین بیٹے ساؤل کے لشکر میں شامل تھے۔ ایک دفعہ داؤدؑ اپنے بھائیوں کا کھانا لے کر میدان جنگ میں گئے جہاں ایک فلسطینی پہلوان اسرائیلیوں کے لیے دردِ سر بنا ہوا تھا۔ آپؑ اس پہلوان کے مقابلے کے لیے میدان میں اترے اور ایک پتھر تاک کر ایسا مارا کہ وہ پہلوان جان سے گیا۔ آپؑ کے اس معرکہ کو دیکھ کر ساؤل کا بیٹا آپ کا معتقد ہو گیا لیکن ساؤل بذاتِ خود حسد کا شکار ہوا۔ اس نے اعلان کر رکھا تھا کہ جو بھی اس فلسطینی پہلوان کو مارے گا وہ اس کے ساتھ اپنی بیٹی کی شادی کرے گا۔ اب حسدِ داؤدی میں وہ ایسا بدگمان ہوا کہ اپنی بات سے پھر گیا۔ اس نے کئی دفعہ آپ کی جان لینے کی کوشش بھی کی مگر کامیاب نہ ہو سکا۔ عبرانی بائیبل کے مطابق داؤدؑ، ساؤل کو چھوڑ کر سموئیلؑ کے پاس چلے گئے اور خود کو خدمتِ خدا میں وقف کر دیا۔ ساؤل اگرچہ آپؑ کی جان کے درپے تھا لیکن آپؑ نے اس سے دشمنی مول نہ لی۔[10] رفتہ رفتہ آپؑ نے اپنا گروہ ترتیب دیا اور ایک ڈاکو کی سی زندگی بسر کرنے لگے۔

بعد ازاں قوم فلسطین کے ساتھ ایک اور جنگ چھڑی جس میں ساؤل کو شکست ہوئی اور اس کے تین بیٹے اسی جنگ میں کام آئے۔اس کے بعد اسرائیلیوں کو داؤدؑ سے بہتر بادشاہ نہیں مل سکتا تھا کیونکہ ایک تو آپؑ مذہبی رموز سے آشنا تھے اور دوم یہ کہ آپؑ صاحب فراست، بہادر اور بہترین سپہ سالار بھی تھے۔ لوگ بھی آپؑ سے مطمئن تھے اور ساؤل کی زندگی ہی میں آپ کی تعریف گیت گا گا کر کیا کرتے تھے کہ "ساؤل نے ہزار دشمنوں کو مار دیا ہے۔ لیکن داؤد نے دسوں ہزار کو مارا ہے"[11] وہ یہودا قبیلے کے بادشاہ بنے اور جنوبی ریاست پر سات سال چھ ماہ حکومت کی۔ انہوں نے شمالی علاقوں کو بھی رفتہ رفتہ اپنے اندر ضم کر لیا۔ اس میں انہیں تھوڑی بہت مزاحمت کا بھی سامنا کرنا پڑا جو ساؤل کے خاندان اور ہم نواؤں کی جانب سے کی گئی۔

پوری اسرائیلی قوم کا حاکم بننے کے بعد انہوں نے فلسطینیوں کو شکستِ فاش دی اور سلطنت کو وسیع کیا۔ اس سے پہلے کبھی بھی اتنے بڑے رقبے پر اسرائیلیوں کی حکومت قائم نہ ہوئی تھی۔ بحیرہ روم سے مشرقی صحراؤں اور صحرائے سینا سے شمال میں صور تک اور وہاں سے دریائے فرات تک پھیلی یہ سلطنت اپنی وسعت میں اگرچہ لاجواب تو تھی تاہم اس کو سنبھالے رکھنا بھی ایک مسلسل عمل تھا جس کے لیے انہیں متعدد جنگیں لڑنی پڑیں۔ انہوں نے یروشلم کو دارالخلافہ اور انتظامی مرکز بنا دیا۔ غیر ملکی ماہرین کو بلوا کر ایک محل تعمیر کروایا اور قلعہ بندی کی۔ تابوت سکینہ جس میں موسیٰؑ کے دور کی مقدس یادگاریں پڑی تھیں، کو بھی یروشلم ہی منتقل کروا دیا۔ تابوت کچھ عرصہ تک ایک خیمہ میں پڑا رہا۔ بعد میں آپؑ نے سوچا کہ ایک معبد تعمیر کیا جائے جو خدا کا گھر ہو۔ تابوت کو بھی وہیں رکھا جائے۔ آپؑ نے اس سلسلے میں ناتنؑ سے مشورہ کیا۔ انہوں نے پہلے تو آپؑ کے اس فیصلے کا خیر مقدم کیا لیکن بعد میں انہیں خدا کی طرف سے پیغام ملا کہ یہ معبد تعمیر تو ضرور کیا جائے گا لیکن اس کی تعمیر داؤدؑ کے ہاتھوں نہیں ہو گی۔ البتہ خدا نے ان سے عہد کیا کہ "تمہارا بادشاہوں کا خاندان ہمیشہ قائم رہے گا تم اس پر بھروسا کر سکتے ہو تمہارے لئے تمہاری بادشاہت ہمیشہ جاری رہے گی۔ تمہارا تخت ہمیشہ قائم رہے گا۔"[12] اسی عہد کی رو سے بنی اسرائیل یہ سمجھتے ہیں کہ مسیح موعود یعنی یہودیوں کے آخری بادشاہ، داؤدؑ کے خاندان سے ہوں گے۔ عبرانی بائبل میں خدا کی جانب سے کیے گئے عہدوں میں سے اسے چوتھا مشہور عہد سمجھا جاتا ہے۔

سلیمانؑ کا دور

عبرانی بائیبل کے مطابق داؤدؑ نے اپنے ایک سپاہی کی بیوی بت سبع کے ساتھ زبردستی کی اور اس کے خاوند کے قتل کا سامان کیا۔ بعد میں انہوں نے اسی عورت سے شادی کر لی جس سے سلیمانؑ کی پیدائش ہوئی۔ داؤدؑ نے اپنے دیگر بیٹوں کو چھوڑ کر سلیمانؑ کو بادشاہ نامزد کیا۔ آپؑ بھی ایک قابل حکمران تھے جو نہ صرف اسرار ایزدی سے واقف تھے بلکہ امور سلطنت چلانے میں بھی آپؑ کا ہم پلہ اس دور میں کوئی نہ تھا۔ عبرانی بائیبل میں شامل کتب سلاطین سلیمانؑ کے دور کے واقعات بیان کرتی ہیں۔ ان کے مطابق ایک بار جب خواب میں ان کی ملاقات خدا سے ہوئی تو انہوں نے اپنی لیے نہ تو لمبی عمر مانگی اور نہ ہی دولت بلکہ خدا سے فریاد کی کہ انہیں فہم و فراست سے نوازے۔ خدا نے بھی ان کی دعا کو پسند کیا اور علم و حکمت سے نوازا۔[13] اسرائیلیوں کی تاریخ میں آپؑ سے عقلمند شخص نہیں گزرا۔ بعض مصنفین نے عبرانی بائیبل کی ان روایات کی یہ توجیہ بھی کرنے کی کوشش کی ہے کہ آپؑ کی حکمت اس دور میں اٹھنے والی فلسفیانہ تحریک جس نے میسوپوٹیمیا اور مصر میں بڑے بڑے بادشاہوں اور فلسفیوں کو جنم دیا، کی مرہون منت تھی۔[14] وجہ جو بھی رہی ہو آپؑ کو ایک کامیاب بادشاہ سمجھا جاتا ہے جو انسانوں پر ہی نہیں بلکہ حیوانوں پر بھی حاکم تھے۔ اسی وجہ سے انہیں حکیم بھی کہا جاتا تھا۔

آپؑ نے ہیکل الہی کی تعمیر کی جو اس وقت سے اب تک اسرائیلیوں کی مرکزی عبادت گاہ تصور کی جاتی ہے۔ آپؑ نے تعمیرات میں بنی اسرائیل کی بجائے دیگر کنعانی اقوام، مثلاً حتی، اموری، حوی اور یبوسی لوگوں سے کام لیا۔ جب ہیکل کی تعمیر مکمل ہو گئی تو انہوں نے بنی اسرائیل کے تمام قبائل میں سے بزرگوں اور دانشمندوں کو اس کے افتتاح کے لیے جمع کیا۔ لاوی کا قبیلہ جو موسوی دور سے مذہب کے فرائض سرانجام دینے کے لیے مقرر تھا تقریباً تمام کا تمام جمع ہو گیا۔ ہیکل کے اندر ایک جگہ حرم الحرم تھی۔ یہ ہیکل کی سب سے مقدس جگہ تھی۔ اس کی تعمیر بھی خصوصیت کے ساتھ کی گئی تھی کیونکہ وہاں تابوت سکینہ رکھا جانا تھا۔ یہاں عبرانی بائیبل ایک مذہبی تجربے کے متعلق معلومات دیتی ہے کہ جب بنی لاوی تابوت کو اندر رکھ کر آ رہے تھے تو آسمان سے ایک ابر اترا جس میں سفیدی نمایاں ہونے لگی۔ رفتہ رفتہ اس سفیدی میں ایسی چمک پیدا ہوئی کہ ساری قوم ہیبت زدہ ہو کر سجدہ ریز ہو گئی۔ اس دن سے اسرائیلیوں کے لیے یہ

عمارت دنیا میں مقدس ترین جگہ بن گئی جس کی حفاظت کے لیے لاکھوں انسانوں نے اپنا خون بہایا، جس کی شان بڑھانے کے لیے کروڑوں خرچ کیے گئے اور جس کی تعظیم برقرار رکھنے کے لیے ان گنت جانور ذبح کر دیے گئے۔ آپؑ نے صرف معبدِ الٰہی کی تعمیر پر اکتفا نہیں کیا بلکہ یروشلم کے ارد گرد چہار دیواری بھی تعمیر کروائی اور اپنے لیے ایک شاندار محل بھی بنوایا۔ اس کے علاوہ کئی شہر بھی آپؑ کے دور میں تعمیر ہوئے۔ اس وجہ سے آپؑ کے دور کو تعمیرات کا دور کہا جاسکتا ہے۔

متحدہ اسرائیل کی تقسیم

آپؑ کی زندگی میں بنی اسرائیل کے تمام قبائل متحد رہے۔ آپؑ اپنی حکمت سے ان کو قابو میں رکھے ہوئے تھے۔ آپؑ دیگر اقوام سے بھی اپنی مرضی کے کام کرواتے رہے۔ اپنا تسلط جمائے رکھنے کے لیے آپؑ نے غیر اقوام میں شادیاں بھی کیں۔ ان میں مصری، موآبی، عمونی، ادومی، صیدانی اور حتی عورتیں شامل تھیں۔ عبرانی بائیبل کی روایات کے مطابق آپؑ کی 700 بیویاں اور 300 باندیاں تھیں۔ ایک طرف تو آپؑ کی ان شادیوں نے آپؑ کی حکومت کو قائم رکھنے میں مدد کی اور دوسری طرف یہی شادیاں خدا سے ان کی دوری کا سبب بھی بنیں۔ ان بیویوں نے آپؑ کا دل خدا کی طرف سے پھیر کر دیگر دیوتاؤں کی عبادت کی طرف لگادیا اور آپؑ "صیدانیوں کی دیوی عستارات اور عمونیوں کے دیوتا ملکوم کی عبادت کرنے لگے۔"[15] آپؑ نے دیگر دیوتاؤں کے معبد بھی تعمیر کیے جس پر خدا آپؑ سے ناراض ہوا اور متنبہ کیا کہ اب حکومت ان کی اولاد سے لے لی جائے گی کیونکہ انہوں نے خدا سے کیے ہوئے عہد کو نبھایا نہیں۔ آپؑ چالیس برس حکومت کر کے تقریباً 922 ق۔م میں دنیا سے رخصت ہوئے اور آپؑ کا بیٹا رحبعام (عہد 922-915 ق۔م) تخت نشین ہوا۔

شمالی ریاست کی علیحدگی

یہودی روایات کے مطابق آپؑ نے شمالی قبائل پر جنوبی قبائل کی نسبت زیادہ بوجھ ڈالا تھا لہذا آپؑ کی وفات کے بعد انہوں نے بغاوت کرتے ہوئے علیحدہ ریاست قائم کرلی۔ اس طرح متحدہ بنی اسرائیل دو ریاستوں میں بٹ گیا: شمالی اور جنوبی ریاست۔ شمالی ریاست کو اسرائیل، سامریہ اور افرائیم کہا گیا اور جنوبی ریاست یہودا کہلائی۔ شمالی ریاست تعداد اور وسعت کے لحاظ

سے جنوبی ریاست سے بڑی تھی۔ اول الذکر کا رقبہ تقریباً 9000 مربع میل تھا اور کل نفوس کی تعداد پچاس لاکھ کے لگ بھگ تھی جبکہ دس لاکھ نفوس پر مبنی ثانی الذکر ریاست کا رقبہ 3400 مربع میل تھا۔[16] تاہم یہ تاریخ کی عجب ستم ظریفی ہے کہ تعداد اور وسعت کے اعتبار سے طاقتور شمالی ریاست کا زوال جنوبی ریاست سے 130 برس پہلے 721 قبل مسیح ہی میں ہو گیا۔ یربعام اول (عہد 930-910 ق۔م) شمالی ریاست کا حکمران بنا اور سکم کو شمالی ریاست کا دار الخلافہ بنایا۔ اس وقت مصر پر فرعون شیشنق اول (عہد 945-924 ق۔م) کی حکومت تھی۔ اس نے شمالی ریاست پر حملہ کر کے اس کو اپنا باج گزار بنالیا۔ سو سالہ اتحاد ریاستوں کے الگ ہونے سے پاش پاش ہو گیا۔ یربعام کے بعد اس کے بیٹے ناداب (عہد 909-910 ق۔م) کی ایک سالہ حکومت آئی جس کے بعد بعشا (عہد 909-886 ق۔م) حکمران بنا اور یربعام کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے بت پرستی کو فروغ دیا۔ یوں شمالی ریاست نے انیس بادشاہوں کا دور دیکھا لیکن کسی کو بھی سلیمانؑ جیسا دوام نہ مل سکا۔ ان بادشاہوں نے بھی اپنے باپ دادا کی غلطیوں کو دوہرایا اور خدا سے کیا ہوا عہد پورا نہ کیا۔

شمالی ریاست کی تباہی

بنی اسرائیل کی شمالی و جنوبی دونوں ریاستیں نینوا اور مصر کے درمیان واقع تھیں۔ آل یعقوبؑ، اشوریوں کو خراج دیا کرتے تھے تاکہ ان کی سلطنت قائم رہ سکے۔ اگرچہ اسرائیلی بادشاہوں نے خود کو فراعنہ مصر کی دامادی میں دے کر ان کی ہم نوائی حاصل کر لی تھی لیکن وہ نینوا میں بڑھتی ہوئی اشوری/آشوری/اسیری طاقت کا صحیح ادراک نہ کر پائے۔ اس سے پہلے اسرائیلی قوم نے کمزور ریاستوں کے خلاف جنگیں لڑی تھیں لیکن اس بار مقابلہ ایک زبردست دشمن سے تھا۔ خراج دے کر اپنی حکومت جاری رکھنے کی بجائے انہوں نے اہلِ دمشق کے ساتھ مل کر اشوریا پر حملہ کر دیا۔ یہ حملہ شمالی ریاست کے لیے تباہ کن ثابت ہوا۔ ابتدا میں چند نقصانات اٹھانے کے بعد اشوریوں نے شمالی ریاست پر قبضہ کر لیا۔ یہاں اپنی پسند کا حاکم مقرر کیا اور بہت سے اسرائیلیوں کو قیدی بنا کر ساتھ لے گئے۔ یہودی تاریخ میں اسے "اسرائیلیوں کی پہلی غلامی" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اسرائیلیوں نے مصریوں سے گٹھ جوڑ کرنا چاہا تاکہ اشوریوں کی غلامی کا طوق گردن سے اتار پھینکیں۔ اس وقت شالمانیسر پنجم (عہد 727-722 ق۔م) اشوریوں کا

بادشاہ تھا۔اس نے ایک اور زبردست حملہ کیااور غصے میں شمالی ریاست کو تباہ و برباد کر کے رکھ دیا۔اس کے جانشین سارگون/سرگون دوم (عہد 722-705ق۔م) کی تواریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ کل 27،290 اسرائیلیوں کواس وقت اسیر کیا گیااور دور دراز کے علاقوں میں بسادیا گیا۔[17] جو بچے وہ جان بچا کر مختلف علاقوں میں بھاگ گئے۔تاریخ میں یہ "اسرائیلیوں کی دوسری غلامی" کہلاتی ہے۔ عموسؑ نے اسرائیل کی عہد شکنی اور اخلاقی گراوٹ دیکھ کر بہت پہلے ان کو اس انجام کی خبر دے دی تھی۔اپنے انجام سے بے خبر انہوں نے آپؑ کی باتوں پر کان نہ دھرا اور دردناک انجام سے دوچار ہوئے۔یہیں سے اسرائیل کے دس گمشدہ قبائل کا تصور پیدا ہوا۔دس گمشدہ قبائل سے مراد شمالی ریاست کے قبائل ہیں جنہیں اشوریوں نے دور دراز علاقوں میں جا کر بسادیا تھا۔روایات کے مطابق ایک وقت ایسا آئے گا جب خدا ان میں ایک نجات دہندہ پیدا کرے گا جو "مسیح موعود" کہلائے گا۔اسی دور میں گمشدہ قبائل بھی دوبارہ اکٹھے ہوں گے۔

جنوبی ریاست و ہیکل الٰہی کی تباہی

شمالی ریاست کے برعکس جس کے باسی اسرائیلی کہلاتے تھے جنوبی ریاست کے باسی یہودا قبیلے کی نسبت سے یہودی کہلائے۔ جنوبی ریاست پر حکمرانوں کی بیس نسلوں نے حکومت کی۔اسی دوران اخلاقی طور پر وہ زوال کا شکار ہوتے رہے اور ایک وقت ایسا آیا کہ باوجود انبیا کی تلقین کے انہوں نے خدا سے کیے ہوئے عہد کی پاسداری چھوڑ دی۔البتہ قسمت نے یہاں پھر ان سے یاوری کی۔ بادشاہ یوسیاہ/یوشع (عہد 640-609ق۔م) کے دور میں توریت کی ایک گمشدہ کتاب جو غالباً کتاب استثنا تھی ہیکل کے امامِ اعظم کو مل جاتی ہے جسے وہ بادشاہ کو بھجوادیتا ہے۔اس کتاب کے ملنے سے یروشلم کی قدر ومنزلت دوبارہ قائم ہو جاتی ہے اور یہ اعلان کر دیا جاتا ہے کہ ہیکل سلیمانی کے علاوہ کہیں بھی قربانی دینا جائز نہ ہو گی۔اس نے ریاست میں موجود دیگر معبدوں کو تباہ کروادیا اور ان کے پجاریوں کو سزائے موت دے دی۔ عبرانی بائبل کے مطابق "نہ یوسیاہ سے پہلے، نہ اس کے بعد اس جیسا کوئی بادشاہ آیا جس نے اس طرح پورے دل، پوری جان اور پوری طاقت کے ساتھ رب کے پاس واپس آکر موسوی شریعت کے ہر فرمان کے مطابق زندگی گزاری ہو۔"[18] یوسیاہ کے بعد آنے والے بادشاہوں کے ادوار میں خدا کے احکامات سے روگردانی دوبارہ شروع ہو گئی۔ عبرانی بائبل کے مطابق یہی روگردانی جنوبی

ریاست کے تابوت میں لگنے والی آخری کیل ثابت ہوئی اور ان کا زوال شروع ہو گیا۔

اس دور میں بابل میں قائم ہونے والی کلدانیوں کی حکومت اپنی طاقت کا لوہا منوا رہی تھی۔ نبوکدنضر / نبوخذ نصر /بخت نصر (عہد 605-562 ق۔م) کے دور میں اہل بابل نے اشوریا والوں کو شکست دے کر ایک طاقتور سلطنت قائم کی۔ دیگر چھوٹی ریاستوں کی طرح یہودا کی ریاست بھی ان کے سامنے کوئی وقعت نہ رکھتی تھی لہذا، انہوں نے بھی خراج دینے کا وعدہ کر کے جان بچائی۔ لیکن یہ زبانی وعدہ ہی رہا کیونکہ اہلِ مصر کے ڈر سے وہ یہ خراج ادا نہ کر سکے۔ اپنے پہلے حملے میں نبوکدنضر نے صرف لوٹ مار پر ہی اکتفا کیا اور اطاعت کا عہد لے کر واپس چلا گیا۔ چار سال بعد یہودیوں کو ایک دفعہ پھر آزادی کا خیال آیا۔ فرعونِ مصر نے ان کی مدد کا وعدہ کیا تو خوش خیالی اور پختہ ہو گئی اور انہوں نے اعلانیہ بغاوت کی۔ صدقیا(عہد 597-586ق۔م)جو یہودا کا آخری بادشاہ تھا کو یرمیاہؑ نے پہلے ہی خبر دے دی تھی کہ اہل یہودا شاہِ بابل کے اسیر ہوں گے۔ ہوا بھی ایسا ہی۔ مصر کی افواج نبوکدنضر کا مقابلہ کرنے میں ناکام ہوئیں اور اس نے یروشلم کے مضبوط قلعے کا محاصرہ کر لیا جو اٹھارہ مہینے جاری رہا۔ اس محاصرے سے ایسا قحط پیدا ہوا کہ جنوبی ریاست کے باسی ایک ایک دانے کو ترس گئے۔ بھوک سے تنگ آئے لوگوں نے بچے بھون بھون کر کھائے۔[19] قلعہ فتح ہوا اور یروشلم کی مقدس سرزمین معصوموں کے خون سے نہا گئی۔ غصے میں بپھرے ہوئے بابلی لشکر نے 586 قبل مسیح میں ہیکل الٰہی کو تباہ کر کے زمین کے برابر کر دیا۔ تمام مال و اسباب لوٹ لیا گیا۔ بنی اسرائیل قیدی بنا کر بابل لے جائے گئے۔ صرف چند لوگ پیچھے چھوڑے گئے تاکہ وہ باغات اور اراضی کی دیکھ بھال کریں۔ یہودی تاریخ میں اسے "ہیکل کی پہلی تباہی" کا نام دیا جاتا ہے۔ اس دور کے خاتمے کے ساتھ ہی یہودی تاریخ میں ایک دفعہ بادشاہوں کا دور ختم ہو جاتا ہے۔ یہودی کیلنڈر کے مطابق یہ سال کا پہلا دن "تیشا بآو" تھا۔ یہودی ہر سال اس دن کے سوگ میں روزہ رکھتے ہیں اور خدا سے گناہوں کی معافی مانگتے ہیں۔

جلاوطنی کا زمانہ

جب سلطنت ہی نہ رہی تو شمالی اور جنوبی ریاست کی تباہی کے ساتھ ہی اسرائیلی اور یہودی کا فرق ختم ہوتا چلا گیا۔ آلِ یعقوبؑ یا تو دوسروں کی اسیر ہوئی یا جلاوطن ہو کر دنیا کے مختلف گوشوں میں جا بسی۔ پہلے وہ اہلِ بابل کی غلام بنی اور پھر اہلِ فارس کی۔ جلاوطنی کا یہ دور تقریباً

587سے 516 قبل مسیح تک گردانا جاتا ہے۔

بابلی دور

یہودیوں کی گذشتہ تاریخ اس بات کی عکاس ہے کہ جب بھی وہ غلامی میں تھے انہوں نے اپنے خدا کو یاد رکھا اور جب ان کو دنیا پر کچھ آسانی نصیب ہوئی انہوں نے خدائے واحد کی بجائے دیگر دیوی دیوتاؤں سے ناطہ جوڑ لیا۔ بابلی دور میں بھی انہوں نے مذہب پر خصوصی توجہ دی۔ اگرچہ وہ پابندیوں میں گھرے ہوئے تھے تاہم کچھ ایسی عبادات بھی تھیں جو وہ آسانی سے سر انجام دے سکتے تھے، مثلاً روزہ اور سبت کی پیروی وغیرہ۔ یہی وجہ ہے کہ یہودیوں کی تاریخ کے اس دور میں روزے اور سبت کو خصوصی اہمیت حاصل رہی ہے۔ حزقی ایلؑ/ذوالکفلؑ (622-570 ق۔م) وہ پہلے آدمی تھے جنہوں نے سبت پر خصوصی توجہ دی۔ اُس وقت سے احترامِ سبت کی اہمیت یہودیوں کے ہاں بہت زیادہ بڑھ گئی۔[20] شاید اس پر کچھ اثر بابلیوں کا بھی رہا ہو جن کے نزدیک ہفتے کا ساتواں دن روح کے آرام کا دن تھا۔

اس دور میں یرمیاہؑ ان سے دور ہوتے ہوئے بھی انہیں ہدایات دیتے رہے۔ یروشلم سے لکھے گئے اپنے ایک خط میں انہوں نے یہودیوں کو مشورہ دیا کہ وہ بابل میں مایوسی کی بجائے خوشحالی کی زندگی بسر کرنے کی کوشش کریں، شادیاں کریں، باغات لگائیں اور ان کے پھل کھائیں تا کہ ان کی تعداد گھٹنے کی بجائے بڑھے۔ مزید انہوں نے بنی اسرائیل کو منع کیا کہ بغاوتوں کا خیال دل میں نہ لائیں تا کہ حکمرانوں کے عتاب سے بچے رہیں۔[21] بابل کی جلاوطنی کے شروع ہی میں زیادہ تر یہودیوں نے ان کی اس تجویز کو اپنا لیا۔ اس تجویز کو اپنانے کا فائدہ یہ ہوا کہ انہوں نے بہت جلد اپنی چھوٹی چھوٹی آبادیاں قائم کر لیں، معاشی خوشحالی نے ان کی راہ دیکھ لی اور انہیں سلطنت میں عہدے ملنے لگے۔

دانی ایل/دانیالؑ کو بھی قیدی بنا کر بابل لے جایا گیا تھا جہاں ان کی حکمت اور دانشمندی سے متاثر ہو کر انہیں بادشاہ کے خادمِ خصوصی ہونے کا درجہ دیا گیا۔ بعد میں انہوں نے بادشاہ کے ایک خواب کی تعبیر بتائی جس کے مطابق جلد ہی اس کی سلطنت کا زوال ہو جانا تھا۔ یہ تعبیر ایسی درست تھی کہ بادشاہ نے انعام کے طور پر انہیں بابل کے ایک صوبے کا حکمران بنا دیا۔[22] خود بادشاہ نے اس تنبیہ سے سبق حاصل کرنے کی بجائے اپنا ایک بت بنوایا اور اسرائیلیوں سمیت

سب رعایا کو اس کی عبادت کا حکم دیا۔ بادشاہ ایک اور خواب دیکھتا ہے جس کی تعبیر کے لیے ایک دفعہ پھر دانی ایلؑ کو بلایا جاتا ہے۔ وہ اسے بتاتے ہیں کہ اس سے بادشاہت چھین لی جائے گی اور وہ جانوروں کی سی زندگی بسر کرے گا۔ اسی طرح جب نبوکدنضر کے بعد بیلشفر (وفات 539ق۔م) حکمران ہوتا ہے تو اس کے سامنے غیب سے چند سطریں ایک دیوار پر ابھر آتی ہیں جن کو بابل میں سوائے دانیالؑ کے اور کوئی نہیں پڑھ پاتا۔ اس نوشتہ دیوار کو پڑھ کر انہوں نے بیلشفر کو خبر دی کہ اس کا زوال قریب ہے اور اس کی سلطنت دو حصوں میں بانٹ دی جائے گی۔ اس طرح اپنی اس دانشمندی سے انہوں نے اہلِ بابل کو بہت متاثر کیا جس کے انعام کے طور پر انہیں ریاست کا تیسرا بڑا حکمران بنادیا گیا۔

فارسی دور

دانی ایلؑ کی بات بہت جلد پوری ہو گئی اور سلطنتِ بابل کا زوال شروع ہو گیا۔ ہخامنشی سلطنت/سلطنت فارس کے فرمانروا سائرس/کورش/خورس اعظم (عہد 559-530ق۔م) نے 539 قبل مسیح میں شاہِ بابل کا تختہ الٹ دیا۔ اس طرح یہودی مال غنیمت کی طرح فارسیوں کے اسیر ہوئے۔ سائرس ایک جری جرنیل اور بلا کا ذہین شخص تھا۔ اس نے سلطنت پر اپنی گرفت بنائے رکھنے کے لیے ایک نئی پالیسی تشکیل دی جس کے تحت مقامی آبادیوں کی تہذیب و ثقافت کی حفاظت پر زور دیا گیا۔ یہ پالیسی یہودیوں کے لیے فائدہ مند تھی۔ بابلی دور میں ملی مراعات اور سائرس کے مخلصانہ رویہ نے ان کا دل اس سرزمین میں لگا دیا۔ عبرانی بائیبل نے جس طرح سائرس کو پیش کیا ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ خود بھی یہودیوں کے مذہبی رجحانات سے متاثر تھا۔[23] اس کی یہودیوں سے خوش اخلاقی کی وجہ سے عبرانی بائیبل نے اسے بہت توقیر سے نوازا ہے۔ بار بار اس کا ذکر اچھے الفاظ میں کیا گیا ہے۔ سائرس وہ واحد غیر یہودی ہے جس کو عبرانی بائیبل مسیحا کا درجہ دیتی ہے۔[24] سائرس نے نہ صرف یہودیوں کو واپسی کی اجازت دی بلکہ یہ حکم نامہ بھی جاری کیا کہ ہیکل سے لوٹی ہوئی تمام دولت یہودیوں کو واپس دے دی جائے۔ سرکاری خزانے سے ہیکل کی تعمیر کے لیے رقم فراہم کی گئی۔ اس نے لوگوں سے یہودیوں کی رضاکارانہ مدد کی بھی اپیل کی جس پر لوگوں نے بھی بھرپور معاونت کی۔ یہ بھی اعلان کروادیا گیا کہ اس رقم پر کسی قسم کا محصول نہیں لیا جائے گا۔

بابلی اور فارسی دور کے اثرات

اس دور کے یہودیوں پر بابلی مذاہب کے برعکس فارسی مذہب کا اثر زیادہ نظر آتا ہے۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ دونوں مذاہب کی تعلیمات میں بہت سی چیزیں مشترک تھیں، مثلاً یہودیوں ہی کی طرح فارسی بھی ایک خدا کی عبادت کے قائل تھے۔ دونوں مذاہب میں انبیا کا تصور موجود تھا اور دونوں شرک کے خلاف تھے۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ یہودی فارسیوں کو اچھے لوگ سمجھتے تھے۔ سائرس کے رویے نے ان کے دل نرم کر دیے تھے اور وہ فارسی تہذیب و ثقافت کو اپنانے لگے تھے۔ شاہانِ بابل نے زبردستی اپنا مذہب یہودیوں پر لاگو کرنا چاہا تھا جس میں وہ ناکام ہوئے۔ اہلِ فارس کی نرم دلی یہودیوں کو ان کے قریب لانے کا سبب بنی۔ اس کا اثر اتنا گہرا تھا کہ عبرانی بائیبل نے بھی سائرس کی تعریف کی اور اس کی ایک ایسی شبیہ یہودیوں کے سامنے پیش کی کہ وہ بھی یہوہ کا ماننے والا نظر آتا ہے۔

بعض محققین کے نزدیک یہودیوں میں تصورِ آخرت اور اس سے متعلق مسائل پر زرتشتیوں کا اثر رہا ہے جس کے نتیجے میں یہودیوں کی ایک بڑی جماعت حیات بعد الموت کے عقیدے کی طرف آنے لگی اور ان میں تصورِ آخرت کے متعلق بحثیں ہونے لگیں۔ اسی طرح ان کا شیطان کے متعلق عقیدہ پختہ ہوا اور وہ فرشتوں پر بھی یقین رکھنے لگے۔ خدا اور انسان میں جو براہ راست تعلق تھا وہ اب فرشتوں کے ذریعے بیان کیا جانے لگا۔ اسی دور کی ایک اور یادگار یہودی عبادت گاہیں تھیں جو بابل کے طول و عرض پر بننے لگیں۔ اس وقت تک یہودی مختلف فقہی فرقوں میں بٹ چکے تھے جن میں صدوقیوں اور فریسیوں کو خصوصی اہمیت حاصل تھی۔ فریسی رجعت پسند تھے اور شرعی دلائل کے سوا کسی چیز کو بطور ثبوت تسلیم نہیں کرتے تھے۔ صدوقیوں کے ہاں عقل پسندی نے رواج پایا اور یہ لوگ تاویل کے قائل بن گئے۔ ان میں تصورِ آخرت اور اس سے متعلق بحثوں نے بھی کم رواج پایا اور یہ لوگ حیات بعد الموت کا انکار کرنے لگے۔[25]

جلاوطنی کے بعد کا زمانہ

سائرس کا یہودیوں کو آزادی دینا یرمیاہؑ کی پیشن گوئی کے مطابق تھا۔ یہودیوں کی وہ نسل

جو غلام بنا کر لائی گئی تھی وہ اس دنیا سے رخصت ہو چکی تھی۔ مذہبی حالت یہ تھی کہ توریت تک ان لوگوں کے پاس نہ تھی۔ نئی نسل کے سب لوگ فارسی سلطنت کو الوداع کہنے کو تیار نہ تھے۔ ان میں سے بعض کے خاندانی معاملات اور کاروباری تعلقات ایسے تھے جو فوراً ختم نہ کیے جا سکتے تھے۔ چنانچہ یہودی مختلف اوقات میں آہستہ آہستہ یروشلم اکٹھے ہونے لگے۔ تاریخ کے اس موڑ سے ان کا جلاوطنی سے بعد کا زمانہ شروع ہوتا ہے جو تقریباً 538 سے 63 قبل مسیح تک پھیلا ہوا ہے۔ سائرس کے بعد آنے والے فارسی حکمرانوں نے بھی بنی اسرائیل کے ساتھ حسن سلوک جاری رکھا اور مال و اسباب سے مدد کرتے رہے۔ نتیجتاً وہ ان کے وفادار بن کر ان سیاسی اصولوں پر چلتے رہے جو اہلِ فارس کی جانب سے متعین تھے۔ اس دور میں ان کا مذہب یہودیت کے طور پر ابھرتا نظر آتا ہے۔

ہیکل سلیمانی

پہلی تعمیر	957ق۔م
پہلی تباہی	586ق۔م
دوسری تعمیر	515ق۔م
دوسری تباہی	70ء

ہیکل کی تعمیرِ نو

واپس آنے والوں میں عزرا/عزیرؑ اور نحمیاہ بھی شامل تھے۔ عزراؑ کاتبین تورات میں سے تھے اور ایک معلم اور کاہن مانے جاتے تھے۔ انہیں یہودیوں کے مذہبی معاملات کا نگران متعین کیا گیا تھا۔ ان ہی کے ذمہ اپنی قوم کی مذہبی تربیت بھی تھی تاکہ وہ خدا کے گھر کی تعمیر میں شوق سے حصہ ڈالیں۔ اس لیے یہ بھی کہا جاتا ہے کہ عزراؑ کو اہل فارس نے اس لیے بھی مقرر کیا کہ وہ ہیکل کے لیے درکار رقم لوگوں سے اکٹھی کر لیں۔[26] ان کی تعیناتی یہودیوں کے لیے مذہبی اعتبار سے مفید ثابت ہوئی۔ انہیں تباہ شدہ ہیکل کے کھنڈرات کے ایک تہہ خانے سے توریت کا ایک نسخہ ملا جس کی چھان پھٹک کر کے انہوں نے اس کی تصدیق کر دی۔ اس طرح یہودیوں کو اس طویل جلاوطنی کے بعد ایک دفعہ پھر نہ صرف توریت مل گئی بلکہ اس کی تعلیم کے لیے عزراؑ جیسا معلم بھی حاصل ہو گیا۔

عزراؑ کے برعکس نحمیاہ اگرچہ ایک سیاست دان تھے جو سلطنت فارس کے ایک صوبے کے گورنر تھے تاہم جس طرح انہوں نے ہیکل اور یروشلم شہر کی چہار دیواری کی تعمیر کی وہ اپنی مثال آپ تھی۔ وہ اہلِ فارس کی جانب سے یہودیوں کے سیاسی نگران کے طور پر بھیجے گئے تھے۔

چونکہ وہ خود یہودی تھے اور اس کام کی اہمیت سے واقف تھے لہذا انہوں نے دل و جان سے اس کو مکمل کیا۔ آخر کار 12 سال کی محنت سے معبدِ الٰہی کی تعمیر مکمل ہوئی۔ نیا بننے والا ہیکل اگرچہ پہلے ہیکل سے بڑا تھا مگر اس میں وہ شان و شوکت اور دولت کی چمک دمک نہ تھی جو عہدِ سلیمانی میں تعمیر ہونے والے معبد میں تھی۔ نحمیاہ نے ہیکل کی تعمیر کے بعد یروشلم کو خیر آباد کہہ دیا اور واپس فارس چلے گئے۔

ہیکل کی تعمیر کے بعد قرب و جوار کی ریاستوں میں بکھرے ہوئے یہودی یروشلم اکٹھے ہونے لگے۔ ان میں سے بہت سوں نے عمونیوں، حتیوں اور دیگر اقوام میں شادیاں کر رکھی تھیں۔ عزراؑ کے مطابق ان لوگوں نے دیگر اقوام میں شادیاں کر کے اپنی نسل کو داغدار کر لیا تھا۔ اس لیے یہ فیصلہ دیا گیا کہ نئے آنے والے لوگ اس وقت تک یروشلم کا حصہ نہیں بن سکتے جب تک وہ اپنے نسلی امتیاز کی قدر نہیں کرتے۔ انہیں اپنے بیوی بچوں کو چھوڑ کر یروشلم آنا ہوگا۔ عبرانی بائیبل میں ان لوگوں کی فہرستیں ملتی ہیں جنہوں نے غیر اقوام میں شادیاں کیں تھیں۔ بہت سے یہودیوں نے اپنا نسلی امتیاز برقرار رکھا اور عزراؑ کی راہبری میں خدا سے عہد کیا کہ وہ شریعت پر عمل کریں گے۔ اس طرح یروشلم ایک دفعہ پھر آباد ہوتا گیا۔ معبد میں کاہنِ/اسقف/امام اعظم کی تعیناتی کی گئی تاکہ ہر قسم کی عبادات اس کی نگرانی میں کی جائیں۔ اگرچہ یروشلم کے اصل حکمران اہلِ فارس ہی تھے لیکن اب یہودیوں کو مذہبی آزادی تھی اور ان کا حاکم بھی انہیں میں سے مقرر کیا جانے لگا تھا۔ یہاں ایک دفعہ پھر ان میں آپسی عدواتوں نے رواج پایا اور اس حد تک ناچاقی بڑھی کہ حرم الحرم جو کہ ہیکلِ الٰہی کے اندر ایک مقدس ترین مقام ہے میں اہلِ فارس کے ایک پسندیدہ آدمی کا قتل ہو گیا۔ اس قتل پر برہم فارسی لشکر نے یروشلم پر چڑھائی کی اور یہودیوں سے جرمانے کے نام پر ایک خطیر رقم وصول کی۔

فتوحات سکندر

فارسیوں کے زیر اثر رہنے کے بعد یہودیوں کو ابھی یونانیوں کی غلامی دیکھنا تھی۔ سکندر (323-356ق۔م) کے دور عروج نے بہت سی ریاستوں، اقوام اور نسلوں کو اس کا زیر بار کر دیا۔ اس کی فتوحات کا سلسلہ اتنا لمبا تھا کہ یہودی اس کے لیے بہت زیادہ اہمیت نہیں رکھتے تھے لیکن یروشلم کی جغرافیائی حیثیت چونکہ ایسی تھی کہ کوئی بھی حکمران اس کو نظر انداز بھی نہیں کر

سکتا تھا۔ نتیجتاً یہودیوں کو ایک بار پھر طوق غلامی پہننا پڑا۔ اس نے یہودیوں کو کوئی خاص نقصان نہیں پہنچایا۔ سماریہ کو فتح کر کے وہاں اس نے اپنی پسند کا گورنر مقرر کیا جس کے ذمہ خراج جمع کر کے اس کو پہنچانا تھا۔ اس نے جلد ہی مصر بھی فتح کر لیا اور وہاں اسکندریہ نام کا ایک شہر بسایا۔ یروشلم سے تقریباً ایک لاکھ یہودیوں کو لے جا کر اس نے وہاں بسایا۔ یہود کو بھی اس نے اہل مقدونیہ کے برابر کے حقوق دیے۔ اس نے بھی فارسیوں کی طرح یہودیوں کو مذہبی معاملات میں خود مختار بنا دیا۔ اس کی اس پالیسی کی وجہ سے ارد گرد سے بھی یہودی آ کر اسکندریہ میں بسنے لگے اور دیکھتے ہی دیکھتے یہ شہر یہودیوں کا دوسرا بڑا شہر بن گیا۔[27] اسی دوران شومرون والوں نے بغاوت کی تو اس نے وہاں کے تمام لوگوں کو جلا وطن کر کے یونانی کالونیاں قائم کر دیں۔ وہ فتوحات کا سلسلہ جاری رکھتا ہوا ہندوستان جا پہنچا جہاں زخمی ہوا اور یونان واپس آتے ہوئے 323 قبل مسیح میں اس کی موت واقع ہوئی۔

یونانی جرنیلوں کا دور

سکندر کی وفات کے بعد اس کی سلطنت اس کے جرنیلوں میں بٹ گئی جن کے درمیان مختلف ریاستوں کے حصول کے لیے لڑائیاں ہوتی رہتی تھیں۔ اس طوائف الملوکی کے زمانے کو ڈیاڈوچی کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ سیولوکسی اور بطلیموسی خاندانوں کے حصے میں بالترتیب یروشلم اور مصر کی حکمرانی آئی۔ بعد میں بطلیموس (367-282ق۔م) نے شام پر حملہ کر کے یروشلم بھی اپنے قبضے میں لے لیا اور بہت سے یہودیوں کو یہاں سے لے جا کر مصر بسا دیا۔ اس نے تقریباً تیس ہزار یہودیوں پر مبنی ایک فوج بھی ترتیب دی جس کے ذمہ یروشلم کی حفاظت تھی۔ بطلیموس اور سیلوکسی حکمران انتی گونوس (382-301ق۔م) کے درمیان یروشلم کے حصول کے لیے لڑائیاں ہوتی رہیں۔ دو دفعہ انتی گونوس نے فتح حاصل کی اور دو ہی دفعہ حکومت بطلیموس کے حصہ آئی۔ یہودی ایک مخصوص رقم اپنے ان حکمرانوں کو خراج میں دیا کرتے تھے تاکہ آزادانہ زندگی گزار سکیں۔ یہ زمانہ عجب جنگ و جدل، بے اعتمادی اور سنگدلی کا زمانہ تھا۔ نہ صرف یونانی بلکہ یہودی بھی ایک دوسرے کے خلاف سازشوں کے جال بنتے اور رسوائی کا شکار ہوتے رہے۔ قلوپطرہ (204-176ق۔م) اور بطلیموس اپی فانس (210-180ق۔م) کی شادی سے اس خانہ جنگی میں ایک مختصر وقفہ آیا لیکن بعد میں پھر شام اور مصر کی ریاستیں آپس میں

گتھم گتھا ہو گئیں۔

ہیلینیت کا عروج

یہودیوں میں ہیلینیت پروان چڑھنے لگی اور ان کی ادبی تحریروں میں یونانی رنگ واضح نظر آنے لگا۔ یہودی روایات کو مصری اور یونانی دیومالاؤں کے سہارے بیان کیا جانے لگا۔ یونانی دور میں لکھے جانے والے ادب کے لیے عموماً "غیر ملہم کُتب/اپاکرفا" کی اصطلاح استعمال کی جاتی ہے جس کا مطلب ایسی مشکوک تحریریں ہیں جنہیں سند نہ ہونے کی وجہ سے دیگر مستند مقدس کتب میں شامل نہ کیا گیا ہو۔ اس دور میں بڑے بڑے نامور یہودی ادیب اور فلسفی آئے جنہوں نے بنیادی طور پر یونانی فلسفے اور یہودی مذہبی ادب میں ہم آہنگی کے لیے کام کیا تا کہ یونانی دنیا کو یہ لگے کہ عبرانی بائیبل ان کے فلسفے کی پیش روی کرتی ہے۔ اپنی زبان سے یہودی اس قدر دور ہوئے کہ اب عبرانی ان کے لیے ایک مشکل زبان بن گئی۔ یہودی مذہبی کتب کا یونانی ترجمہ ہوا جسے "ہفتادی ترجمہ" کہا جانے لگا۔[28]

بعض مؤرخین نے یہ بھی بیان کیا ہے کہ ہیلینیت نے یکایک یہودیوں کو متاثر نہیں کیا بلکہ یہ عمل بتدریج ہوا۔ بطلیموسیوں کے بعد جب سیلوکسی حکومت یروشلم پر قائم تھی تو انطیوقس/انطوکس چہارم (215-164) کے دور میں ہیلینیت کو رواج ملتا نظر آتا ہے۔ اس نے بھی یکایک ہیلینیت کو لاگو کرنے کی کوشش نہیں کی کیونکہ ایک تو وہ یونانی تہذیب و ثقافت کا ایسا رسیا نہ تھا جو یہ قدم اٹھاتا اور دوم اس کی اپنی زندگی کا ایک بڑا حصہ رومیوں کے پاس گزرا تھا۔ یہ بھی خیال کیا جاتا ہے کہ یونانی خود اپنا طرزِ زندگی لوگوں پر لاگو کرنے کے شوقین نہیں تھے بلکہ علاقائی اقوام خود اس طرف راغب ہونا شروع ہوئیں۔[29] اس وقت یونانیت، قومیت سے زیادہ زبان کے ساتھ منسلک تھی جس نے یہودیوں کو بھی دیگر اقوام کی طرح یونانی زبان سیکھنے پر راغب کیا۔ ایسا کرنا ان کے نزدیک فخر کی علامت سمجھا جانے لگا۔ یہ بات قرین قیاس اس لیے بھی معلوم ہوتی ہے کہ جس شدت سے یہود یونانیت کی طرف مائل ہوئے اس سے علم ہوتا ہے کہ ایسا کرنے میں ان کی اپنی خواہش شامل تھی ورنہ جس طرح بابلی دور ان کو متاثر نہ کر سکا تھا یہاں بھی کچھ ایسا ہی دیکھنے کو ملتا۔

جب اونیاس سوم کا بھائی یوشع تقریباً 175 قبل مسیح میں امامِ یہود بنا تو یونانیوں کا رنگ

یہودیوں پر گہرا ہونے لگا۔ وہ یونانی طرزِ زندگی کا اتنا دلدادہ تھا کہ اس نے اپنا نام بھی بدل کر جاسون رکھ لیا جو کہ ایک یونانی نام ہے۔ اس نے بہت سی یونانی رسموں کی یہودیوں میں بنا ڈالی۔ کھیل تماشوں کے نام پر یہودی، یونانی طرز زندگی اختیار کرتے گئے۔ جاسون نے یونانی طرز کا جمنیزیم یا اکھاڑا بنانے کا سوچا تو یونانی حکومت نے اس کے لیے 150 ٹیلنٹ رقم ادا کرنے کا کہا۔ جاسون نے یہ طریقہ کار اپنایا کہ رقم خود ادا نہیں کی بلکہ وہ یہودی جو شہری حقوق حاصل کرنا چاہتے تھے ان سے طلب کی۔ چنانچہ یہ بھی سوچا جاسکتا ہے کہ یہودیوں نے خود یہ نئی شہریت اس لیے حاصل کی تھی کیونکہ وہ خود ہی یونانی طرزِ زندگی کو اپنانا چاہ رہے تھے۔ ایک نقطہ نظر یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ جاسون اس نئے طرزِ زندگی میں اتنا مگن ہو گیا کہ معبد میں کی جانے والی عبادات میں خلل آنے لگا۔ اس کے لیے طاقت کا حصول سب سے بڑھ کر تھا۔ مذہب اس کے ہاں ثانوی درجہ رکھتا تھا۔ اس لحاظ سے یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ یہ سب مذہبی تگ ودو نہیں تھی بلکہ اس کے پیچھے سیاسی عناصر کارفرما تھے۔

یونانیوں کا یروشلم پر قبضہ

انطیوقس کی فوجوں نے جب مصر پر قبضہ کیا تو کسی نے یہ افواہ اڑادی کہ اس کو قتل کر دیا گیا ہے۔ جاسون نے اس موقع کو غنیمت جان کر یروشلم پر خود مختاری کا اعلان کر دیا۔ انطیوقس نے اسے بغاوت کے معنوں میں لیا اور یروشلم پر چڑھائی کر دی۔ اس کی زبردست فوج کے سامنے مٹھی بھر یہودی معمولی سی مزاحمت ہی کر سکے۔ غصے میں بپھرے لشکر نے تین دن کے اندر اندر ہی 40،000 یہودیوں کو قتل کر ڈالا اور اتنے ہی قیدی بنے۔ ہیکل سلیمانی کا تقدس پامال کیا گیا اور اس کا ساز و سامان لوٹ لیا گیا۔ حرم الحرم جہاں یہودی بھی خدا کے تقدس کے ڈر سے سال میں ایک بار جاتے تھے کے اندر ایک سور لا کر ذبح کیا گیا اور اس کا گوشت ابال کر ہیکل میں بکھیر دیا گیا۔[30] جب انطیوقس کا غصہ ٹھنڈا ہوا تو وہ دو یونانی گورنر یہودیوں پر مقرر کر کے واپس چلا گیا۔

اسی زمانے میں سلطنتِ روما کی طاقت کے چرچے پھیل رہے تھے۔ رومی ایسا کرتے تھے کہ جس بڑی سلطنت پر قبضہ کرنا ہوتا اس کی ارد گرد کی ریاستوں کو شہہ دیتے۔ اس طرح بڑی سلطنت کو کمزور کرنے کے بعد اس پر حملہ کر دیتے۔ انطیوقس رومیوں کی چالوں سے آگاہ تھا اور

اسے اس بات کا خطرہ بھی تھا کہ کہیں یہودی، رومیوں سے ساز باز نہ کر لیں۔ اس وجہ سے دو ہی سال بعد اس نے یروشلم پر چڑھائی کر دی اور حکم دے دیا کہ بنی اسرائیل کا خاتمہ کر دیں۔ سبت کے دن یہودیوں پر حملہ کیا گیا اور جتنے مرد ہاتھ لگے مارے گئے اور عورتیں باندیاں بنیں۔ شہر برباد کرنے کے بعد یونانیوں نے کوہِ صہیون پر ایک قلعہ تعمیر کیا اور وہاں سے ارد گرد کے لوگوں پر نظر رکھنے لگے اور لوٹ مار کا بازار بھی گرم کیا۔ ہیکل میں چھپ چھپ کر عبادت کے لیے آنے والوں کو گرفتار کر لیا جاتا۔ دیکھتے ہی دیکھتے یہ قلعہ شہر کے لیے ایک خطرہ بن گیا۔[31] اس پر مستزاد یہ کہ ایک نیا حکم نامہ جاری کیا گیا جس کی رو سے ساری مملکت کا مذہب یونانیت طے پایا۔ لوگوں کو مجبور کیا گیا کہ وہ یونانی دیوتاؤں کی عبادت کریں۔ مصر اور شام دونوں جگہ یہ حکم رائج کروایا گیا۔ ہیکل سلیمانی کے اندر یونانی دیوتا اولمپس کا بت نصب کیا گیا۔ وہ جگہ جو ایک واحد لاشریک خدا کی عبادت کے لیے بنائی گئی تھی مشرکین سے بھرنے لگی۔

ہیکل کی تباہی کے بعد کے ادوار

بابلی دور	598تا538ق۔م
فارسی دور	538تا332ق۔م
یونانی دور	332تا110ق۔م
اسمونی دور	110تا63ق۔م
رومی دور	63ق۔م تا324ء

یہودی رسم و رواج، عبادات اور تہواروں پر پابندی عائد کر دی گئی۔ اب نہ تو سبت کی تقدیس کی جا سکتی تھی اور نہ ہی عید منائی جا سکتی تھی۔ نہ ہی خدا کے آگے سر جھکایا جا سکتا تھا اور نہ ہی اس کے عہد کو ختنہ کے ذریعے دوہرایا جا سکتا تھا۔ یونانی جہاں بھی یہودیوں کی کوئی مقدس کتاب دیکھ لیتے تو اس کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے جلا دیتے۔ بہت سے یہودیوں نے حکومت کے احکامات تسلیم کر لیے اور بت پرستوں کا سا مذہب اختیار کر لیا۔ بہت سے ایسے بھی تھے جنہوں نے شاہ کے احکامات کی حکم عدولی کی۔ نہ ہی انہوں نے اپنے مذہب کو چھوڑا اور نہ ہی اس کے احکامات پر عمل پیرا ہونا بند کیا۔

مکابی خاندان کی حکومت

پہلے جب یہودی مشکلات میں گھرے ہوتے اور اپنے گناہوں یا غلطیوں سے دوسروں کی غلامی کرنے پر مجبور ہوتے تو ان کی طرف رہنما بھیجے جاتے جو کبھی موسیٰؑ بن کر آتے کبھی سموئیلؑ

نام پاتے؛ کبھی ان کو حزقی ایل ؑ کہا جاتا تو کبھی وہ یرمیاہؑ کے نام سے موسوم ہوتے۔ لیکن اب تو جیسے انبیا کا آنا ہی موقوف ہو گیا تھا۔ وہ پریشانیوں میں گھرے ہوئے خدا کی رحمت کے طلب گار تھے۔ قسمت ایک دفعہ پھر ان پر مہربان ہوئی اور اس دفعہ مکابی/اسمونی خاندان(168–37ق۔م) کے سر یہ سہرا بندھا کہ اس نے اپنی قوم کا سر ایک طاقتور دشمن کے سامنے بلند کر دیا۔ یہ خاندان اس قدر مشہور تھا کہ اس کی تواریخ لکھی گئیں اور عبرانی بائیبل کی بعض "فہرست مسلمہ" یعنی ایسی فہرست جو کہ مستند مانی جاتی ہیں کا حصہ بھی بنیں۔

متت یاہ/متاتھیاس نامی ایک ضعیف بوڑھا یہودیہ کے ایک گمنام علاقے مودین میں رہا کرتا تھا۔ اس کے پانچ بیٹے تھے جن کے نام یوحانان، شمعون، یہودا مکابی، الیسر اور یوناثان تھے۔ جب یونانیوں نے بت پرستی کو رواج دیا اور یہودیوں کا مذہب جبراً تبدیل کروانے لگے تو باوجود اپنے ضعف کے متاتھیاس نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا۔ اپنے علاقے میں یہ ضعیف بوڑھا سربراہ اور مذہبی پیشوا سمجھا جاتا تھا۔ حکومت کے نمائندے اس کے گاؤں میں بھی آئے اور دیگر سربراہان علاقہ کے ساتھ اس کو بھی سو طرح کے لالچ دیے تاہم اس نے ان کی بات نہیں مانی۔ اسی اثنا میں ایک اور یہودی سربراہ نے آگے بڑھ کر یونانی مذہب اختیار کر لیا اور قربان گاہ پر سجدہ کیا۔ اس عمل نے متاتھیاس کو غصہ دلایا۔ جھریوں پڑے اس بوڑھے نے غصے میں نہ صرف اس یہودی کو قتل کر دیا بلکہ حکومتی نمائندے بھی اس کے غضب کے ہاتھوں موت کے گھاٹ اترے۔[32] بعد ازاں اس نے اپنا ایک گروہ بنایا اور پہاڑوں میں روپوش ہو گیا۔

سبت کے یونانیوں کی فوج نے اس گروہ کے 1000 آدمیوں کو پہاڑوں میں گھیر لیا۔ اس دن یہودی شرعی طور پر کوئی بھی کام نہیں کر سکتے۔ چنانچہ سبت کے تقدس میں یہودیوں نے ہتھیاروں کو ہاتھ نہیں لگایا اور چپ چاپ یونانیوں کے ہاتھوں مرتے گئے۔ یہ دل دہلا دینے والا واقعہ دیکھ کر متاتھیاس نے فتویٰ دیا اور اس وقت سے سبت کے دن بھی دفاع کے لیے یہودیت میں ہتھیاروں کا استعمال کیا جانے لگا۔[33] اسی روپوشی کے زمانے میں یہودیوں نے مختلف مقامات پر عبادت گاہیں بنائیں جنہیں سیناگاگ کہا جانے لگا۔ اس وجہ سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان میں سبت کے دن لڑائی اور عبادت کے لیے سیناگاگ کا بننا مکابی دور کے مرہون منت ہے۔

متاتھیاس کے بعد اس کے بیٹے یہودا مکابی نے گروہ کی سربراہی کی اور ایک بڑا لشکر ترتیب

دیا۔ یہودا ہتھوڑا/ گرز چلانے کا ماہر تھا اور مکابی اس کا لقب تھا جس کا مطلب ہی ہتھوڑا ہوتا ہے۔ اسی کی نسبت سے یہ لوگ مکابیین کہلائے۔ اسی دور میں ایک اور گروہ جو حسیدی کہلایا ان کا طرفدار بنا۔ انہوں نے یونانیوں کے خلاف غیر متوقع فتوحات کیں اور آہستہ آہستہ اپنی ریاست کا دائرہ کار بڑھاتے گئے۔ یہاں تک یروشلم شہر بھی ان لوگوں نے فتح کر لیا اور ہیکل سلیمانی سے بتوں کو ہٹا کر وہاں ایک خدا کی عبادت کو دوبارہ رواج دیا۔ یہودیوں نے اس فتح کی خوشی میں آٹھ روز تک جشن منایا۔ اس موقع کی یہودی تاریخ میں اس قدر اہمیت ہے کہ ابھی تک اس دن کی یاد میں ہنوخا کا تہوار منایا جاتا ہے۔

مکابی خاندان کے جتنے افراد حکومت کرتے رہے وہ ایک طرف تو یونانیوں سے لڑائیوں میں مصروف رہے اور دوسری طرف سلطنت روم سے اپنے تعلقات بڑھاتے رہے۔ مصر، شام اور فارس کی آپسی جنگیں یہودیوں کے لیے خوش قسمتی کا پیام ثابت ہوئیں اور انہیں یروشلم میں قدم جمانے کا موقع ملتا رہا۔ یہودہر قانوس (عہد 134—104 ق۔م) کے دور میں یروشلم میں یہودیوں کے لیے امن قائم ہو گیا۔ اپنی سلطنت میں اس نے یہودی مذہب کو اختیار کرنا لازمی قرار دیا اور لوگوں سے شریعتِ موسوی کی جبری پیروی کروانے لگا۔ بہت سے لوگوں کو پکڑ کر ان کا زبردستی ختنہ کیا گیا۔ بعدازاں جب مکابی خاندان کے ایک اور حکمران ارسطوبولوس اول (عہد 104-103 ق۔م) کی حکمرانی کا دور تھا تو اس نے بھی یہی روش اختیار کیے رکھی۔ جس علاقے کو فتح کرتا وہاں کے لوگوں کو جبراً یہودی بنا دیتا۔[34] اس کی وفات کے بعد اس کا بھائی سکندر جانوس (عہد 103-76 ق۔م) حکمران بنا۔ عمر کے آخری حصے میں ہر قانوس کی فریسیوں سے عداوت ہو گئی تھی۔ یہی عداوت جانوس کے حصے میں بھی آئی۔ فریسی یہ چاہتے تھے کہ وہ کاہنِ اعظم کا رتبہ ہارونؑ کی نسل کے لیے چھوڑ دے اور خود کو حکمرانی تک محدود کرے[35] جبکہ وہ نہیں مانا یہاں تک کہ اس کی موت کا وقت آ پہنچا۔ مرتے وقت اس نے اپنی بیوی اسکندریہ (عہد 76-67 ق۔م) کو تخت کا وارث بنایا اور مشورہ دیا کہ فیریسیوں سے اتحاد قائم کرے۔ چنانچہ مرنے کے بعد اس کی فریسی حلقوں میں قدر و منزلت ہوئی جس سے اسکندریہ کو حکمرانی میں زیادہ مشکلات پیش نہیں آئیں۔ مکابیوں سے پہلے لوگ یا تو یہودی ہوا کرتے تھے یا یونانی لیکن ان کے عروج کے بعد یہودیت اور ہیلینیت آپس میں گڈمڈ ہو گئے۔ اسمونی حکمران ایک طرف تو یونانی

بادشاہوں سے امتیازات اپنائے ہوئے تھے اور دوسری طرف ہیکلِ سلیمانی میں کاہنِ اعظم کے فرائض سرانجام دے رہے تھے۔ اس کا اثر یہودی مذہب پر یہ پڑا کہ بعد میں آنے والے دور میں یہودی فرقوں کو یہودیت اور ہیلینیت کی مختلف تشریحات کے ذریعے ان میں مطابقت پیدا کرنی پڑی یا ان کے رد لکھنے پڑے۔[36]

رومیوں کا دور

مکابی دور کے اختتام تک یونانی اثر یہودیوں پر اتنا گہرا تھا کہ ان کے بیشتر حکمرانوں کے نام بھی یونانی طرز پر رکھے جاتے تھے۔ اس دور میں ایک طرف تو فریسی اور صدوقی جھگڑے جاری رہے اور دوسری طرف تخت کے لیے اسمونی حکمرانوں نے ایک دوسرے کے خلاف سازشوں کا بازار گرم کیے رکھا۔ اسکندریہ نے تقریباً نو سال حکومت کی۔ بعد میں اس کے دو بیٹے ہرقانوس دوم (عہد 67-66 ق۔م) اور ارسطوبلوس دوم (عہد 66-63 ق۔م) آپس میں تخت کے لیے جھگڑے اور علیحدہ علیحدہ رومیوں سے رابطہ کیا کہ ان کی مدد کی جائے۔ اس وقت پومپی آئی (106-48 ق۔م) رومیوں کا جرنیل تھا۔ اس نے یروشلم پر حملہ کیا اور تین ماہ کے محاصرے کے بعد شہر فتح کر لیا۔ وہ ہیکل کے اندر گیا اور گھوم پھر کر اس کا معائنہ کیا۔ حرم الحرم جہاں سوائے امامِ اعظم کے کوئی نہیں جا سکتا تھا وہاں بھی گیا لیکن کسی چیز کو نقصان نہیں پہنچایا۔ اس نے غالباً یہ محسوس کر لیا تھا کہ یہودی اس کے ہیکل کے دورے کو اچھی نظروں سے نہیں دیکھ رہے لہٰذا واپسی پر اس نے ہیکل کو غسل دے کر پاک کر دینے کا حکم دیا۔ ہرقانوس کو امامِ اعظم مقرر کر کے وہ خود واپس چلا گیا۔[37] یوں مکابی دور کا اختتام ہوا اور یہودی ایک دفعہ پھر غیر اقوام کے تابع ہو گئے۔ رومیوں کا یہ دور تقریباً 63 قبل مسیح تا 324 عیسوی تک جاری رہا۔

جولیس سیزر کا عہد

جولیس سیزر / پولیوس قیصر (100-44 ق۔م) ایک رومی جرنیل تھا جس نے سلطنت روم کو افریقہ سے یورپ تک پھیلا دیا۔ اس کے اور پومپی آئی کے درمیان حکمرانی کے حصول کے لیے جنگ شروع ہو گئی۔ اگرچہ پومپی آئی نے ہیکل میں لوٹ مار نہیں کی تھی لیکن یہودیوں کے نزدیک اس نے اس کا تقدس پامال کیا تھا اور حرم الحرم کے اندر چلا گیا تھا اس لیے وہ اسے ناپسند

کرتے تھے۔ جب سیزر اور پومپے کے درمیان جنگ ہوئی تو یہودیوں نے سیزر کا ساتھ دیا جو فاتح رہا۔اس فتح سے خوش ہو کر اس نے یہودیوں کو بہت سی رعایات دیں۔ وہ موحد تھے اور رومی دور میں یہ ضروری ہوتا تھا کہ بادشاہ کو سجدہ کیا جائے اور معبود مانا جائے لیکن یہ یہودیوں کے لیے ناممکن تھا۔ سیزر کو بھی غالباً یہ ناممکن ہی معلوم ہوا۔ اس نے ان کو ایک بڑی رعایت تو یہ دی کہ بادشاہ کی عبادت سے مستثنیٰ قرار دیا۔ اس کی بجائے یہودی صبح کے وقت بادشاہ کے لیے ایک اضافی عبادت خدا کے حضور کیا کرتے تھے۔[38] بعد میں 44 قبل مسیح میں سیزر کو برسرِ دربار اس لیے قتل کر دیا گیا کیونکہ رومیوں کا خیال تھا کہ وہ ایک جرنیل ہے اور اس کو بادشاہت کا حق نہیں۔ مارک انتھونی (83-30ق۔م) جو کہ سیزر کا دوست تھا نے اپنا اتحاد قائم کیا تاکہ قاتلوں سے بدلہ لے سکے۔ وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہوا اور سلطنت اس کے ہاتھ آئی لیکن اس کے دور میں حکومت مختلف حکمرانوں میں تقسیم تھی۔ وہ خود صرف مشرقی حصوں کا حاکم تھا۔

ہیروڈ کی حکومت

یہودیوں پر رومی اب کوئی ایسا حاکم مقرر کرنا چاہتے تھے جو برائے نام یہودی ہو۔ ان کی نظرِ انتخاب آخر کار ہیروڈ (عہد 37-4ق۔م) پر جا ٹھہری جو اصل میں ایک ادومی تھا۔ اس کے باپ کو یہودہر قانوس نے زبردستی یہودیت اختیار کرنے پر مجبور کیا تھا۔ تقریباً 30 قبل مسیح میں ہیروڈ کو حاکم مقرر کیا گیا۔ جس طرح مؤرخین نے اس کے حالات قلم بند کیے ہیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ وہ ایک سازشی، دھوکے باز اور خطرناک آدمی بھی تھا اور یہودیوں کا ہمدرد اور غمگسار بھی۔ رومی چونکہ ایک طرف تو آپسی خانہ جنگیوں میں مصروف تھے اور دوسری طرف شاہانِ فارس کے ساتھ اتحاد قائم رکھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ چنانچہ یہودیہ پر ان کی خاص توجہ نہ تھی۔ ہیروڈ کی چالوں کا یہ حال تھا کہ اس نے اسمونی خاندان کی آخری شہزادی یعنی ارسطوبلوس کی بہن مریم کو اپنی دلہن بنایا اور اپنے بھائی کو جو کاہنِ اعظم تھا قتل کروا دیا۔

بعد میں جب آگستس/اغسطوس (عہد 27ق۔م-14) قیصر روم بنا تو ہیروڈ نے اس سے راہ رسم نکال لی۔ وہ ایسی حکمت عملی اختیار کرتا کہ شاہانِ روم اس سے خوش ہوتے اور یہودی دبے رہتے۔ غالباً اسے اس بات کا ادراک تھا کہ رومیوں کے خلاف بغاوت سے کوئی عملی فائدہ نہیں ہو گا بلکہ نقصان ہی نقصان کا اندیشہ ہے۔ لہذا وہ انہیں خوش رکھنے کی کوشش کرتا جس کی

وجہ سے اس کی حکومت تقریباً 37 برس تک قائم رہی۔ اس نے خود کو ہیروڈ اعظم کا خطاب دیا جو تاریخ میں اس کے نام کا حصہ بن گیا۔ یہودیوں کو اس دور کا فائدہ یہ ہوا کہ وہ معاشرتی طور پر آزاد تھے اور اپنے مذہب کے مطابق زندگی گزار سکتے تھے۔[39] مذہب میں چھیڑ چھاڑ ہیروڈ کا شیوہ نہ تھا۔ البتہ یہ قرین قیاس ہے کہ اپنی حکومت جاری رکھنے کے لیے اسے سخت فیصلے بھی کرنے پڑتے ہوں گے۔ چنانچہ جو بھی اس کے اور حکمرانی کی راہ میں حائل ہوتا ہو گا اسے اس کی زندگی سے کوئی دلچسپی نہ رہتی ہو گی۔ ہیروڈ کے دور کو تعمیرات کا دور کہا جا سکتا ہے کیونکہ اس کی حکومت کے شروع میں ایک زلزلہ آیا جس کی نذر بہت سے لوگ ہو گئے اور ایک قحط کا سامان پیدا ہو گیا۔ اس زلزلے نے جہاں جانی نقصان کیا وہیں بہت سی عمارتوں کو بھی زمین بوس کر دیا۔ ہیروڈ نے دونوں موقعوں پر یہودیوں کی مدد کی۔ مصر اور دیگر ریاستوں سے غلہ خرید کر عوام میں تقسیم کیا اور کسانوں کو اگلے برس کی فصل کے لیے بیج بھی مہیا کیا۔ عمدہ عمارات و محلات بنوائے گئے جن کی عظمت کے چرچے قیصرِ روم تک جا پہنچے۔ ہیکل کی عمارت میں زمانے نے متعدد تغیر پیدا کر دیے تھے۔ اس کی مرمت اس خوبصورتی سے کروائی گئی کہ ایک طرف تو اس کی مضبوطی میں اضافہ ہوا اور دوسری طرف ایسی شان و عظمت پیدا ہوئی کہ عہد سلیمانؑ کی یاد آنے لگی۔

ساڑھے نو سال میں یہ تعمیری کام مکمل ہوا۔ ہیکل کی شکل و صورت تقریباً تبدیل ہو کر رہ گئی۔ اس کے تین حصوں میں سے ایک حصہ عورتوں کے ساتھ منسوب تھا جس سے پتہ چلتا ہے کہ عورتوں کو بھی یہاں آ کر عبادت کی اجازت تھی۔[40] تلمود میں اس ہیکل کی تعریف یہاں تک کی گئی ہے کہ ربی یہ کہا کرتے تھے کہ جس نے ہیروڈ کا بنایا ہوا معبد نہیں دیکھا اس نے زندگی میں کوئی خوبصورت عمارت نہیں دیکھی۔[41] تاریخ میں یہ معبد اس قدر مشہور ہوا کہ اس کو ہیکل سلیمانی کی بجائے معبدِ ہیروڈ کہا جانے لگا۔ اس کا ایک اور کارنامہ قیصریہ شہر کی تعمیر تھی۔ اس سے پہلے اس شہر کا کوئی وجود نہیں تھا۔ اس نے یہ شہر تعمیر کر کے قیصر کے نام پر اس شہر کو قیصریہ کہلوایا جس سے ایک طرف تو قیصر خوش ہوا اور دوسری طرف اس نے اس شہر میں رومیوں کو بسایا جن کی وجہ سے یہودی اس سے دبے رہتے۔ یہ زمانہ یہودیوں کے لیے آدم خیزی کا زمانہ تھا۔ اس دور نے فیلو (20ق۔م-50) جیسے بڑے یہودی فلاسفر کو پیدا کیا جس نے یونانی فلسفے اور توریت کے درمیان مطابقت کی کوششیں کر کے ہفتادی ترجمے کو فروغ دیا۔

ہیر وڈ کا اختتام اچھا نہ ہوا کیونکہ اس کی چالوں سے عوام تو ایک طرف اس کے اپنے بچے بھی تنگ آ گئے تھے اور بار بار قیصرِ روم کے دربار میں فریاد لے کر پہنچ جاتے۔ اس نے پہلے تو اپنی بیوی کو اپنے چچا کے ساتھ ناجائز تعلقات رکھنے پر سزائے موت دی اور پھر اپنی حکومت کے اختتام پر اپنے متعدد بیٹوں کو قتل کروایا کیونکہ اس کا خیال تھا کہ وہ اسے قتل کرنے کا سوچ رہے تھے۔[42] اس نے رومیوں کو خوش کرنے کے لیے ان کی طرز پر تھیٹر اور ڈراموں کو بھی فروغ دیا تھا لہٰذا یہودی یہ بھی سمجھنے لگے تھے کہ اس کو مذہب سے نہیں بلکہ حکومت سے دلچسپی ہے۔ اس کے دور میں رومی طرزِ حیات کو اس قدر فروغ ملا کہ ہیکل کے ارد گرد بہت سے تھیٹر کھل گئے اور عبادت میں خلل آنے لگا۔ اس کی موت ہی سے چند برس قبل یہودیوں میں یسوعؑ نام کے ایک فرد پیدا ہوئے جن کو مسیحؑ کے لقب سے ان کے پیروکار پکارا کرتے تھے۔ ان ہی کی تعلیمات سے متاثر ہو کر یہودیوں میں مسیحیوں کے ایک فرقے نے جنم لیا اور تدریجاً ایک نئے مذہب کا روپ اختیار کر لیا۔ مسیحؑ کے واقعات کے متعلق یہودی اور مسیحی مؤرخین میں روایات کا خاصا اختلاف ہے۔ زیرِ نظر کتاب کا بنیادی مقصد یہودیت پر لکھنا ہے، لہٰذا باوجود اس کے مسیحؑ کی شخصیت بہت اہمیت کی حامل ہے ان پر تفصیلی نقطہ نظر بیان نہیں کیا گیا۔

مجلس صنہادرین

ہیر وڈ کے دور کی خاص بات یہ تھی کہ رومیوں اور یہودیوں میں امن قائم رہا اور یہودیہ خون آلودہ ہونے سے بچا رہا۔ اس کے بعد یہ صورتحال تیزی سے بدل گئی اور نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ یہودیوں کا سیاسی اور مذہبی اقتدار خطرے میں پڑ گیا۔ سب سے زیادہ مشکلات ہیکل اور مجلس صنہادرین کو پیش آئیں۔ یہ مجلس جو نامعلوم وقت سے قائم تھی یہودیوں کی ایک طرح کی مذہبی پنچائیت و عدالت تھی۔ صنہادین ایک یونانی لفظ ہے تو ہو سکتا ہے بطلیموسی یا سلوکسی دور میں یہ مجلس قائم کی گئی ہو۔ یہ مجلس دو طرح کی ہوتی تھی۔ ان میں سے ایک تو چھوٹی مجلس تھی جو 23 اراکین پر مبنی تھی اور اس کا رسوخ ایک شہر تک تھا۔ 71 اراکین پر مبنی دوسری مجلس ہوتی جو فریسیوں اور صدوقیوں سے چنے جاتے۔ مذہبی علوم کے علاوہ ہئیت، ادب، فلسفہ اور جادو و طلسم کی بھی معلومات رکھنے والے یہ اراکین نہ تو بہت بوڑھے ہوتے اور نہ بالکل نوجوان۔ اس مجلس کے دو قائدین ہوتے تھے جن میں سے پہلا درجہ ناسی (شہزادہ) کا ہوتا اور دوسرا ابوالدین کا۔

ناسی وقت کا بادشاہ، امام اعظم یا حکمران ہوتا جس کی ماتحتی میں یہ مجلس فیصلے کرتی۔ ابو الدین مجلس کے تمام اراکین میں سب سے زیادہ پڑھا لکھا سمجھا جاتا اور ہیروڈ کے دور میں زیادہ تر فریسی فرقے سے چنا جاتا۔[43] اس کا کام ناسی کی معاونت تھا۔ یہ مجلس سبت یا کسی یہودی تہوار کے علاوہ ہر روز منعقد ہوتی۔ مشنا کے اندر صنہادرین کے عنوان سے الگ رسالہ بھی موجود ہے جس میں دیوانی و فوجداری قوانین بیان کیے گئے ہیں۔

یہودی بغاوتیں

1. پہلی یہودی رومی جنگ (66-73)
2. جنگ کیوٹس (115-117)
3. بر کوخبا بغاوت (132-136)

ہیروڈ کے بعد رومیوں نے یہودیوں کی باہمی چپقلش سے تنگ آکر اور اپنا اقتدار مضبوط کرنے کے لیے یہودیوں کو حاکمیت دینا بند کر دی اور ان سے محصول جمع کرنے کے لیے رومی افسر مقرر کر دیے۔ اب مجلس صنہادرین پر یہ پابندی عائد تھی کہ وہ تمام یہودیوں کے فیصلے نہیں کر سکتے تھے۔ موجودہ حکمران چونکہ رومی ہوتا اس وجہ سے وہ مجلس کا سربراہ ٹھہرا۔ جو لوگ رومی حکومت کے مجرم قرار پاتے ان کو رومی قانون کے مطابق سزا دی جاتی اور جو یہودی قانون کی پکڑ میں آتے ان پر صنہادرین کو جزوی اختیار ہوتا کیونکہ حتمی فیصلہ رومی گورنر ہی کر سکتا تھا۔

رومیوں کے خلاف بغاوتیں

امن و امان کے حوالے سے یہودیوں اور رومیوں کے لیے یہ کوئی اچھا دور نہیں تھا۔ یہودیوں کے خیال میں رومی ان پر ظلم کر رہے تھے لہذا وہ بار بار رومی حکومت کے خلاف بغاوت کرتے اور مزید مشکلات میں گھِر جاتے۔ مجموعی طور پر رومیوں کے خلاف انہوں نے تین بڑی بغاوتیں کیں۔ چھوٹے چھوٹے دنگے فساد تو شمار ہی میں نہیں۔ گلیل نامی ایک قصبے سے تعلق رکھنے والے یہودا گلیلی کی بغاوت کو اولین بغاوتوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ ان بغاوتوں میں مختصر وقفہ اس وقت آیا جب ہیروڈ کے ایک پوتے اگرپا کو اُس وقت کے رومی بادشاہ قالی غُلا (عہد 37-41) نے ارضِ یہودیہ کا سربراہ مقرر کر دیا۔ اگرپا شاید اپنے والد کی طرح امن و امان قائم رکھنے میں کامیاب ہوتا لیکن رومیوں کے دلوں میں یہودیوں کی نفرت پلنا شروع ہو گئی تھی۔ دوسری طرف قالی غلا یہ چاہتا تھا کہ اس کو دیوتا تسلیم کر کے اس کی عبادت کی جائے جس کے

لیے اس نے اپنے سپاہیوں کو مقرر کیا کہ ہر معبد، مندر اور سیناگاگ میں اس کے بت نصب کیے جائیں۔ یہودیوں پر زبردستی کی گئی، ان کے معززین کو کوڑے لگوائے گئے اور ان کی عورتوں کو سور کا گوشت کھانے پر مجبور کیا جانے لگا۔[44] جب یہودی وفد اس کے پاس فریاد لے کر گیا تو اس نے ان کی ناکامی کو اپنی خدائی کی نشانی سمجھا اور انہیں مزید مجبور کرنے لگا کہ وہ اس کی عبادت کریں۔ جب کچھ عرصہ بعد اس کا قتل ہو گیا تو یہودیوں کی جان میں جان آئی۔ وہ اس کی موت پر اتنے خوش تھے کہ انہوں نے ایک دعوت کا اہتمام خاص کیا۔ اگرپا سات برس حکومت کر کے دنیا سے رخصت ہوا۔ اس کے بعد یہودیوں اور رومیوں میں عداوت مزید بڑھ گئی۔ یہودیوں نے کوئی مناسب حکمت عملی اختیار کرنے کی بجائے رومیوں کے خلاف بار بار علم بغاوت بلند کیا جس سے خود ان کا نقصان زیادہ ہوتا رہا۔ اگرپا کے بعد اس کا بیٹا اگرپا دوم بھی مختصر دورانیے کے لیے حاکم بنا تاہم یہودی اس سے بھی کچھ فائدہ نہ اٹھا پائے۔

ہیکل کی دوسری تباہی

66 عیسوی کے قریب رومیوں اور یہودیوں کی عداوت سے ملک کے مختلف حصوں میں لڑائیاں ہونے لگیں۔ اہل گلیل نے یہ نعرہ بلند کیا تھا کہ "خدا کے سوا کوئی مالک نہیں ہے۔"[45] یہ ایک طرح سے رومیوں کے خلاف کھلی بغاوت تھی۔ ایک نئے فرقے زیلوٹ نے جنم لیا۔ یہ فرقہ یہودیوں میں سے تھا اور یہودیوں ہی کا دشمن تھا۔ اس فرقے کے ماننے والے دیگر یہودیوں کو اس لیے قتل کر دیتے کہ وہ رومیوں کے خلاف کیوں نہیں ہیں۔ اوپر تلے بہت سے معرکے ہوئے۔ کچھ لڑائیوں میں یہودیوں کو کامیابی بھی ملی لیکن رومیوں کی فوج بالآخر فتح یاب ہوتی۔ رومیوں نے اب یہ سوچا کہ یہودیوں کو صفحہ ہستی سے مٹا دیں اور یروشلم پر قبضہ کریں۔ دیگر بھی جتنے یہودی شہر تھے ہر جگہ لوگ چن چن کر مارے گئے۔ رومی سپہ سالار طیوطوس / ٹیوٹس نے شہر کا محاصرہ کیا اور متعدد بار فتح کی کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہو سکا۔ اس وقت عید کی تقریب کی وجہ سے قرب و جوار کے یہودی بھی یروشلم جمع تھے جس وجہ سے شہر کی آبادی کئی گنا بڑھ گئی۔ طیوطوس نے تنگ آکر محاصرہ طویل کر دیا اور شہر کے اندر ایسا قحط پڑا کہ شاید جس کی مثال تاریخ انسانی نے دیکھی تک نہ تھی۔

یہودیوں میں سے بھی بہت سوں نے شجاعت اور دلیری کا ثبوت دیا لیکن رومیوں کے جم

عفیر کے سامنے وہ زیادہ دیر ٹھہر نہ پائے۔ 70 عیسوی میں ہیروڈ کے بنائے ہوئے معبد کو ٹھیک اسی دن (تیشا باؤ) آگ لگا کر زمین بوس کر دیا گیا جس دن نبوکدنضر نے سلیمانؑ کے بنائے ہوئے ہیکل کو تباہ کیا تھا۔ رومی سپاہیوں کی درندگی نے نبوکدنضر کی یاد لوگوں کے ذہنوں سے محو کر دی۔ وہ اس حد تک گئے کہ اگلے پچاس سال تک ہیکل کے کھنڈروں پر گشت کرتے رہے تا کہ کوئی بھولا بھٹکا یہودی بھی ادھر آنے کی جرات نہ کر سکے۔ یہودی تاریخ میں اسے "ہیکل کی دوسری تباہی" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ بعد میں متحد ہو کر یہودیوں نے ایک دفعہ پھر کوشش کی کہ یروشلم کا علاقہ ان کے قبضہ میں آ جائے۔ وہ کامیاب تو ہو گئے لیکن رومیوں جیسی جنگی سوچ نہ رکھتے تھے۔ جس علاقے کو انہوں نے فتح کیا تھا وہ تو کھنڈرات پر مبنی تھا۔ نہ شہر کی کوئی فصیل تھی نہ سر چھپانے کے لیے کوئی عمارت۔ ایسی صورت میں وہ زیادہ دیر اسے اپنے قبضے میں نہیں رکھ سکے۔ رومی اب سراپا آتش بنے ہوئے تھے۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق انہوں نے 50 قلعے اور 985 گاؤں و قصبے تباہ کیے۔ 580،000 یہودی لڑائی کے دوران قتل ہوئے اور بے شمار سسکتے بلکتے بھوک کی نذر ہو گئے۔ یہودیہ کا تقریباً تمام کا تمام رقبہ تباہ و برباد ہوا۔[46] بھاگتے ہوئے یہودیوں کا تعاقب کر کے رومی سپاہیوں نے انہیں زندانوں میں دھکیل دیا جہاں بھوک سے بیتاب ہو کر انہوں نے اپنے بھائیوں کی لاشیں تک کھانا شروع کر دیں۔ کہا جاتا ہے اس تباہی اور لوٹ مار کے بعد ارضِ شام میں سونے کی قیمت آدھی رہ گئی اور یہودی اسیروں کی کثرت کی وجہ سے غلام کی قیمت ایک گھوڑے سے بھی کم ہو گئی۔ بہتوں کو مختلف شہروں میں بیچا گیا تا کہ کھیل تماشوں میں درندوں سے لڑیں اور لوگ انسانی چیر پھاڑ کا مزہ لیں۔

یروشلم سے بے دخلی

کوہ صیہون پر جس جگہ ہیروڈ کا ہیکل موجود تھا اس کی جگہ 130 عیسوی میں رومی بادشاہ ہیڈریان (76-138) نے یونانی دیوتا جیوپیٹر کا معبد بنوا دیا۔ بیتِ لحم جو یروشلم کے قریب ہی ایک جگہ تھی اس کے داخلی دروازے پر سور کا ایک بت نصب کیا گیا تا کہ اس کی نفرت یہودیوں کو وہاں داخل ہونے سے روکے۔ شہر کا نام تبدیل کر کے ایلیار کھ دیا گیا۔ نیا نام اس قدر مشہور ہوا کہ لوگ یروشلم کا اصل نام بھول ہی گئے۔ ہیکل کی تباہی کا اثر نہ صرف یہودیوں پر بلکہ یہودیت پر بھی پڑا۔ 135 عیسوی میں اپنے خلاف ہونے والی آخری بغاوت کو کچلنے کے بعد رومیوں نے

یہودیہ کا نام تبدیل کر کے فلسطین رکھ دیا اور یہودیوں کو یروشلم سے بے دخل کر دیا۔ فلسطین کی زمین یا تو رومی فوجیوں میں تقسیم کر دی گئی یا نیلامی کی بھینٹ چڑھی۔ ختنہ اور دیگر یہودی مذہبی امور پر پابندی تھی۔ انہیں سال میں صرف ایک مرتبہ دیوارِ گریہ کے ساتھ لگ کر رونے کی اجازت تھی جو یہودیوں کے مطابق تباہ شدہ ہیکل کی ایک بچ جانے والی دیوار تھی۔ اسی نسبت سے آج تک یہ دیوار یہودیوں میں مقدس مانی جاتی ہے۔

یہودیت کی نئی تشریحات

یہودی بحیثیت قوم رومیوں کے عتاب کا شکار ہوئے۔ یہودی مذہب کی ترویج ناقابل معافی جرم بن گیا اور جو بھی ایسا کرتا قتل کر دیا جاتا۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ یہودیت تاریخ کے اس دور میں مادی و ظاہری اعتبار سے ایک قوم پرستانہ شکل اختیار کر رہی تھی۔ ہیکل کے نہ ہونے سے عبادت میں خلل واقع ہو گیا۔ قربانی کے لیے کوئی جگہ میسر نہ تھی۔ فیصلے کرنے کے لیے کاہنِ اعظم موجود نہیں تھا۔ سیناگاگ اگرچہ ادھر ادھر بن چکی تھیں لیکن جس طرح یہودیت میں ہیکل کی قدر و منزلت اور مذہبی اہمیت تھی اس طرح کا مقام سیناگاگ کو حاصل نہ تھا۔ فریسی اور صدوقی گروہ بکھر گئے اور ان کی جگہ وہ لوگ جو شریعت کا علم رکھتے تھے، مذہب کے پابند تھے اور شوق سے مذہبی تعلیم کو اپنائے ہوئے تھے ربی (عزت و توقیر والا) کا خطاب پانے لگے۔ ربی کا خطاب تب سے اب تک یہودیوں کے درمیان مذہبی پیشواؤں کے لیے مختص ہے۔ اس نئی یہودیت کو بعد میں ربیائی یہودیت کا نام دیا گیا۔ مذہب سمٹ کر توریت کی تلاوت اور پیروی تک محدود ہو گیا۔ اس زمانے میں مسیحا کا بے صبری سے انتظار کیا جانے لگا کیونکہ یہودیوں کا خیال تھا کہ خدا ان کو اکیلا نہیں چھوڑے گا اور ان کی اعانت کے لیے مسیحا ضرور بھیجا جائے گا۔ مسیحا کے تصور میں بھی ارتقا ہوا اور یہ سمجھا جانے لگا کہ وہ معجزوں کے ذریعے بنی اسرائیل کا مددگار بنے گا۔ اس دوران بہت سے لوگوں نے مسیحائی کا دعوی بھی کیا تاہم یہودیوں کے نزدیک ان کا نجات دہندہ ان کو میسر نہ آسکا۔

رومی فرمارواٹائٹس/تیتوس (39-81) کے دور میں ہیکل منہدم ہوا تھا لیکن یہودی اسی سے کچھ مراعات لینے میں بھی کامیاب ہو گئے تھے۔ اس میں بطور خاص ربی یوحنا/یوحان بن ذکائی کا ذکر کیا جاتا ہے جو ہیکل کی تباہی کے بعد بھی خاصی حیثیت کے حامل تھے۔[47] ٹائٹس کی

اجازت سے فلسطین کے ایک ساحلی شہر جامنیا میں انہوں نے یہودیوں کے لیے ایک دینی مدرسہ قائم کیا جو بعد میں "انگوری باغ" کے نام سے مشہور ہوا۔ بعدازاں اسی مدرسے کی طرز پر مختلف جگہوں پر بہت سے مدارس کھلے۔ یہاں ایسی تشریحات کی گئیں جو یہودیت کو معبد اور اس میں ہونے والی رسومات سے مستثنیٰ کر گئیں۔ چنانچہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہودیت کے مذہبی ارتقا میں اس مدرسے کا بہت عمل دخل ہے۔

ربیائی ادوار

1. زُگوت	170ق۔م تا30ء
2. تنائیم	10تا220ء
3. آمورائیم	200تا500ء
4. سیورائیم	500تا600ء
5. گاؤنیم	600تا1000ء
6. ریشونیم	1100تا1500ء
7. اخرونیم	1563تاحال

بن ذکائی نے یہودی علما کا ایک گروہ بھی اکٹھا کیا جنہیں تنائیم کہا جاتا تھا۔ تنائیم کا مطلب "دوہرانے والے" ہے۔ چونکہ یہ لوگ توریت کو زبانی دوہراتے تھے لہذا تنائیم کہلائے۔ تنائیم ہی نے مدراش کو ترتیب دیا جو عبرانی بائیبل اور یہودی شریعت کی تشریحات پر مبنی ایک تصنیف ہے۔ بن ذکائی ہی کی کوششوں سے مجلس صنہادرین بھی دوبارہ مرتب ہو پائی۔ ایک عرصہ تک یہ مدرسہ جامنیا میں کام کرتا رہا جہاں سے بعد میں اسے گلیل منتقل کر دیا گیا۔ اسی دور میں یہودی مقدس ادب کی فہرستِ مسلمہ ترتیب پائی، روزمرہ کی عبادات و دعائیں مرتب کی گئیں، ہیکل کی بہت سی عبادات کو سیناگاگ منتقل کر دیا گیا اور پرانی عبادات کو یاد رکھا اور دہرایا گیا۔[48] تنائیم میں ربی اکیوا/عقیبہ بن یوسف (50-135) کا نام خصوصیت سے لیا جاتا ہے جن کی عمر اس وقت چالیس برس ہو چکی تھی جب انہوں نے پانچ سال کے بچوں کے ساتھ بیٹھ کر شریعت کا علم حاصل کیا۔ انہوں نے اپنا ایک علیحدہ مدرسہ قائم کیا اور **ملاکہ** نامی ایک کتاب تصنیف کی جس میں یہودی روحانیت کا بہت دخل ہے۔ بغاوتوں ہی کے سلسلے میں انہیں بعد میں رومیوں نے سزائے موت دے دی۔ ان کا مزار طبریہ میں ہے۔

ربی یہوداہناسی (تقریباً135-217) کو رومیوں سے جب کچھ مراعات ملیں تو انہوں نے ایک فقہی مجموعہ مرتب کروایا جسے مشنا کہا جاتا ہے۔ مشناہی کے متن کو بنیاد بنا کر بعد میں تلمود مرتب کی گئی۔ چونکہ یہودی بابل میں بھی قیام پذیر تھے اور انہوں نے ساسانیوں کے ساتھ

تعلقات خوشگوار رکھے تھے جس وجہ سے وہ فلسطینی یہودیوں کی نسبت زیادہ خوشحال زندگی گزار رہے تھے۔ ان کے مسائل رومی حکومت کے زیر اثر رہنے والے یہودیوں سے جدا تھے اس لیے ان کے درمیان تقریباً سو سال بعد جس تلمودی روایت نے رواج پایا وہ فلسطینی روایت سے مختلف تھی۔ روایات اور مسائل کے اسی اختلاف سے تلمود کے دو نسخے یہودیت میں رواج پائے جن میں سے ایک کو فلسطینی اور دوسری کو بابلی تلمود کہا گیا ہے۔

مسیحیت کا عروج

مسیحؑ کو دنیا سے رخصت ہوئے تقریباً تیس سال گزر چکے تھے جبکہ ان کے پیروکاروں کی تعداد بہت تھوڑی تھی جنہیں یہودیوں کا ہی ایک گروہ تصور کیا جاتا تھا۔ عموماً لوگ انہیں یہودی مسیحی کہا کرتے تھے۔ اس دور کے یہودیوں میں حُب الوطنی کا جذبہ اس قدر عروج پر تھا کہ انہوں نے مذہب کو قومیت سے جوڑ دیا۔ جو یہودی قومی اور نسلی تفاخر کے حق میں نہ تھے وہ غدار اور مرتد کہلائے۔[49] مسیحی بھی ایک حد تک اسی نسلی تعصب کا شکار ہوئے۔ ان سے نفرت نے انہیں زیادہ مسیحی اور کم یہودی بنا دیا۔ وہ اپنوں کے عتاب کا بھی شکار تھے اور رومیوں کے ظلم کا بھی نشانہ بنتے تھے۔

چوتھی صدی عیسوی میں مسیحیت کو اس وقت عروج حاصل ہوا جب قسطنطین (306-337) نے عیسائیت قبول کر کے اسے سرکاری مذہب بنا دیا۔ اس نے ایک نیا شہر تعمیر کیا جسے نیا روم یا بازنطین نام دیا گیا۔ بعد میں لوگوں نے اسے قسطنطنیہ کہنا شروع کر دیا۔ دارالحکومت اسی نئے شہر منتقل کر دیا گیا۔ یہ ایک طرح سے بازنطینی سلطنت کا آغاز بھی تھا۔ مسیحی چونکہ یہ خیال کرتے تھے کہ ان کے نجات دہندہ کو مصلوب کروانے میں یہودیوں کا ہاتھ تھا لہذا وہ انہیں موردِ الزام ٹھہرانے لگے۔ سرکاری طور پر یہودی بننے اور یہودیوں اور مسیحیوں کے درمیان شادیوں پر پابندی عائد کر دی گئی جس سے دونوں گروہوں میں فاصلہ مزید بڑھتا گیا۔ پانچویں صدی میں یہودیوں کو سرکاری عہدوں سے نکال دیا گیا۔ بعد میں آنے والے رومی شہنشاہوں نے بھی اسی طریقہ کار کو اپنائے رکھا۔[50] مسیحیوں کا خیال تھا کہ ایک دن ایسا ضرور آئے گا کہ یہودی مسیحیت اختیار کر لیں گے تاہم اس قوم کی آنکھوں نے تو صدیاں دیکھ رکھی تھیں۔ فراعنہ کی غلامی، عہد مہاجرت، شہنشاہیت کے عروج و زوال، جلاوطنی اور کشت و خون

میں اگر کچھ باقی رہ سکا تھا وہ یہودی قوم تھی۔ چنانچہ یہ دور بھی اس لحاظ سے منفرد نہیں تھا کہ فلسطین میں بھی یہودیوں کا ایک بڑا گروہ اس زمانے میں بھی اپنے آبائی مذہب سے جڑا رہا اور انہوں نے بتیس دانتوں میں ایک زبان کی طرح رہنا سیکھ لیا۔

جب روم کی حکمرانی یولیانوس/جولین (331-363) کے ہاتھ آئی تو اس نے یہودیوں کو کچھ مراعات دیں اور انہیں یروشلم کی تعمیر کی دوبارہ اجازت دی۔ اس نے خود بھی مسیحیت کو ماننے سے انکار کیا اور اس کوشش میں لگا رہا کہ افلاطون کے فلسفہ میں ضم شدہ ہیلینیت کو دوبارہ رواج دیا جا سکے۔ اس کا دور تھوڑا تھا جس وجہ سے یہودی کوئی قابلِ ذکر کام نہ کر سکے اور مسیحی حکمرانی دوبارہ رائج ہو گئی۔ تھیودوسیوس اول (347-395) کے دور میں تو نوبت یہاں تک جا پہنچی کہ جبری مذہبی تبدیلیوں میں اضافہ ہونے لگا، مجلس صنہادرین کا خاتمہ کر دیا گیا، یہودیوں کو ملازمتوں سے بے دخل کر دیا گیا، شہری حقوق سلب کر لیے گیے، غیر یہودیوں سے شادی پر پابندی لگا دی گئی اور سرکاری طور پر مسیحیوں کو اس بات کا پابند کر دیا گیا کہ وہ یہودیت اختیار نہیں کر سکیں گے۔ اس طرح بحیثیتِ مجموعی مسیحی عہد یہودیوں کے لیے دردناک ثابت ہوا۔ متعدد یہودی جان بچانے کے لیے دیگر علاقوں میں جا بسے۔ البتہ یہ ضرور کہا جاتا ہے کہ اگسٹائن (354-430) جیسے مسیحی مفکرین نے اس ظلم و ستم کے دور میں بھی یہودیوں کے قتل سے منع کیا جس وجہ سے وہ یہ مشکل دور بھی گزار گئے۔ نیز یہودیوں کی قومی و نسلی ہم آہنگی کو بھی اس ضمن میں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

بابلی یہودیت

نبوکدنضر کے دور سے بہت سے یہودی بابل میں آباد تھے۔ سائرس اور دیگر فارسی حکومت کی عنایات اور ان کی تعلق داریوں نے انہیں یروشلم جانے سے بھی روکے رکھا۔ یہ ایک طرح سے یہودیت کے لیے بہتر ثابت ہوا کیونکہ وہ یہودی جو فلسطین میں آباد تھے رومن دور کے اختتام پر ہمہ قسم کی تنگیوں کا شکار تھے۔ ان کی نسبت بابلی یہودیوں کے ساسانی حکومت سے تعلقات زیادہ خراب نہیں تھے جس کی وجہ سے وہ فلسطینی یہودیوں سے بہتر زندگی گزار رہے تھے۔ بابلی، فارسی، اشکانی اور ساسانی حکومتوں کے زیر سایہ رہنے کی وجہ سے ان قوموں کے مذہبی و ثقافتی اثرات بابلی یہودیوں کی زندگی پر نمایاں تھے۔ انہوں نے زبان، رسم و رواج سمیت

ان قوموں میں رائج سحر و طلسم کو بھی اپنانا شروع کر دیا تھا جو یہودی شریعت کے مطابق ناجائز ہے۔ایک طرح سے انہوں نے اپنی ثقافت خود تخلیق کی جو رفتہ رفتہ پوری یہودی قوم کی ثقافت بن گئی۔ [51] ساسانی دورِ حکومت میں جب اردشیر بابکاں (عہد 226-240) شہنشاہ بنا تو اس نے زرتشت مت کو دوبارہ لاگو کرنے کی کوشش کی۔ یہودیوں پر بھی دباؤ ڈالا گیا کہ وہ نیا مذہب قبول کر لیں۔ تاہم بعد میں جب اس کا بیٹا شاہ پور اول (عہد 241-270) تخت نشین ہوا تو اس نے غیر زرتشتیوں کو مذہبی آزادی دے دی۔ البتہ اب بھی وہ ریاستی و فوجداری قوانین کی پیروی کرنے پر مجبور تھے۔ [52] البتہ مجموعی طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ تاریخ کے اس دور میں وہ اپنے اسرائیلی بھائیوں کی نسبت آزاد تھے اور اپنے علمی مشاغل آزادانہ جاری رکھ سکتے تھے۔

بابل کی طرف ہجرت

مسیحیوں کے ظلم و ستم سے تنگ آکر بہت سے یہودیوں نے فلسطین کو خیر آباد کہا اور بابل کی طرف ہجرت کرنا شروع کر دی۔ دونوں علاقوں کے مکینوں کے درمیان پہلے سے تجارتی تعلقات قائم تھے۔ اس کے علاوہ بہت سے بابلی یہودی اپنی مذہبی تعلیم کے لیے بھی فلسطین کا رخ کرتے رہتے تھے۔ ہیکل جب تک موجود تھا تو مذہبی رسوم کی تکمیل کے لیے بھی بابلی یہودیوں کو فلسطین جانا ہوتا تھا۔ لہذا ان تعلقات کی وجہ سے یہودیوں کی وہ جماعت جس نے بابل کی طرف ہجرت کی، آسانی سے یہاں اپنے ہم قوموں میں گھل مل گئی۔

بابل میں ربیائی یہودیت کا فروغ

اب فلسطین کے برعکس بابل ربیائی یہودیت کے لیے ایک سازگار ماحول فراہم کر رہا تھا۔ ربیائی یہودیت کو بابل میں مضبوط کرنے کا سہرا مشہور ربی ابا اریخا (175-247) کے سر باندھا جاتا ہے۔ ان کا شمار آمورائیم میں کیا جاتا ہے جن کا زمانہ تنائیم کے بعد کا ہے۔ آمورائیم سے مراد "بیان کرنے والا" ہوتا ہے۔ ان یہودی عالموں نے تنائیم کی باتوں کو وضاحت کے ساتھ بیان کیا تھا اس لیے یہ آمورائیم کہلائے۔ ابا اریخا کو تلمود میں عموماً "راو" کے نام سے یاد کیا گیا ہے جس کے معنی "استاد" کے ہوتے ہیں۔ انہوں نے اس زمانے کی روایت کے مطابق بابل سے فلسطین جا کر اپنی تعلیم مکمل کی اور واپس آکر "بیتِ مدراش" قائم کیا جو بابل کا ایک اہم مدرسہ بنا۔ اس مدرسے کا اثر اس قدر زیادہ تھا کہ یہودی علما کہتے تھے کہ جب سے راو فلسطین سے واپس آئے ہیں

بابل کے یہودی بھی اسرائیلیوں کے نقشِ قدم پر ہیں۔[53] اس سے مراد یہ تھی کہ وہ مشنا کو فلسطین سے لے آئے تھے جس وجہ سے یہاں بھی تلمودی روایت نے رواج پانا شروع کر دیا تھا۔[54] راوونے ربیائی روایت کا اصولی مطالعہ کیا جس سے بعد میں تلمود ترتیب پائی۔ تلمود نے بعد ازاں یہودیت میں ایک سند کی حیثیت اختیار کرلی۔

بابل میں بہت سے تلمودی مدرسے بھی قائم کیے گئے جو اگلے ایک ہزار برس تک یہودی مذہب کی ترقی کے لیے کوشاں رہے۔ ان تلمودی مکتبوں میں ہلاخا یعنی یہودی قانون کے مختلف حصوں پر کام ہوتا رہا۔ بعد میں یہی مدارس ترقی کرتے کرتے یشیوا کہلانے لگے۔ اُس دور میں مشرق و مغرب میں یشیوا کا ایک جال پھیلنے لگا۔ یہ یشیوا تقریباً وہی کام کیا کرتے تھے جو ایک وقت میں صنہادرین کا تھا۔ یہودیوں کے مذہبی معاملات کے علاوہ سیاسی، سماجی و معاشرتی مسائل بھی یشیوا میں حل ہوتے۔ چنانچہ مفلوک الحال یہودیوں کو بابل نے بڑی حد تک مذہبی آزادی دی لیکن اس کے بدلے انہیں زرِ کثیر صرف کرنا پڑتا رہا۔

مشقی سوالات

مختصر سوالات

1. دور خروج سے کیا مراد ہے؟
2. بنی اسرائیل کن دیوتاؤں کی عبادت کرنے لگے تھے؟
3. یہودیت میں عہد کی تجدید سے کیا مراد ہے؟
4. یہودیوں کو ارضِ موعود کے حصول میں دشواری کیوں پیش آئی؟
5. موسیٰؑ سے خدا کیسے ہم کلام ہوا؟
6. داؤدؑ سے خدا نے کیا عہد باندھا؟
7. قاضیوں کا دور کسے کہا جاتا ہے؟
8. یشوعؑ کون تھے؟
9. قاضی کا انتخاب کیسے کیا جاتا تھا؟
10. قاضیوں کا دور کب تک جاری رہا؟
11. 12 قاضیوں کے نام لکھیں۔
12. بادشاہوں کا دور کسے کہتے ہیں؟
13. سموئیلؑ کون تھے؟
14. ساؤل کون تھا؟
15. ساؤل کس طرح بادشاہ بنا؟
16. داؤدؑ کون تھے؟

17. داؤدؑ کو کس طرح بادشاہت ملی؟
18. داؤدؑ نے یہودیوں کو کیسے متحد کیا؟
19. داؤدؑ نے کونسا اخلاقی گناہ کیا؟
20. داؤدؑ کی حکومت کا زوال کیسے ہوا؟
21. سلیمانؑ کون تھے؟
22. ہیکل سلیمانی کسے کہا جاتا ہے؟
23. سلیمانؑ کو حکیم کیوں کہا جاتا ہے؟
24. عہدِ سلیمانی کو تعمیرات کا دور کیوں کہا جا سکتا ہے؟
25. حرم الحرم سے کیا مراد ہے؟
26. متحدہ اسرائیل کیسے تقسیم ہوا؟
27. شمالی ریاست سے کیا مراد ہے؟
28. جنوبی ریاست سے کیا مراد ہے؟
29. رحبعام کون تھا؟
30. یربعام اول کون تھا؟
31. شمالی ریاست پر قبضہ کیسے ہوا؟
32. یرمیاہؑ کون تھے؟
33. جنوبی ریاست کا زوال کیسے ہوا؟
34. یوسیاہ کے دور میں کیا مذہبی تبدیلیاں وقوع پذیر ہوئیں؟
35. نبوکدنضر کون تھا؟
36. دس گمشدہ قبائل سے کیا مراد ہے؟
37. ہیکل کی پہلی تباہی سے کیا مراد ہے؟
38. جلاوطنی کا زمانہ کسے کہا جاتا ہے؟
39. حزقی ایلؑ کون تھے؟
40. بابلی دور نے یہودیوں کو مذہبی طور پر کیسے متاثر کیا؟
41. بابلی دور میں یہودی کون کون سی مذہبی عبادات کر سکتے تھے؟
42. ہیکل سلیمانی نے یہودیوں کی مذہبی زندگی میں کیا کردار ادا کیا؟
43. یہودیت میں پہلی غلامی سے کیا مراد ہے؟
44. یہودیت میں دوسری غلامی سے کیا مراد ہے؟
45. دانی ایلؑ کون تھے؟
46. سائرس کون تھا؟
47. نبوکدنضر کی حکمرانی کیسے ختم ہوئی؟
48. نوشتہ دیوار سے کیا مراد ہے؟
49. یرمیاہؑ نے بابلی یہودیوں کو کیا ہدایات کیں؟
50. سائرس کو یہودیت میں کیا درجہ حاصل ہے؟
51. سائرس نے یہودیوں کے لیے کیا
52. یہودی مذہب پر فارسی دور کے کیا

حکمت عملی اختیار کی؟
اثرات ہوئے؟

53. عزراؑ کون تھے؟
54. نحمیاہ کون تھے؟
55. ہیکل کی تعمیر نو کب ہوئی؟
56. سکندر کون تھا؟
57. سکندر کے بعد حکمرانی کسے ملی؟
58. غیر ملہم کتب سے کیا مراد ہے؟
59. ہفتادی ترجمہ کسے کہتے ہیں؟
60. جاسون کون تھا؟
61. جاسون نے یونانیت کو کیسے پھیلایا؟
62. انطیوقس چہارم کون تھا؟
63. انطیوقس چہارم نے ہیکل سلیمانی کے تقدس کو کیسے پامال کیا؟
64. مکابی حکمرانوں کے ہاں جبری مذہبی تبدیلیاں کن ادوار میں ہوئیں؟
65. متاتھیاس کون تھا؟
66. مکابی کون تھے؟
67. سیناگاگ سے کیا مراد ہے؟
68. یہودا مکابی نے کیا پالیسی اختیار کی؟
69. یہودیت میں سبت کے دن لڑنا کب جائز ہوا؟
70. پومپے نے یہودیوں سے کیا سلوک کیا؟
71. اسکندریہ کتنا عرصہ حاکم رہی؟
72. اسمونی دور کا خاتمہ کیسے ہوا؟
73. جولیس سیزر نے یہودیوں کے ساتھ کیا سلوک کیا؟
74. ہیروڈ کے دور کو تعمیرات کا دور کیوں کہا جاتا ہے؟
75. ہیروڈ کیسا حاکم تھا؟
76. ہیروڈ کو حکمرانی کیسے ملی؟
77. ہیروڈ کی حکومت کا اختتام کیسے ہوا؟
78. اگرپا کا دورِ حکومت کیسا رہا؟
79. معبدِ ہیروڈ کے بارے میں تلمود کی کیا رائے تھی؟
80. اگرپا کے دورِ حکومت میں امن کیوں نہ قائم ہو سکا؟
81. مسیحی کون تھے؟
82. صنہادرین کون تھے؟
83. مجلسِ صنہادرین کی رکنیت کی شرائط لکھیں۔
84. رومیوں کے خلاف یہودیوں نے کتنی بغاوتیں کیں؟
85. صنہادرین کیا کام کرتے تھے؟
86. ہیکل کی دوسری تباہی کیسے ہوئی؟
87. قالی غلا کے دور میں یہودیوں کی کیا
88. رومی بغاوتوں میں یہودیوں کا کتنا

حالت تھی؟

نقصان ہوا؟

89. ہیڈریان کا یہودیوں سے رویہ کیسا تھا؟

90. یہودیوں میں قومیت پرستی کیسے آئی؟

91. مسیحیت کو عروج کیسے حاصل ہوا؟

92. یوحنا بن ذکائی کس لیے مشہور ہیں؟

93. ربی اکیوا کی وجہ شہرت لکھیں؟

94. ربیائی یہودیت کیا ہے؟

95. ربی کسے کہتے ہیں؟

96. تنائیم کون تھے؟

97. ربی یہوداہناسی کس لیے مشہور ہیں؟

98. تلمود کیا ہے؟

99. بابلی اور فلسطینی تلمود میں کیا فرق ہے؟

100. ربیائی یہودیت کا عروج کیسے ہوا؟

101. مسیحیوں نے یہودیوں کے ساتھ کیا سلوک کیا؟

102. بابلی یہودیوں پر دیگر اقوام کے کیا اثرات تھے؟

103. اردشیر بابکاں کے دور میں یہودیوں کی کیا حالت تھی؟

104. ہیکل کی تباہی نے یہودیت کے ارتقا پر کیا اثرات مرتب کیے؟

تفصیلی سوالات

1. یہودی دورِ خروج پر نوٹ لکھیں۔

2. موسیٰؑ پر نوٹ لکھیں۔

3. یہودیت میں قاضیوں کا دور بیان کریں۔

4. ساؤل کے دور حکومت پر نوٹ لکھیں۔

5. داؤدؑ کے دورِ حکومت پر نوٹ لکھیں۔

6. سلیمانؑ کے دورِ حکومت پر نوٹ لکھیں۔

7. شمالی و جنوبی ریاست کی تباہی پر نوٹ لکھیں۔

8. یہودیت کے تاریخی و مذہبی ارتقا پر نوٹ لکھیں۔

9. یہودیوں کے بابلی اور فارسی دورِ غلامی میں کیا فرق تھا؟

10. مختلف اقوام کی غلامی نے یہودیت پر کیا مذہبی اثرات مرتب کیے؟

11. یہودیت میں ہیلینیت کے عروج پر نوٹ لکھیں۔

12. یہودیت میں مکابی خاندان کی کاوشوں پر نوٹ لکھیں۔

13. مکابیوں کے زوال پر نوٹ لکھیں۔

14. یہودیوں اور مسیحیوں کے درمیان تعلقات پر نوٹ لکھیں۔

15. یروشلم کی دوسری تباہی پر نوٹ

16. یہودیوں کی رومیوں کے خلاف

لکھیں۔ بغاوتوں پر نوٹ لکھیں۔

17. رومی دور کے یہودیوں پر نوٹ لکھیں۔ 18. صنہادرین پر نوٹ لکھیں۔

19. بابلی یہودیت پر نوٹ لکھیں۔

حوالہ جات

[1]خروج 14:3

[2]استثنا 15-14:29

[3]گنتی 13:25

[4]گنتی 13–14

[5]قضاۃ 16:2

[6] Francis E. Gigot, *Outlines of Jewish History: From Abraham to Our Lord* (New York: Benziget Broghers, 1905), 147.

[7]قضاۃ 1:6،1:4،13:1

[8]قضاۃ 24:6

[9]اول سموئیل 15

[10]اوّل سموئیل 26

[11]اوّل سموئیل 4:29

[12]دوم سموئیل 16:7

[13]اول سلاطین 14-11:3

[14]Cohn-Sherbok, *Judaism: History, Belief and Practice*, 45.

[15]اول سلاطین 5:4

[16] Gigot, *Outlines of Jewish History: From Abraham to Our Lord*, 238.

[17]Cohn-Sherbok, *Judaism: History, Belief and Practice*, 58.

[18]دوم سلاطین 25:23

[19]عبدالحلیم شرر، **تاریخ یہود** (لکھنؤ: دلگداز پریس، 1925)، 56۔

[20] Charles Foster Kent, A History of the Jewish People During the Babylonian, Persian, and Greek Periods (New York: Charles Scribners's Sons, 1899), 43.

[21] Charles Foster Kent, *A History of the Jewish People During the Babylonian, Persian, and Greek Periods* (New York: Charles Scribners's Sons, 1899), 37.

[22] دانیال 2:48

[23] عزرا 1:2-3

[24] یسعیاہ 45:1

[25] Charles Foster Kent, *A History of the Jewish People During the Babylonian, Persian, and Greek Periods* (New York: Charles Scribners's Sons, 1899), 256.

[26] Etienne Nodet, *A Search for the Origins of Judaism: From Joshua to the Mishnah*, trans. Ed Crowley (Sheffield: Sheffield Academic Press, 1997), 30.

[27] Kent, *A History of the Jewish People During the Babylonian, Persian, and Greek Periods*, 288.

[28] D. Cassel, *Manual of Jewish History and Literature*, trans. Mrs. Henry Lucas (London: Macmillan, 1913), 44.

[29] Lester L. Grabbe, *An Introduction to Second Temple Judaism: History and Religion of the Jews in the Time of Nehemiah, the Maccabees, Hillel and Jesus* (London: T&T Clark International, 2010), 11.

[30] شرر، تاریخ یہود، 91۔

[31] اول مکابیین 1:33

[32] مکابیین 1:25

[33] مکابیین 1:41

[34] Grabbe, *An Introduction to Second Temple Judaism: History and Religion of the Jews in the Time of Nehemiah, the Maccabees, Hillel and Jesus* 18.

[35] Kiddushin 66a

[36] Stephen M. Wylen, *The Jews in the Time of Jesus: An Introduction* (New York: Paulist Press, 1996), 62.

[37]Grabbe, *An Introduction to Second Temple Judaism: History and Religion of the Jews in the Time of Nehemiah, the Maccabees, Hillel and Jesus* 20.

[38]Wylen, *The Jews in the Time of Jesus: An Introduction*, 69.

[39]Ibid., 70.

[40] Dan Bahat, "The Herodian Temple," in *The Cambridge History of Judaism: The Early Roman Period*, ed. William David Davie and Louis Finkelstein (Cambridge: Cambridge University Press, 2008), 52.

[41] B. Sukkah 51b

[42]Grabbe, *An Introduction to Second Temple Judaism: History and Religion of the Jews in the Time of Nehemiah, the Maccabees, Hillel and Jesus* 24.

[43] Gorge Foot Moore, *Judaism In the First Centuries of the Christian Era: The Age of Tannaim* (Massachusetts: Hendrickson Publishers, Inc., 1960), 82.

[44]Cohn-Sherbok, *Judaism: History, Belief and Practice*, 103.

[45]E. Mary Smallwood, *The Jews under Roman Rule: From Pompey to Diocletian* (Lieden: Brill, 1976), 293.

[46]Paul Johnson, *A History of the Jews* (New York: Harper Peennial 1988), 140.

[47]Sanhedrin.41a

[48]Cohn-Sherbok and Cohn-Sherbok, *A Short History of Judaism*, 41.

[49]Katie Magnus, *Outlines of Jewish History: B.C 586 to C.E 1885* (Londin: Longiaians, Green, and Co., 1886), 76.

[50]Cohn-Sherbok, *Judaism: History, Belief and Practice*, 117.

[51] Hayim Hillel Ben-Sasson, *A History of the Jewish People* (Cambridge: Harvard University Press, 1976), 277.

[52]Cohn-Sherbok, *Judaism: History, Belief and Practice*, 123.

[53]B. Bava Kama 80a

[54]Leo Duprée Sandgren, *Vines Intertwined: A History of Jews and Christians from the Babylonian Exile to the Advent of Islam* (Peabody: Hendrickson Publishers, 2010), 378.

تیسرا باب: عہد اسلامی سے عصر حاضر تک

مسلم دور حکومت کے یہودی

عرب کے ریگستانوں میں جہاں کبھی ابراہیمؑ کے بڑے بیٹے اسماعیلؑ کی قوم جا بسی تھی وہیں 570 عیسوی میں محمد ﷺ کی پیدائش ہوئی۔ ان کے پیروکار انہیں آخری نبی مانتے ہیں اور ان کی لائی ہوئی کتاب، قرآن مجید کو الہامی سمجھتے ہیں۔ مسیحؑ کی طرح ان کی شخصیت بھی بہت اہمیت کی حامل ہے تاہم یہودیت کی اس مختصر تاریخ میں آپؐ سے متعلق انہیں واقعات کو فوقیت دی گئی ہے جو مجموعی طور پر یہودی قوم سے متعلق ہیں۔ یہودیت اور مسیحیت ہی کی طرح آپ ﷺ کے لائے ہوئے مذہب یعنی اسلام نے بھی ایک خدا کی عبادت پر زور دیتے ہوئے شرک سے منع کیا۔ چونکہ یہ مذہب خود کو ملت ابرہیمی سے جوڑتے ہوئے ابراہیمؑ کو مسلمان گردانتا ہے، چنانچہ اس کے لیے یہودی و مسیحی بھی محترم تھے۔ قرآن مجید نے ان کے لیے "اہلِ کتاب" کی اصطلاح تجویز کی۔ مسلمانوں کے تحت یہود کے ایک بڑے طبقے نے مختلف علاقوں میں مجموعی طور پر 638 عیسوی سے لے کر تقریباً 1922 عیسوی تک کا عرصہ گزارا۔

باب سوم کے اہم نکات

1. عہد نبویؐ کے یہودی مسلم تعلقات۔
2. عہد عمر میں یروشلم کی حالت۔
3. عہد عباسی میں یہودیوں کی حالت۔
4. یہودیت کا عہد زریں۔
5. موحدون کا یہودیوں پر جبر۔
6. فاطمی دور کے حالات۔
7. عثمانی دور میں یہودیوں کی خوشحالی۔
8. یورپی یہودیوں کی بے کسی۔
9. سامی مخالفت اور نازی جرمنی۔
10. قیام اسرائیل کے صیہونی اقدام۔
11. عرب اسرائیل کشیدگی۔

عہد نبویؐ

آپ ﷺ کی پیدائش مکہ میں ہوئی جہاں سے وہ اپنے ہم قوموں کے مظالم کی وجہ سے ہجرت کر کے یثرب آ بسے جو بعد میں مدینۃ النبی کے نام سے مشہور ہوا۔ انہوں نے مسلمانوں کو منظم کیا اور یہاں موجود یہودی قبائل سے راہ و رسم بڑھائی۔ ان قبائل کی مدینہ آمد کے متعلق حتمی معلومات ناپید ہیں۔ یہ خیال کیا جاتا ہے کہ نبوکدنضر کے دور میں ہیکل کی پہلی تباہی کے بعد بہت سے یہودی دنیا کے مختلف گوشوں میں

فرار ہو گئے تھے۔ غالباً اسی دور میں یہودی مدینہ میں بھی آ بسے۔ کچھ مصنفین نے یہ بھی لکھا ہے کہ یہاں یہ غلاموں کی صورت میں آئے تھے اور پھر یہیں بستے چلے گئے۔ رومیوں کے مظالم سے تنگ آکر 70 سے 135 عیسوی کے درمیان بھی یہودیوں کے جزیرہ نما عرب آنے کے متعلق اقوال ملتے ہیں۔ بعض روایتیں یہ بھی بتاتی ہیں کہ موسیٰؑ نے عمالقہ سے جنگ کے لیے کچھ یہودی سپاہیوں کو یہاں بھیجا تھا جو بعد میں یہیں مقیم ہوئے۔ دیگر عربوں کی طرح انہوں نے بھی عربی زبان اور رسم ورواج کو اپنا لیا۔[1] لیکن ان کے ہاں مستعمل عربی لہجے میں دیگر عرب قبائل سے مختلف تھی۔ اسے عموماً "یہودی عربی" کہا جاتا ہے۔ عرب ماحول میں یہ یہودی اس قدر رچ بس گئے کہ عربوں کی طرح انہوں نے بھی اپنے مختلف قبائل بنا لیے۔ ان قبائل میں بنو قینقاع، بنو قریظہ اور بنو نضیر کو اپنی تعداد کی وجہ سے خاصی اہمیت حاصل تھی۔

یہاں ان کا ایک بیتِ مدارش بھی موجود تھا جس کی موجودگی اس بات کی عکاس ہے کہ عرب میں بسنے والے یہودیوں کے فلسطینی اور بابلی یہودیوں سے بھی تعلقات تھے اور شاید وہ وہاں تعلیم کے لیے بھی جایا کرتے تھے۔ آپؐ کی مدینہ آمد سے پہلے یہودی قبائل دو گروہوں میں بٹ گئے تھے جن میں آپسی خونریزی عام تھی۔[2] اہلِ کتاب ہونے کے ناطے آپؐ نے یہودیوں کو ایک امت کے طور پر مخاطب کیا۔ چنانچہ یہودی قبائل اور مسلمانوں کے درمیان ایک معاہدہ طے پایا جسے میثاقِ مدینہ کا نام دیا گیا۔ اس معاہدے کی رو سے یہودیوں کو اس شرط پر برابر کے حقوق دیے گئے کہ وہ آپؐ کی حاکمیت تسلیم کرلیں گے اور جنگ کے موقع پر ایک دوسرے کا ساتھ دیں گے۔ بعد میں جب معاہدے کی مختلف شقوں کا پاس نہ کیا گیا تو مسلم یہودی تعلقات بری طرح متاثر ہوئے۔ یہودی مصنفین کے مطابق بنو قریظہ کے تمام مردوں کو سزا کے طور پر محمد ﷺ نے قتل کروا دیا اور بقیہ قبائل کو ایک ایک کر کے جلا وطن کر دیا۔ یہ جلا وطنی 624 اور 625 عیسوی کے درمیان تدریجاً ہوئی۔ کچھ مصنفین نے ایسے واقعات بھی درج کیے ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ اگر کوئی آپؐ کے پاس رحم کی درخواست لے کر آتا تو اس کو امان دی جاتی اور اپنا ساز و سامان سمیٹ کر رخصت ہونے کی مہلت ملتی۔

عہد عمر ابن خطابؓ

آپؐ کے بعد بھی مسلمانوں نے بڑی تیزی سے اپنی مملکت کو وسیع کیا اور دیکھتے ہی دیکھتے

شام، مصر، عراق اور فارس تک کا علاقہ فتح کر لیا۔ مسلمانوں کے دوسرے خلیفہ عمر ابن خطابؓ (عہد 634-644) کے دور میں فتوحات اس قدر تیزی سے ہوئیں کہ لگتا تھا جیسے مسلمان ساری دنیا فتح کر لیں گے۔ ابن خطابؓ کی حکمت عملی یہ تھی کہ اپنے دورِ حکومت میں وہ دیگر مذاہب کے لوگوں سے تعلقات خوشگوار رکھنے کی کوشش کرتے۔ ان کو مذہبی آزادی دیتے، معاشی طور پر مستحکم کرتے اور مختلف علاقوں میں ان کی آمدورفت پر پابندی نہ لگاتے۔

یہودی اس وقت مسیحیوں کے مظالم کے ستائے ہوئے تھے۔ خاص طور پر رومی شہنشاہ ہرکولیس (عہد 610-641) کے دور میں ان کو زبردستی مسیحی بنانے کی کوششیں کی جارہی تھیں۔[3] نتیجتاً بازنطینی ریاست سے تنگ آئے بیشتر یہودیوں نے مسلمانوں کا ساتھ دینے کی ٹھانی۔ 636 عیسوی میں لڑی جانے والی جنگ یرموک میں بازنطینی ریاست کو شکست دے کر عربوں نے فتح حاصل کی۔ اگر یہودی تاریخ کے تناظر میں دیکھا جائے تو مسلمانوں کا 637 عیسوی میں یروشلم کو فتح کرنا یہودیوں کے لیے بھی خصوصی اہمیت کا حامل تھا۔ یہ چونکہ مسلمانوں کے لیے بھی ایک مقدس سرزمین تھی لہذا اس کی تباہی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ تاہم یہ بھی یہودیوں کے پیشِ نظر نہیں تھا کہ وہ مسلم دور میں اس قدر سہولت سے اپنے مذہبی امور جاری رکھ سکیں گے۔ یہ ان کے لیے ایک تاریخی لمحہ تھا جب ابن خطابؓ کے دور میں تقریباً 500 سال بعد ان کو یروشلم میں سکونت کی اجازت ملی۔ انہیں اس بات کی ضمانت دی گئی کہ اگر وہ مقررہ جزیہ ادا کرتے رہیں گے تو ان کی حفاظت کی جائے گی۔ ان کے مدارس، سیناگاگ اور معبد مسمار نہیں کیے جائیں گے۔ وہ اپنے تجارتی و مالی امور میں خود مختار ہوں گے۔ یہودیوں پر ایک بڑی عنایت یہ بھی ہوئی کہ حرم قدسی شریف میں ان کو عبادت کے لیے جگہ فراہم کی گئی۔ حرم قدسی شریف یہودیوں کے لیے ایک نہایت مقدس مقام ہے جہاں ان کے خیال میں بارہا خدا نے اپنی تجلی کی ہے اور یہودی عقیدے کے مطابق یہیں مسیح موعود، ہیکل کو تیسری دفعہ تعمیر کریں گے۔ جس طرح عبرانی بائبل میں سائرس کو یہودیوں پر اس کی عنایات کی وجہ سے مسیح کا درجہ دیا گیا ہے اسی طرح مدراش میں یہودیوں پر مہربانیاں کرنے کی وجہ سے عمرؓ کو "خدا کا دوست" بیان کیا گیا ہے۔[4]

انہوں نے غیر مسلموں سے ایک معاہدہ بھی کیا جسے عقدِ عمر کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

اس معاہدے کے مختلف نسخے ملتے ہیں جن میں تھوڑی بہت تبدیلیاں بھی پائی جاتی ہیں۔ ان نسخوں کا بنیادی پیغام ایک جیسا ہے، مثلاً یہ کہ غیر مسلموں کو جزیے کا پابند بنایا گیا۔ انہیں نئی عبادت گاہیں تعمیر کرنے سے منع کیا گیا۔ خاص لباس پہننے کی ہدایت کی گئی تاکہ ان کی شناخت بآسانی ہو سکے۔ انہیں مسلمانوں کے لیے کھڑے ہونے کا حکم دیا گیا۔ مسلمانوں کو شراب اور دیگر ایسی چیزیں جو شریعتِ اسلامی میں حرام تھیں فروخت کرنے سے منع کیا گیا۔ مسلمان غلام یا باندی رکھنے کی ممانعت کی گئی۔ گھڑ سواری سے روکا گیا۔ اپنے گھر مسلمانوں سے اونچے بنانے کی اجازت نہ دی گئی اور نہ ہی انہیں اس بات کا حق دیا گیا کہ وہ سرکاری طور پر کسی ایسے عہدے کے لیے نامزد ہوں جس سے ان کی مسلمانوں پر اجارہ داری قائم ہوتی ہو۔

عمر ابن خطابؓ کے بعد آنے والے اموی حکمرانوں کے دور میں بھی یہودیوں کے متعلق کم و بیش انہیں احکامات پر عمل کیا گیا جو پہلے سے رائج تھے۔ ان کے بدلے میں یہودیوں کو ریاستی حقوق دیے گئے۔ ان کی حفاظت ذمہ لی گئی اور ان کو مذہبی آزادی دی گئی۔ جو پابندیاں عقدِ عمر کے ذریعے ذمیوں یعنی اسلامی ریاست میں رہنے والے غیر مسلموں پر لگیں، بعد میں آنے والے حکمرانوں نے بھی ان پر زیادہ سختی سے عمل درآمد نہیں کیا۔ چنانچہ یہ ایک قسم کی علامتی پابندیاں بن کر رہ گئیں۔ ایسے متعدد شواہد دستیاب ہیں جن سے علم ہوتا ہے کہ تاریخی طور پر ایسا بہت کم ہوا کہ درج بالا شقوں کو عملی طور پر لاگو کیا گیا ہو۔ اموی خلفاء کے دور میں غیر مسلموں بشمول یہودیوں نے اپنی عبادت گاہیں بھی تعمیر کیں اور بہت سے مسلم حکمرانوں نے انہیں سرکاری عہدوں پر بھی بٹھایا جہاں مسلمان ان کے زیرِ نگرانی کام کرتے۔[5] اس دور میں یہودی تجارت کو فروغ حاصل ہوا اور وہ معاشی طور پر خوشحال ہوتے چلے گئے۔ اموی حکمرانوں کی ان رعایات سے پتہ چلتا ہے کہ عقدِ عمر کی پابندیاں اس لیے لگائی جاتی تھیں کہ غیر مسلم کسی قسم کی بغاوت نہ کریں۔ جب غیر مسلم امن سے رہتے تو یہ پابندیاں بھی عملی طور پر رائج نہ کی جاتیں تھیں۔

یہودیوں کو سرکاری عہدے دینے کے متعلق بعض یہودی مؤرخین کا خیال ہے کہ غیر مسلموں کو حکومتی ذمہ داریاں دینا اس لیے بھی ضروری تھا کیونکہ وہ مسلمانوں سے زیادہ ان معاملات میں تجربہ رکھتے تھے اور علاقے کے مزاج کو بہتر جانتے تھے۔[6] اس سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ مسلمانوں کا مقصد علاقے کے مکینوں کو معاشی اور معاشرتی ترقی کی راہ پر گامزن کرنا تھا۔

چنانچہ اس دور میں ایک لمبے عرصے کے بعد یہودیوں کی زندگی میں امن لوٹا۔ مسلمانوں کی یہ خواہش تھی کہ یہودی و مسیحی، محمد ﷺ کے لائے ہوئے مذہب کو قبول کرلیں تاہم انہوں نے جبر سے کام نہیں لیا۔ اگر کوئی ایسا واقعہ ہوا بھی ہوگا تو وہ انفرادی تھا۔ اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ قرآن نے مسلمانوں کو یہ واضح طور پر بتادیا تھا کہ "دین میں جبر نہیں۔"[7] اسی وجہ سے مجموعی طور پر مسلم دور میں یہودی، مسیحی دور کی نسبت زیادہ بہتر زندگی گزار رہے تھے۔[8] ارد گرد بسنے والے یہودیوں نے بھی اس تازہ ہوا کے جھونکے کو محسوس کرلیا تھا۔ یہودی مصنفین نے یہاں تک لکھا ہے کہ بیشتر جنگوں میں یہودیوں نے مسلمانوں کا ساتھ دیا۔ شاید دیہیا کاہنہ (وفات 703) وہ واحد ملکہ تھی جس نے مسلمانوں کے خلاف مزاحمت کی۔ اس کے متعلق خیال کیا جاتا ہے کہ وہ ایک یہودیہ تھی جسے عرب جرنیل موسیٰ بن نصیر (640-716) نے شکست دے کر نومیدیا کا علاقہ فتح کیا تھا۔[9]

عباسی دور

بہت جلد مسلمانوں کے آپسی اختلافات شروع ہوگئے اور امویوں کو 750 میں عباسیوں کے ہاتھوں شکست ہوئی جنہوں نے دارالخلافہ دمشق سے بغداد منتقل کردیا۔ بابلی یہودیوں کے لیے یہ خوش قسمتی کا زمانہ تھا۔ ان کے راسِ/رئیس جالوت کے درجے کو سرکاری سرپرستی حاصل ہوئی۔ یہ درجہ ایک مدت سے یہودی، داؤدؑ کے گھرانے کے فرد کو دیا کرتے تھے جو ایک طرح سے ان کے معاشرتی معاملات دیکھا کرتا۔ راسِ جالوت بابل اور ایران میں پروان چڑھنے والی یہودیت کا نمائندہ تھا۔ مسلمانوں نے از سر نو اس عہدے کو یہودیوں میں رائج کردیا۔ یہاں انہیں میں سے سرکاری طور پر گاون بھی منتخب کیا جانے لگا جو ان کا مذہبی و روحانی پیشوا ہوتا۔ ربیائی یہودیت میں گاؤنیم کو تنائیم اور آمورائیم کے جانشین سمجھا جاتا ہے۔ یہاں یہ وضاحت بھی ضروری ہے کہ تمام یہودیوں نے گاؤنیم کی حاکمیت تسلیم نہیں کی تھی۔ اس میں بطورِ خاص قرائٹ/قرائت کا ذکر کیا جاتا ہے جو ایک راسخ العقیدہ یہودی فرقہ تھا۔ قرائٹ عبرانی لفظ "قرا" سے نکلا ہے جس کا لفظی مطلب "پڑھنا" ہے۔ ربیائی یہودیت کے برعکس ان کا خیال تھا کہ موسیٰؑ کو کوہ سینا پر صرف لکھی ہوئی توریت ملی تھی۔ زبانی توریت جیسی کسی چیز کا وجود نہیں ہے۔ اس لیے مشنا اور تلمود ان کے نزدیک کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتیں۔ اسی وجہ سے وہ ربیائی یہودیت

کے تحت ہونے والے مذہبی ارتقا کی بھی مذمت کرتے تھے۔ قرائٹ نے زیادہ تر مصر اور گرد و نواح میں رواج پایا۔

اموی دور میں گاؤنیم نے توریت، تلمود اور ہلاخلا (یہودی قانون) کی تعلیم کو عام کیا۔ اگر کسی فقہی مسئلے پر کوئی فتوی موجود نہ ہوتا تو گاؤنیم ہی اس مسئلے کا کوئی حل تجویز کرتے۔ انہوں نے اس دور میں ملی مذہبی آزادی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے بابل/عراق کے مختلف شہروں میں بنے مشہور یہودی مدارس کو بغداد منتقل کر لیا جو اس وقت علم و دانش کی آماجگاہ تھی۔[10] سلطنت کے مختلف گوشوں میں مقیم زیادہ تر یہودیوں کے پاس گاؤنیم کی صورت میں اپنا مذہبی پیشوا آ گیا تھا جس سے وہ مذہبی معلومات بھی حاصل کر سکتے تھے اور ضرورت پڑنے پر مدارس کی ترویج کے لیے رقومات بھی بھیج سکتے تھے۔ نتیجتاً دیکھتے ہی دیکھتے اسلامی سلطنت کے طول و عرض پر یہودی مدارس کا ایک جال بچھ گیا۔

عباسی دور کی ایک اہم یادگار یونانی، فارسی، سنسکرت اور سریانی زبانوں سے عربی ترجمے کی تحریک تھی جسے حکومتی سرپرستی حاصل تھی۔ ہارون الرشید (766-809) اور اس کے بیٹے مامون الرشید (786-833) نے بیت الحکمت جیسی عظیم الشان لائبریری قائم کی جہاں دنیا بھر سے محققین اور متلاشیانِ علم و فن اکٹھے ہوتے۔ مامون نے اس ادارے کی معاشی مراعات میں بے پناہ اضافہ کیا۔ عقیدے اور مذہب سے ماورا ہو کر قابل علما و محققین کو یہاں جمع کیا گیا۔ اس ادبی ماحول نے بہت سے یہودی عالموں اور فلسفیوں کو جنم دیا۔ ان میں یہودی فلسفی، قانون دان اور مفسر، سعید بن یوسف الفیومی/سعدیا گاؤن (892-942) کا نام بطورِ خاص لیا جاتا ہے جنہوں نے **کتاب الامانات والاعتقادات** لکھ کر یہودی الہیات کو عقلی بنیادیں فراہم کیں، عبرانی بائیبل کا عربی ترجمہ کیا، یہودی قانون کو ترقی دی اور یہودی کیلنڈر کو مستحکم کیا۔

اموی سپین

عہد فاروقی اور عباسی میں یہودیوں کو وافر سہولیات میسر رہیں تاہم انہیں دورِ عروج اندلس/سپین نے مہیا کیا۔ اموی تقریبا 711 عیسوی میں اندلس میں داخل ہوئے اور اپنی سلطنت قائم کی۔ عصر حاضر میں نظر آنے والے یہودی تہذیب و ثقافت کے اجلے پہلو اسی دور کی یادگار ہیں۔ یہاں بسنے والے یہودی سفاردی یہودی کہلاتے تھے جو عبرانی بائیبل میں درج ایک

جگہ کا نام ہے۔[11] بعض محققین کا خیال ہے چونکہ عبرانی میں آئیبیریا کے بعض علاقے کو سفاردیہ کہا جاتا تھا لہذا بعد میں جب یہ علاقہ سپین یا اندلس کے نام سے مشہور ہوا تو یہاں کے یہودی سفاردی کہلائے جانے لگے۔ سفاردی یہاں کب آئے اس کے متعلق وثوق سے کچھ کہنا دشوار ہے۔ بعض روایات کے مطابق یہ لوگ یہاں سلیمانؑ کے دور سے مقیم تھے۔ انہوں نے اپنے دور میں محصول جمع کرنے کے لیے کسی کو بھیجا تھا جو بعد میں یہیں آباد ہوا۔ بعض واقعات سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ بابلی اور رومی دور میں یہودی یہاں آکر آباد ہونا شروع ہوئے۔[12] پہلے پہل ان کی آبادی یہاں کم تھی۔ بعد میں جب مسلمانوں نے اقلیتوں کو نوازنا شروع کیا تو تقریباً نوے فیصد یہودی اسلامی سلطنت میں بس گئے۔

عبدالرحمن دوم (822-852) کے دور میں اندلس نے ترقی کی منازل تیزی سے طے کرنا شروع کیں۔ اس کے دور کو مذہبی رواداری اور برداشت کا دور کہا جاتا ہے۔ اس کے حسن انتظام نے اندلس کو یورپ کا سب سے منظم ملک بنادیا۔ اس کے بعد اس کے جانشینوں نے بھی اپنے اجداد کی روایات کی پاسداری کی، ملک میں امن قائم کیا اور تجارت کو فروغ دے کر اہلِ وطن کو خوشحال کیا۔ اس دور کے یہودیوں کی تحریروں سے پتہ چلتا ہے کہ وہ اسے امن و سلامتی کا دور گردانتے تھے۔[13] عبدالرحمن سوئم (عہد 929-961) کے دور میں یہودیوں نے مسلمانوں کے ساتھ مل کر اندلس کو علمی لحاظ سے مالامال کر دیا۔ اندلس میں مقیم یہودی ثقافتی لحاظ سے مسلمانوں کے طور طریقے اپنائے ہوئے تھے۔ ان کے نام، رہن سہن، زبان اور لباس تک مسلمانوں جیسا تھا۔ البتہ اپنے مذہب، تاریخ اور قومی شناخت میں وہ مسلمانوں سے مختلف تھے۔ انہوں نے عبرانی گرائمر کو ترقی دی اور یہودی مدارس کا انتظام بہتر کیا۔ بے شمار تراجم کے علاوہ ان کی اپنی تحریروں کی بھی ایک اچھی خاصی تعداد اس دور میں سامنے آئی۔ کہا جاتا ہے علمی لحاظ سے یہ دور اس قدر شاندار تھا کہ صرف قرطبہ ہی کی لائبریری چار لاکھ کتب سے مزین تھی۔[14] جب معاشی و معاشرتی سکون نصیب ہوا تو مسلمانوں ہی کی طرح یہودیوں نے بھی علم کی تلاش میں دور دراز کے سفر کیے۔ یہ قیروان کی درسگاہیں تھیں یا بغداد کے یشیوا ہر جگہ یہودی آنے جانے لگے۔

دسویں صدی عیسوی کا اختتام یہودیوں کے لیے اور بھی پُرسکون تھا۔ انہیں اتحاد نصیب

ہوا اور ایک طویل عرصے بعد مجموعی طور پر ان کی بے کسی، بد حالی اور غربت کا خاتمہ ہوا۔ وہ دولت و حشمت، تہذیب و ثقافت اور علم و فضیلت میں دنیا کے بڑوں میں شمار کیے جانے لگے۔[15] وہ آزادانہ اپنے علمی مشاغل جاری رکھ سکتے تھے اور تقریباً ہر شعبہ ہائے زندگی کو اختیار کرنے کے لیے آزاد تھے۔ یہاں سفاردیوں کی ایک بڑی تعداد کپڑے، چمڑے، زراعت اور تجارت کے شعبوں سے منسلک تھی۔ اس دور نے ایک بڑی تعداد میں یہودی عالم، ادیب اور طبیب پیدا کیے۔ ان کی حالت "ہر طرح سے بہتر ہوئی اور وہ ستائے ہوؤں سے محفوظ اقلیت" بنتے چلے گئے۔[16]

مسلم سپین یہودی ثقافت پر احسان بن کر ابھرا۔ اس دور نے انہیں کاؤلا الیہودی (685-718) جیسا جرنیل، ابراہیم بن یعقوب (پیدائش 912) جیسا تاجر، موسیٰ بن حنوخ (وفات 965) جیسا معلم، حسدائی بن شپروط (915-970) جیسا سفیر، اسماعیل النغریلۃ (993-1056) جیسا زبان دان، اسحاق بن البالیہ (1035-1094) جیسا ریاضی دان، ابن حصدائی (1050-1093) جیسا وزیر، موسیٰ بن عزرا (پیدائش تقریباً 1055) جیسا شاعر، یہودا ابن ساؤل (پیدائش 1120) جیسا مترجم، یوسف ابن مغاش (1077) جیسا عالم اور موسیٰ ابن میمون (1138-1204) جیسا فلسفی عطا کیا۔ یہ نام ان ہزاروں میں سے چند ایک یہودیوں کے ہیں جنہوں نے علم و فن میں اپنا لوہا منوایا۔ اس دور کی ترقی و خوشحالی کو دلیل بناتے ہوئے بعض یہودی مصنفین اندلسی یہودیوں کے اس دور کو ان کا عہد زریں سمجھتے ہیں۔ بعض اسے عہد زریں کہنے سے گریز کرتے ہیں اور یہ تاثر دیتے ہیں کہ یہ دور دیگر ادوار سے قدرے بہتر تھا جس میں یہود نسبتاً خوشحالی کی زندگی بسر کرتے رہے۔ ایک تیسری رائے یہ بھی ہے کہ یہ دور بھی دیگر ادوار کی طرح یہودیوں کے لیے بے کسی و عسرت کا دور تھا۔ تاہم اس تیسری رائے کے حامیوں کی تعداد آٹے میں نمک برابر ہے۔

مرابطی دور

اموی سلطنت کے کمزور ہونے سے طوائف الملوکی کا دور دورہ ہوا۔ سلطنت مختلف گروہوں میں بٹ گئی جنہیں طائفہ کہا جاتا تھا۔ ایک ایک کر کے صلیبیوں نے سپین کے مختلف علاقوں پر قبضہ کرنا شروع کر دیا۔ صلیبیوں نے مراعات کا وعدہ کر کے بعض بااثر یہودیوں کو بھی اپنے ساتھ ملا لیا۔ کمزور سلطنت کو بچانے کے لیے امویوں نے یوسف بن تاشفین (1009-

1106) کو مراکش سے بلایا تاکہ صلیبیوں سے نبرد آزما ہوا جا سکے جس نے گیارہویں صدی عیسوی میں قرطبہ میں مرابطی حکومت قائم کی۔ مرابطیوں کے زیرِ تسلط بعض علاقوں میں ان کا یہودیوں سے رویہ دوستانہ تھا۔ یہودی بطور سپاہی، سفیر اور طبیب ان کے ساتھ کام کرتے رہے۔[17] دیگر اسپینی علاقوں میں ان کو متشدد گروہ سمجھا جاتا تھا۔ بعض مصنفین کے مطابق انہوں نے یہودیوں کو جبری اسلام قبول کرنے کا کہا تاکہ فدیے کے نام سے ان سے زرِ کثیر حاصل کر سکیں۔ اس وقت وہاں یہودیوں اور مسیحیوں کی اچھی خاصی تعداد آباد تھی لیکن ان کی سختی کے نتیجے میں یہودیوں اور مسیحیوں نے سپین کے ان حصوں کا رخ کیا جو صلیبیوں کے زیر تسلط تھا۔[18] اس ضمن میں موسیٰ ابن عزرا جو ایک مشہور شاعر تھا اور جس نے اموی سپین کا عروج دیکھ رکھا تھا، اپنی پریشانی بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے: "میں غرناطہ، جس کی تابناکی رخصت ہو رہی ہے، میں مقیم ہوں، ایک راہ گزرتے مسافر کی طرح، ایک چڑیا کی طرح جو اپنے گھونسلے سے نکال دی گئی ہو، ایک پرندے کی طرح جو شہر بدر اور آوارہ ہو؛ اور ایسے لوگوں میں جو گمراہ اور بگڑے ہوئے ہیں، یہاں میرے لیے کوئی پناہ نہیں ہے؛ یہاں کوئی نہیں ہے جو مجھے یاد کرے اور میری خبر گیری کرے۔"[19] چونکہ اس کے بھائی اسے چھوڑ کر صلیبی سپین جا بسے تھے لہذا اپنے کلام میں وہ اپنے بھائیوں، حکمرانوں اور اپنی حالت پر نوحہ کناں ہے۔

ایک نظریہ اس ضمن میں یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ مسیحیوں کو اپنے فتح کردہ علاقوں میں آبادکاری کے لیے افرادی قوت درکار تھی تو انہوں نے یہودیوں کو بہتر رہائش، ملازمت اور کاروبار کے مواقع فراہم کرنا شروع کر دیے۔ چنانچہ یہود نے معاشی خوشحالی کے لیے بھی صلیبی علاقوں کا سفر کیا۔ مسلم علاقوں میں بھی بعد ازاں حالات بہتر ہو گئے اور ایک دفعہ پھر یہودی خوشحال زندگی بسر کرنے لگے۔ ان کی نئی نسلوں نے بطور ربی، شاعر، فلسفی اور مفسرین اپنے علم و ہنر کا لوہا منوانا شروع کر دیا۔

موحدون کا دور

سپین کے پرسکون دور میں ایک ہلچل موحدون کی اندلس آمد سے ہوئی جو بارہویں صدی کے وسط میں افریقہ سے یہاں حملہ آور ہوئے۔ انہوں نے نہ صرف مرابطیوں کی حکومت ختم کی بلکہ مسلمانوں کی آپسی لڑائیوں کی وجہ سے یہاں سے اٹھنے والی مسیحی بغاوتوں کو بھی کچلا۔ ان کے

بارے میں کہا جاتا ہے کہ انہوں نے اسلام پھیلانے میں شدت اختیار کی اور اقلیتوں سے سختی برتی جس کے نتیجے میں کچھ غیر مسلمین یورپ منتقل ہونے لگے۔ بعض مصنفین نے یہ بھی بیان کیا ہے کہ جو غیر مسلم یہاں موجود تھے ان کو اسلام قبول کرنے پر مجبور کیا گیا۔ یشیوا و سیناگاگ مقفل کروا دیے گئے اور مذہبی آزادی قصہ پارینہ بنی۔[20] البتہ تیسرے خلیفہ یعقوب المنصور (عہد 1184-1199) کے دور میں یہودیوں کو راحت نصیب ہوئی۔ مسلمانوں کی آپسی خانہ جنگیوں نے نہ صرف خود انہیں زوال کا شکار کیا بلکہ سلطنت میں رہنے والی اقلیتوں کو بھی ناقابلِ تلافی نقصان پہنچایا۔ موحدون کے دور کا مطلب اگرچہ اندلسی یہودیوں کا اختتام نہیں تھا لیکن اس دور نے ان کے عہد زریں کو سبوتاژ کر دیا۔

فاطمی دور

علی ابن طالبؓ، محمد ﷺ کے داماد اور مسلمانوں کے چوتھے خلیفہ تھے۔ وہ مسلمان جو محمد ﷺ کے بعد علیؓ کی امامت کے قائل تھے، تاریخِ اسلامی میں شیعہ کے نام سے موسوم ہوئے۔ شیعہ عصر حاضر میں بھی مسلمانوں کا دوسرا بڑا فرقہ ہے۔ عباسیوں کے خلاف انہوں نے تقریباً 909 عیسوی میں افریقیہ جسے مغرب الادنی بھی کہا جاتا ہے، میں فاطمی دور کا آغاز کیا۔ فاطمی کا لفظ فاطمہؓ سے لیا گیا ہے جو محمد ﷺ کی صاحبزادی اور علیؓ کی اہلیہ تھیں۔ 969 عیسوی میں فاطمیوں نے پہلے مصر اور پھر فلسطین فتح کیا۔ یہاں فاطمی خود بھی اقلیت تھے کیونکہ ان کے مقابلے میں اہل سنت کی صورت میں مسلمانوں کا ایک بڑا فرقہ موجود تھا۔ نتیجتاً فاطمیوں کے لیے ان علاقوں پر اپنا تسلط جمائے رکھنا ایک مشکل مرحلہ تھا۔ انہیں ان علاقوں میں بسنے والے غیر مسلموں سے زیادہ اپنے مسلم بھائیوں سے خطرہ محسوس ہوا۔ اس لیے انہوں نے یہ حکمت عملی اختیار کی کہ سرکاری عہدوں پر غیر مسلموں کو تعینات کرنا شروع کر دیا۔ اس لحاظ سے فاطمی دور بھی یہودیوں کے لیے خوشگوار دور تھا۔ بعض مؤرخین نے یہ بھی لکھا ہے کہ غیر مسلم اس دور میں سرکاری عہدوں پر تعینات کیے گئے تاہم انہیں اہم عہدوں پر نہیں رکھا گیا۔ یہودیوں میں بھی زیادہ تر عہدے قرائٹ فرقے کو دیے گئے جو ربیائی یہودیت کے مخالف تھا۔[21] یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس دور میں یہودیوں کی نسبت مسیحیوں کو زیادہ نوازا گیا۔ البتہ یہودیوں کو بنیادی شہری حقوق اور مذہبی آزادی حاصل رہی۔ فاطمیوں نے عقدِ عمر کی شقوں کو لاگو نہیں کیا اور ذمیوں

کے جزیہ میں نمایاں کمی کی۔ان کے دور میں اقلیتوں کو عبادت گاہوں کی تعمیر ومرمت کی آزادی تھی۔ بعض اوقات یہودی مدارس کے لیے فاطمی، معاشی مدد بھی مہیا کرتے تھے۔[22]

تقریباً 12000 سے 20000 کے لگ بھگ یہودی اس وقت مصر میں مقیم تھے۔[23] ان میں رئیس الیہود کی آسامی کے لیے "نجِد" کا سرکاری عہدہ تھا۔ نجد ایک طرح سے ریاست میں بسنے والے تمام یہودیوں کا حاکم ہوتا تھا۔ یہ انہیں سزائیں بھی دے سکتا تھا اور اور پابندِ سلاسل بھی کر سکتا تھا۔ پوری ریاست میں یہودی قاضیوں کی تعیناتی بھی نجد ہی کے ذمہ تھی۔ نجد کا عہدہ زیادہ تر ایسے یہودیوں کو ملا جو خلیفہ کے طبیب کے طور پر کام کر چکے تھے، مثلاً جب اندلس پر موحدون کی حکمرانی تھی تو ابن میمون وہاں سے فرار ہو کر مصر آ گئے۔ اپنی قابلیت کی وجہ سے وہ خلیفہ کے طبیب مقرر ہوئے۔ ان کی وفات کے بعد نجد کا عہدہ ان کی اولاد ہی کو دیا جاتا رہا۔

یہودی اسلامی ادوار میں

1. عہد نبوی	2. عہد اموی
3. عہد عباسی	4. اموی سپین
5. مرابطی دور	6. عہد موحدون
7. فاطمی دور	8. ایوبی دور
9. مملوک دور	10 عثمانی دور

فاطمی عہد میں الحاکم (985-1021) کا دور یہودیوں سمیت دیگر مذہبی اقلیتوں کے لیے کٹھن تھا۔ غیر مسلموں کے ساتھ ساتھ اہل سنت بھی اس کے عتاب کا شکار ہوئے۔ وہ بار بار اپنے فیصلے بدلنے کے لیے مشہور تھا جس کی وجہ سے اسے مجنون بھی کہا جاتا تھا۔ اس نے ابتدائی چند سال تو ذمیوں سے جزیہ لے کر ان کو ضروری حقوق مہیا کیے لیکن بعد میں بے جا سختیاں شروع کر دیں۔ یہودیوں پر لازم کیا کہ وہ پیلے رنگ کے لباس پہنیں اور گلے میں لکڑی کا بچھڑا لٹکائیں تاکہ ان کی شناخت ہو سکے۔ اس پر طرہ یہ کے انہیں مجبور کیا گیا کہ یا تو شیعیت اپنا لیں یا ملک چھوڑ کر کہیں اور جا بسیں۔ کچھ عرصہ بعد اس نے یہ بھی اعلان کروا دیا کہ جتنے لوگ اپنا مذہب چھوڑ کر مسلمان ہوئے ہیں وہ دوبارہ اپنے پرانے مذہب کو اختیار کر سکتے ہیں۔[24] اس کے بعد آنے والے خلفا نے رواداری کو اپنایا اور یہودیوں نے سکون کا سانس لیا۔ 1061 عیسوی میں حکومت پر فاطمیوں کی گرفت کمزور پڑ گئی لیکن یہودیوں کو اس سے کوئی خاص نقصان نہیں پہنچا۔ بحیثیت مجموعی انہوں نے معاشی طور پر خاصی ترقی کی۔ فاطمیوں نے

تجارت کو فروغ دیتے ہوئے اسے ہندوستان سے خلیج فارس اور بحیرہ احمر تک پھیلا دیا۔ یہودی تاجروں کو آزادی دی گئی اور ان پر کوئی اضافی بار لاگو نہیں کیا گیا۔

ایوبی دور

یہودیوں کے لیے بڑا دھچکا 1099 عیسوی میں فلسطین پر صلیبیوں کی فتح تھی۔ انہوں نے یہودیوں کو فلسطین سے بے دخل کر دیا۔[25] اس بے دخلی کی مدت خاصی طویل تھی۔ تقریباً 88 سال تک وہ دوبارہ یروشلم مقیم نہیں ہو سکے۔ بعد میں جب مشہور مسلم جرنیل، صلاح الدین ایوبی (1138-1193) نے 1187 عیسوی میں یروشلم فتح کیا اور ایوبی سلطنت کی بنیاد رکھی تو انہیں یروشلم دیکھنے کی سہولت میسر ہوئی۔ ایوبی نے بھی عقدِ عمر کی شرائط کو لاگو کیا اور اقلیتوں کو مذہبی آزادی دی۔ اس کے دور کو بھی امن و سلامتی کا دور سمجھا جاتا ہے۔ اسی کے ہاتھوں 1171 عیسوی میں فاطمی دور کا اختتام بھی ہوا۔ ایوبی سلطنت میں بھی یہودیوں کو پھلنے پھولنے کے مواقع ملے۔ وہ تجارت، طب اور دستکاری جیسے شعبوں میں آزادانہ کام کرتے رہے۔ ایوبی حکمرانوں کو اپنے دور میں صلیبیوں سے بار بار جنگوں کا سامنا کرنا پڑا۔ چونکہ یہ خود سنی تھے اس لیے ان کی فاطمیوں سے بھی آئے دن جنگیں ہوتی رہتی تھیں۔ پھر بھی جنگ و جدل کے اس دور میں بھی ثقافتی ترقی اور اقلیتوں کا تحفظ ان کی ترجیحات میں شامل رہا۔

مملوک دور

مملوک بھی مسلمانوں کا ایک گروہ تھا جو پہلے عباسیوں کے سپاہیوں کے طور پر سرکاری ملازم تھے۔ رفتہ رفتہ انہوں نے اپنی طاقت کو بڑھایا اور ایک وقت ایسا آیا جب انہوں نے ایک زبردست سلطنت قائم کر لی۔ خاص طور پر مصر پر ان کی پکڑ خاصی مضبوط تھی جس کی مدت 1250 سے 1517 عیسوی تک رہی۔ انہوں نے منگولوں کے حملوں کو روکا، ہندوستان میں حکومت قائم کی اور صلیبیوں کا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ قبطی مسیحی، مصر میں بطور اقلیت رہ رہے تھے اور مملوکوں کو مسیحیوں کے خلاف ہی صلیبی جنگیں لڑنی پڑ رہی تھیں۔ اس کا اثر ان کے مزاج پر گہرا تھا۔ انہوں نے اپنی سلطنت میں بسنے والی اقلیتوں سے بھی سخت رویہ اختیار کرنا شروع کر دیا۔ مشہور مملوک فرمانروا، سیف الدین قلاوون (1222-1290) نے عقدِ عمر کی سختیوں کو عملی طور پر رواج دیا۔ اس نے ذمیوں کو سرکاری عہدوں کے لیے نااہل قرار دیا۔ بعد ازاں، اس

کے جانشینوں نے بھی یہی روش اپنائے رکھی۔[26]

تیرہویں صدی تک البتہ یہودیوں کے علمی مشاغل آزادانہ جاری رہے۔ چودہویں صدی اقلیتوں کے لیے مزید دشواریاں لائی۔ حکومت نے تجارت کے لیے کارمی تاجروں کو مخصوص کر لیا تھا اور یہودی جو زیادہ تر انفرادی تجارت کرتے تھے معاشی طور پر کمزور ہوتے چلے گئے۔ معاشرتی حالات بھی کچھ سازگار نہیں تھے۔ غیر مسلموں پر بازاروں میں حملے ہونے لگے جس کی وجہ سے معاشرے میں بے چینی پھیلی۔ مملوکوں کے داخلی معاملات بھی درست نہیں تھے۔ ان کی اندرونی لڑائیاں حکومت کو کمزور کرتی رہیں۔ سیف الدین برقوق (1339-1399) اور اسکے بیٹے کا دور یہودیوں کے لیے کچھ آسائشیں لایا لیکن بعد میں پھر انہیں عقدِ عمر کی شرائط پر عمل درآمد کرنا پڑا۔ البتہ ان میں نجد کا عہدہ ختم نہیں کیا گیا جس کی وجہ سے یہودی کچھ نہ کچھ مراعات حاصل کرنے میں کامیاب رہتے۔

بعض مصنفین نے یہ بھی لکھا ہے کہ حالات کی خرابی میں یہودی خود بھی ذمہ دار تھے، مثلاً تقریباً پندرہویں صدی کے وسط کے ایک واقعے سے پتہ چلتا ہے کہ ربیائی یہودیت کی ایک سیناگاگ میں توہینِ اسلام کا ارتکاب کیا گیا۔ سیناگاگ میں ایک ایسا منبر ملا جس کی سیڑھیوں پر "محمد" اور "احمد" لکھا ہوا تھا۔[27] اس کا مطلب تھا جو کوئی بھی منبر پر چڑھتا وہ ان ناموں پر پاؤں رکھ کر اوپر پہنچتا تھا۔ مسلمانوں کے لیے یہ ایک بڑا مذہبی دھچکا تھا جس کے نتیجے میں سیناگاگ کا منبر تباہ کر دیا گیا اور بعد میں ریاست بھر میں ذمیوں کی عبادت گاہوں کی نگرانی کی جانے لگی جس سے اقلیتوں کے درمیان بے چینی پھیلی۔ انہیں اس بات کا پابند کیا گیا کہ اب نہ صرف وہ نئی عبادت گاہوں کی تعمیر نہیں کریں گے بلکہ پرانی عبادت گاہوں کی مرمت بھی نہیں کر سکیں گے۔ مملوک دور کا اختتام خلاف عثمانیہ کے قیام کے ساتھ عمل میں آیا۔

خلافت عثمانیہ

چودہویں صدی عیسوی کے آغاز میں عثمان اول (عہد 1299-1326) کی سربراہی میں مغربی اناطولیہ / ایشیائے کوچک مسلمانوں نے فتح کیا۔ عثمانیوں نے 1453 عیسوی میں بازنطینی ریاست کا خاتمہ کر کے قسطنطنیہ کو بھی اپنی سلطنت میں شامل کر لیا۔ 1517 عیسوی میں مملوکوں کو شکست دے کر مصر کو بھی اپنی ریاست میں شامل کر لیا۔ سولہویں صدی کے آغاز میں

مستحکم ہونے والی یہ سلطنت، غرب میں آبنائے جبرالٹر، مشرق میں بحیرۂ قزوین اور خلیج فارس اور شمال میں آسٹریا کی سرحدوں، سلوواکیہ اور کریمیا سے جنوب میں سوڈان، صومالیہ اور یمن تک پھیلی ہوئی تھی۔ باج گزار علاقوں کے علاوہ اس کے 29 صوبے تھے۔

عثمانیوں کا سب سے پہلا سابقہ "رومانیوٹ" یہودیوں سے پڑا جو نسلاً یونانی تھے۔ یہ لوگ رومی عہد سے یہاں آباد تھے۔ انہیں یورپ میں بسنے والے قدیم ترین یہودی بھی سمجھا جاتا ہے۔ بعد ازاں عثمانیوں کی حاکمیت میں نہ صرف سفاردی بلکہ "اشکنازی" یہودی بھی آئے۔ اشکنازی وہ یہودی تھے جو رومی دور میں یورپ کے مختلف علاقوں کی طرف ہجرت کر گئے تھے۔ ان کی زیادہ تر تعداد یورپ میں مقیم رہی۔ اس کے علاوہ یہاں مارانو یہودیوں کی اچھی خاصی تعداد بھی آباد ہوئی۔ سپین اور پرتگال میں بسنے والے یہودی مارانو کہلاتے تھے۔ قرون وسطی میں ان کو مسیحی زبردستی اپنا مذہب چھوڑنے پر مجبور کرتے تھے۔ چنانچہ یہ لوگ خفیہ طور پر یہودیت کی پیروی کیا کرتے۔ اسی لیے انہیں "مخفی/پوشیدہ یہودی" بھی کہا جاتا تھا۔

عثمانی، مذہبی رواداری کے لحاظ سے منفرد تھے۔ انہوں نے اپنے دور میں غیر مسلموں کو خاصی رعایات دیں۔ یہودیوں کو یہاں تقریباً اول درجے کے شہریوں کے حقوق حاصل تھے۔ یہ کوئی بھی کاروبار کر سکتے تھے، زمین خرید سکتے تھے اور مذہبی طور پر جیسے چاہتے رہ سکتے تھے۔[28] یہاں یہودیوں کے ہاں مختلف زبانیں رواج پائیں۔ وہ ہسپانوی کا ایک یہودی لہجہ، عربی، یونانی، آرامی اور ترکی زبانیں استعمال کرتے تھے۔ ان میں سے ترکی زبان سرکاری معاملات کے لیے استعمال ہوتی اور دیگر زبانیں ان کے مذہبی و سماجی تعلقات میں مستعمل تھیں۔ عثمانیوں کی دی گئی آسانیوں کے پیش نظر ارد گرد کے علاقوں سے سمٹ کر بہت سے یہودی ان کی سلطنت میں آباد ہونے لگے۔ محمد ثانی (1432-1481) نے جب قسطنطنیہ کو دارالخلافہ نامزد کیا تو یہاں آبادی بہت کم تھی۔ اس نے ارد گرد کے لوگوں کو یہاں لا کر بسانا شروع کیا۔ یہودیوں کے لیے یہ بات خوش آئند تھی۔ بہت سے ماہرِ فن یہودی یہاں آکر آباد ہوئے۔ دیگر علاقوں میں بسنے والے یہودیوں کو جب عثمانیوں کی مذہبی رواداری کا علم ہوا تو انہوں نے بھی قسطنطنیہ کو اپنا مسکن بنایا۔ خاص طور پر پندرہویں صدی کے اختتام پر صلیبیوں کے ظلم و ستم سے تنگ آئے ہوئے یہودیوں کی ایک بڑی تعداد یہاں مقیم ہوئی۔[29] بلقان، یونان، قاہرہ اور دمشق میں یہودیوں کی خاصی بڑی

آبادیاں تھیں۔ سب سے بڑے یہودی ربی کو "حاخامباشی" کا سرکاری عہدہ دیا جاتا تھا اور یہ اس کے ذمے ہوتا کہ وہ یہودیوں سے متعلق جملہ امور کی نگرانی کرے۔ جیسے جیسے سلطنت وسیع ہوتی گئی ویسے ویسے یہودی بھی خوشحال ہوتے چلے گئے۔ اس لحاظ سے یہاں بھی یہودیت کا ایک عہد زریں آیا لیکن یہ عہد یہودی تاریخی کتب میں زیادہ نمایاں نہیں ہو سکا۔

سولہویں صدی میں سفاردیوں نے سپین اور پرتگال ہی کی طرز پر سلطنت عثمانیہ میں سماجی طور پر خود کو منظم کر لیا۔ سفاردی یہاں دیگر یہودی گروہوں کی نسبت زیادہ بارسوخ تھے۔ محصول جمع کرنے کے لیے بھی لوگ انہیں میں سے منتخب کیے جاتے تھے جنہیں سرکاری سرپرستی حاصل ہوتی۔ انہوں نے نئی عبادت گاہیں، سکول، عدالتیں اور مطبع قائم کیے جہاں سے مختلف زبانوں میں عبرانی بائیبل کے تراجم اور دیگر مقدس کتب شائع کی جاتیں۔ ان کو چونکہ قومی و معاشرتی طور پر اپنے مذہب کے مطابق رہنے کا حق دے دیا گیا تھا لہذا انہوں نے اس موقع سے بھرپور فائدہ اٹھایا۔ یہاں کی یہودی روایت خاصی اہمیت کی حامل تھی۔ یہودی نہ صرف زبان وادب کو فروغ دے رہے تھے بلکہ پرانی کتب کو بھی نئی طرز پر شائع کر رہے تھے۔ یہیں یہودی قانون کو وسعت دی گئی اور کچھ فلسفیانہ تحریریں بھی شائع کی جانے لگیں۔

یہ لوگ طبیب، تاجر، سوداگر اور سرکاری ملازمین کے طور پر کام کرنے کے لیے آزاد تھے۔[30] غریب ترین یہودی بھی صاف ستھرے لباس اور بہترین غذا کھاتے دکھائی دیتے۔ روز مرہ کی زندگی بھرپور انداز سے گزاری جارہی تھی جس میں جشن، مزاح اور قہقے لگتے نظر آتے، مذہبی گیت گائے جاتے، اور چھوٹی بڑی خوشیوں کو اہتمام سے منایا جاتا۔ بہت سے مذہبی گروہ یہاں اکٹھے رہ رہے تھے لیکن فرقہ واریت اور مذہبی تشدد مفقود تھا۔[31] البتہ سترہویں صدی کے مشہور یہودی شاعر بابائی بن لطف کی **کتابِ انوسی** شاہ عباس (1571-1629) کے دور میں ایران کے اندر مسلمانوں کے ہاتھوں یہودیوں پر ظلم و ستم اور جبری قبول اسلام کے واقعات کا پتہ دیتی ہے۔ بعض مصنفین نے مسیحی بچوں کی پرورش اور عثمانی فوج میں ان کی بھرتی کو جبری قبول اسلام سے جوڑا ہے۔ یہودیوں کی نسبت ایسا کوئی واقعہ بھی کم ہی ملتا ہے۔ یہودی اثر ورسوخ جب بڑھا تو آہستہ آہستہ ان کا ذمیوں کا درجہ بھی ختم ہو گیا اور وہ سلطنت کے دیگر شہریوں جیسے حقوق حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ سیاسی استحکام نے انہیں حکومتی اور نجی اداروں میں اعلی

عہدوں تک پہنچایا۔[32] سلطنت میں ان کی آمد و رفت پر پابندی نہیں تھی۔اس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے انہوں نے اپنے تجارتی مراکز قائم کیے جن کا دائرہ کار یورپ، ہندوستان اور ایران تک پھیلا ہوا تھا۔

عثمانیہ خلافت میں یہودی روحانیات کو بھی عروج حاصل ہوا۔جب فلسطین پر عثمانیوں کی حکومت تھی تو بہت سے یہودی فلسطین کے ایک شہر صفد میں آ کر بسنے لگے تھے جن میں کئی نامور یہودی ربی بھی شامل تھے۔ مشہور یہودی عالم یوسف کارو(1575-1488) جنہیں **شولحان عاروخ** کا مصنف سمجھا جاتا ہے وہ بھی اسی دور میں صفد آئے۔ **شولحان عاروخ** آج بھی راسخ العقیدہ یہودیوں کے نزدیک مستند قانون کی حیثیت رکھتی ہے۔1560 کی دہائی میں صفد میں 1800 کے قریب یہودی گھرانے آباد تھے۔ صفد ہی کے قریب مرون نامی شہر ہے جہاں یہ خیال کیا جاتا ہے

مشرق قریب کی یہودی آبادی		
ملک	1917	1947
عراق	85,000	125,000
مصر	60,000	66,000
شام	35,000	35,000
یمن	45,000	54,000
ایران	75,000	90,000
ترکی	100,000	80,000

کہ دوسری صدی عیسوی کے ایک یہودی ربی شمعون باریوحائی دفن ہیں۔انہیں ربی عقیبہ بن یوسف کا شاگرد سمجھا جاتا ہے جو مشہور تنائیم اور روحانی شخصیت تھے۔ باریوحائی کے متعلق خیال کیا جاتا ہے کہ انہوں نے **زوہر** تصنیف کی جو توریت کی روحانی تشریحات پر مبنی کتب کا مجموعہ ہے۔**زوہر** کو یہودی روحانی فکر یعنی قبالہ کی بنیاد مانا جاتا ہے۔ چنانچہ ان کی اور دیگر یہودی بزرگوں کے مزاروں کی نسبت سے صفد، یہودی روحانیت کا مرکز بن گیا۔[33] اس طرح یہ کہا جاسکتا ہے کہ عثمانی دور خلافت نے نامور یہودی صوفیا کو جنم دیا جن میں اسحاق لوریا(1572-1537)، موسی بن یعقوب(1570-1522) اور ابراہیم بن الیعزرر(وفات تقریباً1528) جیسے نام شامل تھے۔ خلافت عثمانیہ کے زوال نے سلطنت کے دیگر باشندوں کی طرح یہودیوں کو بھی نقصان پہنچایا۔ جنگ عظیم اول(1918-1914) میں بہت سے یہودی مصر منتقل ہو گئے۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق مصر میں یہودیوں کی کل آبادی اس وقت 59،581 تھی جن

میں سے 29،207 صرف قاہرہ ہی میں مقیم تھے۔[34] جب 1920 میں مصطفیٰ کمال (1881-1938) نے ترکی کا انتظام سنبھالا تب تک 81،500 یہودی صرف قسطنطنیہ جسے اب استنبول کہا جاتا ہے میں مقیم تھے۔[35] بعد ازاں، یہودیوں کی ایک بڑی تعداد نے امریکا اور اسرائیل نقل مکانی کر لی جس کے ساتھ ہی ان پر مسلم حکمرانی کا دور بھی ختم ہوا۔

یہودی ثقافت پر مسلم اثرات

مسلم تہذیب کا ایک گہرا اثر یہودیوں پر پڑا۔ یہودی ثقافت، رہن سہن اور مقدس کتب بھی مسلم دور سے متاثر ہوئیں۔ یہودیوں نے عبرانی بائیبل کے عربی تراجم مسلم دور میں کیے۔ عبرانی لکھنے کے لیے عربی حروف تہجی استعمال کی جانے لگی۔ عبرانی الفاظ کے معنی اخذ کرنے کے لیے عربی الفاظ سے مدد لی گئی۔ ان میں بہت سے نامور عربی دان پیدا ہوئے جنھوں نے عربوں کے ہاں رائج شعری اصناف سخن اور موضوعات کو اپنایا۔ اس دور کی یہودی کتب اپنے اسما اور مشمولات میں مسلم ثقافت کی نمائندہ بنیں۔ مسلمانوں کے ہاں رائج کلامی، تفسیری اور فقہی مباحث کی طرز پر یہودیت کی تشریحات کی گئیں۔ عباسی دور کے اہم یہودی فلسفی سعدیا گاون نے علم الکلام پر اپنے کام کی وجہ سے خاصی شہرت پائی۔ یہودی تاریخ اس بات کی عکاس ہے کہ یہ قوم بارہا شرک کی مرتکب ہوئی۔ یہاں تک کے عبرانی بائیبل کے مطابق ان کے انبیا بھی شرک میں مبتلا ہوئے۔ اس کے برعکس مسلمانوں میں رہ کر یہودیوں میں توحید کے عقیدے کو استحکام ملا۔ اپنی فلسفیانہ تحریروں میں متکلمین سے لیے گئے اثرات کے علاوہ ابن میمون نے یہودی عقیدے کے جو تیرہ اساسی اصول مرتب کیے ہیں ان میں توحید کے اثبات پر خصوصی توجہ دی ہے۔ اسی طرح یہودی روحانیت پر مسلم تصوف کا اثر رہا۔ بہیہ بن باکودا (1050-1120) ایک مشہور یہودی عالم، فلسفی اور ربی ہیں۔ انہوں نے **الہدایہ الی فرائض القلوب** ٹھیک اسی طرز پر لکھی جس طرز پر مسلمانوں کے ہاں تصوف کی کتب لکھی جاتی ہیں۔

یورپی یہودیوں کی زندگی

مسلمانوں کے اندرونی اختلافات نے ان کی حکومت کو رفتہ رفتہ کمزور کر دیا۔ ان کے بارے میں یہ بات صادق آتی ہے کہ یہ حکومت حاصل تو کر لیتے ہیں لیکن اسے اپنے قبضے میں

رکھنے کے اہل نہیں بن پاتے۔ جس دور میں یہودیوں کی بڑی بڑی آبادیاں مصر، فلسطین اور سلطنت عثمانیہ میں مسلمانوں کے ساتھ رہ رہی تھیں اسی دور میں بہت سے یہودی، یورپ کے مختلف علاقوں میں مسیحیوں کے درمیان آباد تھے جن کو اشکنازی یہودی کہا جاتا تھا۔ دونوں جگہ بسنے والے یہودیوں کے مذہبی عقائد تو ایک جیسے تھے لیکن ان میں ثقافتی و تہذیبی لحاظ سے کافی فرق تھا۔ صلیبی جنگوں میں مختلف علاقے وقفوں وقفوں سے مسلمانوں اور مسیحیوں کے قبضوں میں آتے رہے۔ بعد میں مسلمانوں کو شکست ہوئی۔ 1099 عیسوی میں مسیحیوں نے یروشلم پر قبضہ کر لیا اور 1492 عیسوی میں اندلس پر مکمل فتح حاصل کر لی۔

صلیبی سپین کے یہودی باسی

سامی مخالفت کی شروعات اگرچہ پہلے رومی بادشاہ کے مسیحیت اختیار کرنے سے ہو چکی تھی تاہم صلیبی دور نے اس مخالفت کو نئی روح بخشی۔ صلیبیوں کے سپین پر پوری طرح قابض ہونے تک یہودی معاشی طور پر خوشحال تھے اور اپنے علمی کام جاری رکھے ہوئے تھے۔ ابتدا میں صلیبیوں نے بھی بڑی حد تک رواداری کا ثبوت دیا۔ استرداد میں انہیں یہودیوں کی مدد کی ضرورت تھی۔ دوسرے قشتیلی حکمران، الفانسو ششم (1040-1199) کی فوج میں چالیس ہزار یہودی ملازم تھے۔ الفانسو نہم (1171-1230) کے دور میں انہیں سرکاری عہدوں پر بطور طبیب اور وزیر خزانہ تعینات کیا جاتا رہا۔[36] ہینری دوئم (1334-1379) کے برعکس اس کے سوتیلے بھائی پیٹر عادل (1334-1369) کا رویہ بھی یہودیوں سے اچھا تھا۔ ہینری نے جب یہودیوں کے خلاف مہم شروع کی اور زبردستی ان کے مذہب تبدیل کروانے لگا تو پیٹر نے اس کی راہ روکی۔ بعد میں جب ہینری بادشاہ بنا تو اس نے یہودیوں کے خون سے ہولی کھیلی۔ اس ضمن میں یہ بھی خیال کیا جاتا ہے کہ ہینری کی یہود دشمنی صرف بادشاہت کے لیے تھی۔ بادشاہت حاصل کرنے کے بعد اس کا رویہ یہودیوں سے بدل گیا۔ البتہ پیٹر کو خود اس نے اپنے ہاتھوں سے قتل کیا جس پر خوش ہو کر کیتھولک مسیحیوں کے سب سے بڑے روحانی پیشوا یعنی پاپائے وقت نے کہا: "کلیسا کو یہودیوں اور موروں (مسلمانانِ اندلس) کے ہمدرد، ایک غاصب کی موت پر مسرور ہونا چاہیے۔"[37] طلیطلہ جیسا آباد شہر قحط کی صورت پیش کرنے لگا جس کی نذر 8،000 یہودی ہوئے اور بچنے والے زندگی کی جمع پونجی خراج ادا کرنے میں لٹاتے رہے۔

ہینری کو اس بات کا ذمہ دار سمجھا جاتا ہے کہ تخت کے حصول کے لیے جو طریقہ اس نے اپنایا اس سے عوام میں یہودیوں کے خلاف نفرت بڑھی جس سے سامی مخالفت میں اضافہ ہوا۔

چودہویں صدی کے آخر تک آراگون اور قشتالہ میں بسنے والی بہت سی یہودی آبادیوں کا قتل عام ہوتا رہا۔ بربریت کا یہ عالم تھا کہ سال بھر ہی میں 50،000 یہودیوں کو تہ تیغ کر دیا گیا۔ سیناگاگ مسمار کی گئیں اور یہودی عبادات پر پابندی لگنے لگی۔ اب یہودیوں کے پاس اس کشت و خون سے بچنے کا ایک ہی راستہ تھا کہ وہ مسیحیت اختیار کر لیں۔ ظلم و ستم سے تنگ آئے ہزاروں یہودیوں نے 1391 عیسوی میں مسیحیت اختیار کر لی۔ باقی ماندہ بے بسی کی زندگی گزارنے پر مجبور کیے گئے جن سے نفرت کرنا اب مسیحیوں میں عام تھا۔ بہت سے ایسے یہودی بھی تھے جنہوں نے جان بچانے کے لیے مسیحیت اختیار کی لیکن بعد میں چوری چھپے یہودیت کی پیروی کرتے پائے گئے۔ ایسے یہودیوں کے لیے "مارانو" کی اصطلاح استعمال کی جانے لگی۔ جو یہودی اس "جرم" کے مرتکب پائے جاتے انہیں نذرآتش کر دیا جاتا۔[38] ان جبری مذہبی تبدیلیوں نے معاملات کو مزید بگاڑ دیا۔ وہ یہودی جو حال ہی میں مسیحی بنے تھے، مسیحیت سے اپنی وفاداریاں ظاہر کرنے کے لیے اپنے یہودی بھائیوں کو قتل کرنے لگے۔ اس سے یہ ظاہر کرنا مقصد تھا کہ وہ "حقیقت" میں مسیحی بن گئے ہیں۔ اس کے بدلے میں انہیں اپنے تجارتی امور اور آزادانہ کاروبار کرنے کا پروانہ مل جاتا۔ ملکہ ازابیلا اول (1451-1504) اور فرنانڈو دوئم (1452-1516) کی شادی نے قشتالہ اور آراگون کی ریاستوں کو متحد کر دیا۔ یہ اتحاد یہودیوں کی پریشانیوں میں مزید اضافے کا سبب بنا۔ 1480 عیسوی میں یہودیوں کی مسیحیت کو جاننے کے لیے پوری ریاست میں باقاعدہ ادارہ جاتی نظام بنایا گیا۔ آخر کار 1492 عیسوی میں یہودیوں کو ریاست سے بے دخلی کا حکم دے دیا گیا۔[39] ان کو چند ماہ کی مہلت دی گئی کہ وہ اپنا کاروبار سمیٹ لیں تاہم وہ دولت سلطنت سے باہر نہیں بھیج سکتے تھے۔

جلاوطنی کے ساتھ ہی سپین میں 1500 سالہ یہودی روایت کا اختتام ہو گیا۔ کہا جاتا ہے کہ صلیبیوں کے دور میں تقریباً 300،000 یہودیوں کو زبردستی مسیحی بنایا گیا، 50،000 کو جلاوطن کیا گیا اور بقیہ کو قتل کر دیا گیا۔ یہ تاریخ کی عجب ستم ظریفی ہے کہ سپین ہی نے انہیں عہد زریں بخشا اور سپین ہی نے انہیں کرب اور بے بسی کی موت سے دوچار کیا۔ اپنے اختتامی دور میں

سپینی یہودیوں کے پاس صرف تین راستے تھے: مسیحیت اختیار کریں، جلاوطن ہوں یا مرنے کے لیے تیار ہو جائیں۔ جو مفلوک الحال تھے اور اپنے سفر کا انتظام نہیں کر سکتے تھے انہوں نے بے بسی اور بدحالی کا وہ دور دیکھا جو شاید کبھی ان کے وہم و گمان میں بھی نہ رہا ہو۔ البتہ بعض مصنفین نے یہ ضرور لکھا ہے کہ اس دور کے جو یہودی ملک بدر ہونے کو تیار تھے انہیں سرکاری حفاظت مہیا کی گئی۔ سپین سے نکلنے والے ایک لاکھ سے زائد یہودی پرتگال میں مقیم ہوئے اور پچاس ہزار نے بربری اور ترکی میں پناہ لی۔ پرتگال میں ابتدا میں ان کے ساتھ سلوک بہتر تھا۔ انہیں یہاں ٹھہرنے کی اجازت دی گئی۔ البتہ جب مہاجرین کی تعداد بڑھی تو یہاں بھی ان پر ہر طرح کے مظالم شروع ہو گئے۔ انہیں زبردستی مسیحیت اختیار کرنے کے لیے مجبور کیا جانے لگا۔ بہت سے یہودیوں نے ظاہری طور پر مسیحیت اختیار کر لی لیکن درپردہ یہودیت کو اپنائے رکھا۔ دیگر علاقوں میں بھی ان کا حال بہتر نہ تھا۔ ترکی وہ واحد ملک تھا جس نے یہودیوں کو کھلے دل سے خوش آمدید کہا اور ضروریات زندگی کی فراہمی میں ان کی مدد کی۔[40]

دیگر ممالک میں یہودی زندگی

یورپ کے دیگر علاقوں میں بھی یہودیوں کے ساتھ بدترین سلوک کیا جارہا تھا۔ اس میں مزید اضافہ اس وقت ہوا جب 1350 عیسوی کے ارد گرد طاعون کی ایک وبا یورپ میں پھیل گئی۔ سترہ سال جاری رہنے والی اس وبا کو "سیاہ موت" کے نام سے یاد کیا گیا جس کی نذر یورپ کی دو تہائی آبادی ہو گئی۔ اس کا الزام بھی یہودیوں پر عائد کیا جانے لگا کہ انہوں نے کنوؤں کو زہریلا کر دیا ہے جہاں سے یہ وبا پھیل رہی ہے۔ بہت سے یہودیوں کو ایذارسانی کا نشانہ بنا کر ان سے اس امر کا اعتراف کرایا گیا اور اس اعتراف کو عوام میں پھیلا دیا گیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے جرمنی، فرانس، سپین اور بیلجیم سمیت کئی ممالک میں یہودیوں کا قتل عام ہونے لگا۔ بات یہاں تک بڑھ گئی کہ پوپ کلیمنٹ ششم (1291-1352) کو یہودیوں کے حق میں ایک حکم نامہ جاری کرنا پڑا۔[41] تاہم سامی مخالفت یورپ میں اس نہج پر پہنچ چکی تھی کہ مسیحیوں پر اس حکم نامے کا بھی خاص اثر نہیں ہوا اور یہودی بدستور ایذارسانی کا شکار ہوتے رہے۔ فرانس ہی میں وہ ہولناک واقعہ پیش آیا جسے محاکمہ تلمود/مناظرہ پیرس کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس واقعے کا بنیادی کردار نکولس ڈونین نامی ایک یہودی تھا جس نے مسیحیت اختیار کرنے کے بعد تلمود کے کچھ حصوں کے تراجم

کر کے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ تلمود میں مسیحؑ اور ان کی والدہ مریمؑ کے متعلق گستاخانہ مواد شامل ہے۔ یہودیوں کو اس ضمن میں قصوروار ٹھہراتے ہوئے 1242 میں یہودی مقدس کتب کے ہزاروں قلمی نسخوں کو نذر آتش کر دیا گیا۔ اس واقعے نے یہود مخالفت نظریات کو مزید فروغ دیا۔

اسی اثنا میں ایک کہانی اور چل نکلی کہ یہودی اپنی عبادات میں مسیحی بچوں کی قربانی دیتے ہیں اور ان کا گوشت کھاتے ہیں۔ یورپ میں اگرچہ جادوٹونا اور وچ کرافٹ عام تھا اور ہو سکتا ہے کچھ یہودی بھی اس میں ملوث رہے ہوں تاہم یہودیت میں ایسی کوئی عبادت نہیں ہے جس میں ایسا غیر انسانی فعل روا رکھا گیا ہو۔ یہ کہانی یہودیوں کے لیے بادِ سموم بن گئی۔ سنگدلی کا یہ عالم تھا کہ شک کی بنا پر پوری پوری یہودی آبادیوں کو عبرت ناک موت سے دوچار کیا جانے لگا۔ ان کے لیے عفریت اور شیطان جیسے الفاظ عام ہونے لگے۔[42] اگر کہیں یہودی بدلہ لینے کی کوشش کرتے تو ایک ایک مسیحی کے بدلے پچاس پچاس یہودیوں کو قتل کیا جاتا۔ یہ موت اس قدر ہولناک ہوتی کہ ڈر کے مارے بہت سے یہودی خودکشی کر لیتے، مثلاً موت کا ایک طریقہ تو ان کو بھوک پیاس سے سسکا سسکا کر مارنا تھا اور دوسرا یہ کہ ان کو بھوکے کتوں کے ساتھ بھرے بازار میں الٹا لٹکا دیا جاتا تاکہ کتے ان کا جسم نوچ نوچ کر کھا جائیں۔ یورپ میں بسنے والے اشکنازی یہودیوں میں خودکشی کو مذہبی درجہ حاصل ہو گیا تھا۔ سفاردیوں کے برعکس، جو یہ سمجھتے تھے کہ جان بچانے کے لیے دکھاوے کے طور پر مذہب بدلنا جائز ہے، اشکنازی خودکشی کو ترجیح دیتے تھے۔ یہ ایک طرح سے ان کی "شہادت" ہوتی۔

جرمنی

جرمنی پُر تشدد واقعات کے لیے خصوصیت کے ساتھ مشہور ہوا۔ وہاں یہودیوں کو بھوکا مارنا، زبردستی مذہب تبدیل کروانا، اذیتیں دینا اور کاروبار سے بے دخل کرنا عام سی باتیں تھیں۔ یہودیوں کو قتل کرنے کے لیے یہ بہانہ کافی ہوتا تھا کہ ان کے آباؤاجداد نے مسیحؑ کو مصلوب کیا تھا۔ مارٹن لوتھر (1483-1546) کی پروٹسٹنٹ تحریک نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔ اس کے متعلق یہودی مصنفین کا خیال ہے کہ ابتدا میں تو وہ اس بات پر مطمئن تھا کہ یہودی اس کی لائی ہوئی مسیحیت قبول کر لیں گے لیکن بعد میں جب اس نے دیکھا کہ ایسا نہیں ہو رہا تو اس نے اپنی

مشہور زمانہ کتاب **یہودیوں اور ان کے جھوٹوں پر** تصنیف کی۔ اس کوشش سے یہود پر مزید تباہی آئی۔ بہت سی سیناگاگ نذر آتش ہوئیں، توریت کے نسخے جلائے گئے، عبادات کی کتب کو دفن کیا گیا اور ربیوں کی تبلیغ کو جرم کا درجہ دے دیا گیا۔ لوتھر کی وفات کے بعد بھی یہ سلسلہ نہ رکا اور اس کے حامیوں نے بھی یہودیوں کو مذہبی بنیادوں پر ستانا جاری رکھا۔

یورپ کے بیشتر علاقوں میں انہیں بڑی مسیحی آبادیوں کے ساتھ رہنے کی اجازت نہیں تھی۔ وہ اقلیتی محلے جنہیں گھیٹو کہا جاتا تھا میں رہنے پر مجبور تھے۔ ان محلوں میں ایک چھوٹے سے گھر میں پندرہ پندرہ لوگ آباد ہوتے۔ جگہ اتنی تنگ تھی کہ سورج کی روشنی پہنچ نہ پاتی اور گھریلو کام کاج کا انتظام باہر سڑکوں پر کرنا پڑتا۔[43] ایسا بھی ہوتا رات کو سونے کے لیے جگہ بنانے میں دشواری کی وجہ سے گھر کا سامان باہر نکال دینا پڑتا۔ محدود تعداد میں شادیوں کی اجازت تھی جن کے لئے بھی اضافی محصول دینا پڑتا۔ بعض علاقوں میں ایک سے زائد بچوں کی قانونی ممانعت کر دی جاتی۔ کبھی انہیں بادشاہ کے شکار کیے ہوئے جنگلی سور خریدنے کا پابند کیا جاتا تو کبھی گورنمنٹ کی لگائی فیکٹریوں کا ناکارہ سامان۔ ان کے لیے ضروری ہوتا کہ وہ ایک مخصوص طرز کے کپڑے پہنیں اور سینے پر ایک امتیازی نشان ثبت کریں جس سے ان کے یہودی ہونے کا پتہ چلتا رہے۔[44] سترہویں صدی ان میں سے چند کے لیے آسائشیں لائی۔ مالی معاملات میں ماہر لوگوں کے لیے "درباری یہودی" کا ایک عہدہ نکالا گیا جن کا کام لوگوں کو سود دینا اور لینا تھا۔ مسیحی اس کام کے لیے اس لیے تیار نہیں ہوئے کیونکہ مذہبی طور پر وہ سود کے خلاف تھے۔ اس کے برعکس مشنا کے مطابق یہودیوں کے ہاں غیر اقوام سے سود لینا اور دینا جائز تھا۔[45] لہذا درباری کے عہدے نے کچھ یہودیوں کو تحفظ دیا۔ باقی ماندہ اسی بدحالی کا شکار رہے۔

پالینڈ

پالینڈ میں انہیں کسی قدر تحفظ حاصل تھا۔ ابتدائی حکمرانوں کی روایت کو زندہ رکھتے ہوئے کازیمر سوم (1310-1370) نے بھی یہودیوں کو سہولتیں دیں۔ اس نے جس وقت حکومت سنبھالی، سلطنت زبوں حالی کا شکار تھی۔ اس کی حکمت عملیوں نے زوال آمادہ ریاست کو مضبوط کیا۔ یہودیوں کی ایک بڑی تعداد کو ریاست میں جگہ دی گئی۔ پالینڈ میں یہودی مالی امور، زراعت اور تجارت سمیت بہت سے شعبوں سے منسلک تھے۔ یہاں بھی ان پر اکثر و بیشتر حملے

ہوتے رہتے۔ انہیں بچوں کے قاتل کے طور پر پہچانا جاتا اور مخصوص لباس پہننا پڑتا۔ ان تمام مشکلات کے باوجود انہوں نے اپنے علمی کام جاری رکھے۔ سولہویں صدی کا پالینڈ بھی مذہبی طور پر یہودیوں کے لیے بہتر رہا۔ یہاں تلمودی روایت کو مضبوط کیا گیا، یہودی قانون کو ترقی ملی اور مدارس نے فروغ پایا۔ سترہویں صدی میں قازق کسانوں کی جانب سے ہونے والی بغاوتوں میں یہودیوں کا قتل عام ہوا۔ بعد میں جب قازقوں اور حکومت کے درمیان صلح ہوئی اور یوکرین کو تقسیم کر دیا گیا تو روسی حکومت نے بھی قازقوں کی طرح، یہودیوں کو اپنی زمینوں پر رہنے کی اجازت نہیں دی اور کشت وخون کا بازار گرم کیے رکھا۔ اس قتلِ عام میں تقریباً ایک چوتھائی یہودی لقمہ اجل بنے۔[46]

لتھوینیا

وہ یہودی جو لتھوینیا میں مقیم تھے بہتر حالوں تھے۔ انہیں علاقوں میں ربیائی یہودیت نے بھی فروغ پایا۔ لیتھووینیا ہی میں مشہور یہودی ربی اور ماہرِ تلمود ویلنا گون(1720-1797) نے اپنا وسیع حلقہ تعلیم و تعلم قائم کیا اور تلمود، **زوہر** اور **شولحان عاروخ** سمیت کئی اہم یہودی کتب کی تشریحات لکھیں۔ وہ خود ایک قبالی اور ربی تھے اس لیے جب حسیدیت کا اثر و رسوخ قائم ہونے لگا تو انہوں نے اس تحریک کی مخالفت کی۔ لتھوینیا میں یہود کی اچھی خاصی تعداد آباد تھی جن کی سینکڑوں سیناگاگ اور یشیوا یہاں کام کر رہے تھے۔ تاہم مرگ انبوہ/ ہالوکاسٹ کے دوران یہاں ہونے والے قتل عام نے یہاں پھلنے پھولنے والی یہودیت کا خاتمہ کر دیا۔

ہالینڈ

ہالینڈ میں اگرچہ یہودیوں کو مکمل شہری حقوق حاصل نہیں ہوئے پھر بھی یہاں بسنے والے یہودی دیگر یورپی علاقوں سے نسبتاً بہتر حالوں تھے۔ سترہویں صدی میں یہاں اشکنازی اور مارانو یہودیوں کی کافی آبادیاں تھیں۔ کل ملا کر ان کی تعداد 10،000 کے قریب تھی۔ یہ لوگ زیادہ تر تجارت، کاروبار اور مالی امور سے متعلقہ شعبوں سے منسلک تھے۔ جب معاشی آسودگی اور معاشرتی سکون ملا تو یہودیوں نے اپنے علمی و ادبی جوہر بھی دکھائے۔ ڈرامہ، روحانیت، مذہب اور شاعری سمیت بہت سے موضوعات پر کتابیں سامنے آنے لگیں۔ اسی

طرح کی صورتحال اس دوران برطانیہ میں بھی تھی جہاں کی حکومت اقلیتوں کے مذہبی معاملات میں زیادہ دخیل نہیں تھی۔

اٹلی

ابتدا کے اٹلی میں یہودی یورپ کے دیگر علاقوں کی نسبت بہتر زندگی گزار رہے تھے۔ یہاں ان پر ٹیکس کی مد میں اضافی بار بھی لاگو نہیں کیا گیا۔ یہودیوں نے بھی خود کو اچھا شہری ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہوئے ملکی معاملات میں غیر ضروری مداخلت نہیں کی۔ وہ زیادہ تر تجارتی ومالی معاملات سے متعلق شعبوں سے منسلک تھے۔ ان کے مسیحیوں سے تعلقات بھی بہتر تھے اور بعض اوقات یہ ایک دوسرے کے تہواروں میں بھی شریک ہوتے۔[47] بعد ازاں ان پر یہاں بھی ظلم وستم کے پہاڑ ٹوٹے جس کی وجہ سے بیشتر یہودیوں کی یہاں سے فرار ہوتے ہی بنی۔ پوپ پیوس ہفتم (1742-1923) کا دوران کے لیے اذیت کا دور تھا۔ ان کو ملازمتوں سے بے دخل کیا گیا، زبردستی مسیحیت کی طرف لے جایا گیا اور گھیٹو تک محدود کر دیا گیا۔

یہودی نشاۃ ثانیہ

جرمنی میں یہودیوں نے بدترین وقت بھی گزارا اور اسی ملک نے انہیں موسی مینڈلزن (1729-1786) جیسا مصلح اور فلسفی بھی عطا کیا جس نے اسپنوزا (1632-1677) کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے اپنی قوم کو روشن خیالی سے متعارف کروایا۔ یہودیوں کی تاریخ میں تین موسی آئے جو ان کو مذہب کی جدید روایت سے آراستہ کر گئے۔ ان میں سب سے پہلے تو موسیٰؑ تھے جنہوں نے مصریوں کی چار سو سالہ غلامی سے نجات دلوا کر انہیں شریعت عطا کی، دوسرے موسی ابن میمون تھے جنہوں نے ان کے عقیدے کو فلسفی و عقلی بنیادیں فراہم کیں اور تیسرا نام موسی مینڈلزن کا ہے جنہوں نے ان کی نشاۃ ثانیہ کی بنیادیں رکھیں۔ اپنے بھائیوں کو جدید خطوط پر استوار کرنے کے لیے مینڈلزن نے توریت کا جرمن زبان میں ترجمہ کیا، رسمی تعلیم کے فروغ کے لیے درسگاہیں بنائیں جہاں انہیں مفت تعلیم دی جاتی اور جرمن ہسکالا (روشن خیال کی تحریک) کو مضبوط بنیادیں فراہم کیں۔ انہوں نے یہودیوں کو جرمن زبان سیکھنے پر آمادہ کیا اور ان کے شہری حقوق کے لیے کوششیں کیں۔ افرائیم لسینگ (1729-1781) اور کرسچن ولہیلم ڈوہم (1751-1820) جیسے مسیحی مفکرین کو آمادہ کیا کہ وہ یہودیوں کو زبوں حالی سے نکالنے

کے لیے مدد کریں۔ یہودیوں نے رسمی تعلیم پر توجہ کی اور جرمن زبان سیکھ کر معاشرے میں اپنا مقام بنانے لگے۔ مینڈلزن کی کوششوں سے جرمن یہودیوں کی زندگیاں تو بہتر ہوئیں لیکن ان میں سے بہتوں نے اپنے مذہب کو بھی خیر آباد کہہ دیا۔ ایسا کرنے والوں میں اس کے اپنے بچے بھی شامل تھے[48] مینڈلزن کے بعد ہسکالا کے اراکین نے اس کے مشن کو جاری رکھتے ہوئے اپنے ہم قوموں کی راہ سے کانٹے چنے۔

مشہور یہودی فلسفی اسرائیل جیکب سن (1768-1828) کی صورت میں یہودیوں کو ایک اور راہنما میسر آیا جس نے تعلیمی، مذہبی اور سیاسی اصلاحات کرنی شروع کیں۔ مینڈلزن کی طرح اسے بھی اصلاح شدہ یہودیت کی بنیادیں استوار کرنے والوں میں تسلیم کیا جاتا ہے۔ اس نے اپنی پشتینی دولت کو نہ صرف یہودیوں بلکہ مسیحیوں کی بہبود پر بھی خرچ کیا۔ اس کی اصلاح شدہ یہودیت کی حمایت کی وجہ سے راسخ العقیدہ یہودی اس کے خلاف ہوتے چلے گئے۔ البتہ معاشرتی تبدیلی کا جو خواب اس نے دیکھا تھا وہ پورا ہوا۔ لیوپولڈ زنز (1794-1886)، سموئیل ہولڈہم (1806-1860) اور ابراہیم جائیجر (1810-1874) جیسے رہنما ملنے کے بعد جرمنی سے نکلنے والی تحریکِ اصلاح یورپ کے دوسرے ممالک میں بھی پھیلتی چلی گئی۔ جائیجر نے اس ضمن میں خاص کام یہ کیا کہ مذہب کو سائنسی بنیادوں پر پڑھا اور اسے خدا کے قانون کی بجائے انسانی تخلیق کے ضمن میں بیان کیا جو بعد میں اصلاح شدہ یہودیت کا خاصا بن گیا۔ بہت سے اصلاح شدہ یہودیوں نے معاشی تنگیوں کے پیشِ نظر امریکہ ہجرت کی جو دیکھتے ہی دیکھتے اصلاح شدہ یہودیت کا گڑھ بن گیا۔

اس دور میں مجموعی طور پر یورپ بہت سی سیاسی اور سماجی تبدیلیوں سے گزر رہا تھا۔ روشن خیالی اہلِ یورپ کو متاثر کر رہی تھی۔ بعض ریاستوں میں یہودیوں کو شہری حقوق دیے جانے لگے۔ ان پر عائد ٹیکس اور تجارتی پابندیاں ختم کر دی گئیں۔ انقلاب فرانس کی صورت میں یہودیوں کو ایک اور موقع فراہم ہوا۔ اب انہیں اس پر غور و خوض کرنا تھا کہ وہ اپنے نسل پرستانہ رویے کو برقرار رکھیں یا دوسری قوموں کو بھی اپنے برابر درجہ دینے پر تیار ہوں۔ انہوں نے حالات کے مطابق فیصلہ کیا اور برابری کے حقوق حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے۔ 1871 عیسوی میں جرمن حکومت نے بھی انہیں مساوی حقوق دینے کا اعلان کرتے ہوئے ان پر عائد

پابندیاں ختم کر دیں۔

سامی مخالفت کا عروج

جرمنی میں یہودیوں کو برابر کے حقوق تو مل گئے لیکن جرمن قوم نے بحیثیتِ مجموعی انہیں قبول نہیں کیا۔ دوسری طرف یہودی بھی پوری طرح خود کو قومیت کے تعصب سے آزاد نہ کر سکے جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ جرمن قوم پرستی ان کے آڑے آنے لگی۔ نسلی تعصب اس حد تک بڑھا کہ اس نے "سامی مخالفت" کی شکل اختیار کر لی۔ سامی مخالفت کی اصطلاح اس سے پہلے مذہبی طور پر استعمال ہوتی تھی۔ اب یہودیوں کے نسلی تعصب کو استعمال کرتے ہوئے ایک جرمن صحافی ویلیم مار (1919-1904) نے اسے نسل سے جوڑ دیا۔[49] اس کے بعد سامی مخالفت کے نظریے نے زور پکڑا اور دیکھتے ہی دیکھتے جرمن یہودیوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ اس کی جڑیں جرمنی سے نکل کر روس، امریکہ، فرانس اور یورپ کے دیگر ممالک تک پھیل گئیں۔ روسیوں نے سامی مخالفت کو مزید پروان چڑھایا اور بہت سے شہروں میں یہودیوں پر حملے ہونے لگے۔ ریاست نے ان حملوں کو روکنے کی کوشش کی لیکن سامیوں کی نفرت لوگوں کے دلوں میں زہر کی طرح پھیل گئی تھی جس کو نکالنا آسان نہیں تھا۔ یہی حال امریکہ کا بھی ہوا جہاں یہودیوں پر پابندیاں لگیں۔ کلو کلکس کلان جیسے نسل پرست گروہوں نے دیگر غیر سفید فام اقوام کی طرح یہودیوں کو بھی تشدد کا نشانہ بنایا۔

فرانس بھی سامی مخالفت سے جان نہیں چھڑا پایا۔ مسیحیت کے بڑے گروہ کیتھولک اور پروٹسٹنٹ پہلے ہی مذہبی بنیادوں پر یہودیوں کے خلاف تھے اور انقلاب فرانس میں بننے والے قوانین کو پسند نہیں کرتے تھے۔ بعد میں جب الفریڈ ڈریفس (1906-1894) نامی ایک یہودی فوجی پر جاسوسی کا الزام لگا تو سامی مخالفت میں مزید اضافہ ہوا۔ ڈریفس جرمنی کو فوجی راز دینے کے الزام میں قید تھا۔ اس کے حق میں واضح ثبوت ملنے کے بعد بھی اس کو رہا نہیں کیا گیا جس کی بنیادی وجہ اس کا یہودی ہونا تھا۔ بعد میں سیاسی دباؤ اور عوامی مخالفت پر اس کو 1906 میں رہا کیا گیا۔[50] کہنے کو تو یہ ایک عسکری معاملہ تھا تاہم اس نے فرانس کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا، سیاست میں بنیاد پرستی کو رواج دیا اور سامی مخالفت کو ہوا دی۔

سامی مخالفت کی بدترین مثال نازی جرمنی نے مہیا کی جس نے یورپ کے دیگر علاقوں

میں ہونے والی یہود دشمنی کو بھی پیچھے چھوڑ دیا۔ جنگ عظیم اول (1914-1918) کے بعد جرمنی کی حکومت نازیوں کے ہاتھ آئی جنھوں نے نسلی بنیادوں پر لوگوں کو قتل کرنے کی سرکاری پالیسی ترتیب دی۔ ان کے نزدیک جرمن قوم اور جرمن خون کے علاوہ کسی اور قوم کو کوئی امتیازی حق حاصل نہیں تھا۔ یہودی چونکہ خود نسلی تعصب اور قومیت سے جان نہیں چھڑا پائے تھے لہذا وہ بھی نازی پالیسی کا شکار بنے۔ مشہور ڈکٹیٹر ایڈولف ہٹلر (1889-1945) نے قانونی طور پر اشتراکیت پسندوں، رومینیوں، معذوروں، ہم جنس پرستوں اور غلاموں سمیت لاکھوں یہودیوں کو دردناک موت سے ہمکنار کیا۔ یہودی مؤرخین کے مطابق نازیوں کے ہاتھوں 60 لاکھ یہودی لقمہ اجل بنے۔ اس سے پہلے تک یہودیوں کے پاس دو اضافی راستے ہوتے تھے کہ وہ یا تو مسیحیت اختیار کر لیں یا ملک چھوڑ کر چلے جائیں جبکہ نازی جرمنی نے انہیں سوائے سسکتی موت کے اور کچھ نہ دیا۔

یہودی تاریخ میں اس بدترین دور کے لیے مرگ انبوہ کی اصطلاح استعمال کی جاتی ہے۔ ہٹلر کے نزدیک یہودی زمین پر رینگتے ہوئے کیڑوں سے بھی بدتر تھے۔ اس کا مقصد ان کو دردناک عذاب سے دوچار کرنا تھا۔ اپنے ایک انٹرویو میں وہ اس حد تک گرا کہ جب اس سے یہودیوں کے متعلق پوچھا گیا تو اس نے جواب دیا کہ اقتدار ملتے ہی وہ پہلا کام یہودیوں کے وجود سے جرمنی کو پاک کرنے کا کرے گا۔ ان کی لاشوں کو چوراہوں پر اس وقت تک لٹکتا رہنے دے گا جب تک کہ ان سے تعفن نہ اٹھنے لگے۔[51] ہوا بھی ایسا ہی۔ جرمنی اور پالینڈ کے مقبوضہ علاقوں میں یہودیوں کو مارنے کے لیے گیس چیمبرز بنے۔ ہر طرف لاشوں کے ڈھیر ہوتے۔ تجربات کے لیے زندہ انسانوں کو منجمد کر دیا جاتا، پریشر چیمبرز سے گزارا جاتا اور معصوم بچوں کے جسموں کو ایک دوسرے سے ملا کر سی دیا جاتا یہاں تک ان کے زخموں سے تعفن اٹھنے لگتا۔

خود مختار یہودی ریاست کا حصول

پے در پے مظالم سہنے سے یہودیوں کے بڑے طبقے میں ایک تبدیلی یہ آئی کہ انہیں اس بات کا شدت سے ادراک ہونے لگا کہ وہ بحیثیت قوم ہی دھتکارے گئے ہیں اور بحیثیت قوم ہی اپنی بے بسی کی حالت سے نکل سکتے ہیں۔ قومیت کا یہ شعور اس قدر ان کے دل و دماغ پر چھانے لگا کہ بہت سی قدیم روایات کا دھندلا سا عکس ہی باقی رہ گیا۔ اب مسیحا کے تصور کی جگہ بھی قومیت،

نسل پرستی اور ارضِ موعود نے لے لی۔ جس طرح رومیوں کے دور نے انہیں قومیت اور نسلی تعصب کو پروان چڑھانے کا موقع دیا تھا، یہی کام مسیحی یورپ نے کیا۔ وہ یہ سوچنے لگے کہ یورپ میں چاہے انہیں کتنی ہی آزادی مل جائے وہ اپنے خلاف نفرت لوگوں کے دلوں سے نہ نکال سکیں گے۔ چنانچہ انہوں نے اپنی ایک الگ ریاست قائم کرنے کا منصوبہ بنانا شروع کیا۔

محبان صہیون کا کردار

الگ ریاست کے قیام کے لیے یہودیوں میں متعدد تجاویز زیر غور تھیں۔ ان میں سے ایک یہ بھی تھی کہ فلسطین میں اپنی چھوٹی بڑی آبادیاں قائم کی جانی چاہیں۔ اس کے لیے ایک مذہبی جذبہ بھی موجود تھا۔ پرتز سمولنسکن (1842-1885) نامی ایک روسی مصنف نے اپنی تحریروں کے ذریعے صہیونی نظریے کو فروغ دیا۔ اس کا خیال تھا کہ عبرانی زبان کو دوبارہ رائج کیا جانا چاہیے۔ بعدازاں اسی کے نقش قدم پر چلتے ہوئے ایک اخباری مدیر الیزر بن یہودا (1858-1922) نے عبرانی زبان کے از سر نو رواج کو یہودی ریاست کے قیام سے جوڑ دیا۔ روس میں ہونے والے سامی مخالف پُر تشدد واقعات کے بعد اس تحریک کو مزید تقویت ملی۔

لیون پنسکر (1821-1891) کے قیادت سنبھالنے سے تحریک میں نئی جان پڑ گئی۔ اس نے 1882 میں ایک کتابچہ **خوکار آزادی** لکھ کر اس بات کی تشہیر کی کہ یہودیوں کی نئی ریاست یورپ سے باہر ہونی چاہیے۔ البتہ اس نے یہ تجویز نہیں پیش کی یہ ریاست کس علاقے میں قائم کی جائے۔[52] اب محبان صہیون نامی بہت سے گروہ بنتے گئے جن کا مقصد ایک نئی یہودی ریاست کی تشکیل تھا۔ فلسطین کے ساتھ چونکہ ایک مذہبی لگاؤ موجود تھا اس وجہ سے امیر یہودیوں کی مالی مدد سے فلسطین میں نئی آبادیاں قائم کی جانے لگیں۔ ایک انجمن قائم کی گئی جو یورپ کے مختلف ممالک سے اس کام کے لیے رقم فراہم کرتی۔ فلسطین منتقل کیے گئے یہودی زیادہ تر زراعت کے شعبے سے منسلک تھے۔ اس وقت فلسطین کی کل آبادی کا 85 فیصد مسلمانوں پر مبنی تھا۔ اچھے تعلقات کی وجہ سے باہر سے آکر بسنے والے صہیونیوں کے ہاں عرب ملازمین بھی کام کرنے لگے۔ مالی مشکلات اور آپسی ناچاقیوں کی وجہ سے محبان صہیون اگرچہ زیادہ عرصہ اپنا کام جاری نہ رکھ سکے لیکن ان لوگوں نے صہیونیت کے لیے فکری بنیادیں فراہم کر دیں۔[53]

صہیونیت کا کردار

انیسویں صدی کے اختتام پر یورپ سے اٹھنے والی اس تحریک کا مقصد یہودیوں کے لیے ایک خود مختار اور آزاد ریاست کا قیام تھا۔ اس کے کرتا دھرتا ایسے لوگ تھے جن کا خیال تھا کہ یہودیوں کو اب ریاست کی تشکیل کے لیے کسی مسیحا کے انتظار میں نہیں رہنا چاہیے بلکہ خود آگے بڑھ کر جیسے بھی ہو سکے اپنے لیے ایک علیحدہ ریاست حاصل کر لینی چاہیے۔ تھیوڈر ہرزل (1860-1904) نامی ایک آسٹرین صحافی کو اس تحریک کا بانی تصور کیا جاتا ہے۔ وہ ڈریفس کے واقعے سے بہت متاثر تھا جس کے نتیجے میں اس نے ایک پمفلٹ بعنوان **یہودی ریاست: یہودی سوال کے حل کی جدید تجویز** لکھ کر اس تنظیم کو نظریاتی بنیادیں فراہم کر دیں۔ اس کا کہنا تھا کہ غیر یہودیوں میں رہتے ہوئے سامی مخالفت سے بچنا ناممکن ہے تاہم ان ہی میں ایسے لوگ بھی موجود ہیں جو الگ یہودی ریاست کے قیام میں مددگار ہو سکتے ہیں۔ اس کے نزدیک یہ نئی یہودی ریاست لبرل اور جمہوری اصولوں پر استوار کی جانی تھی۔ اس تحریر کے بعد سیاسی اور عسکری بنیادوں پر تحریک کو منظم کیا جانے لگا۔ یورپ کے مختلف حصوں میں اس کے مراکز بنائے گئے۔ ایک بینک قائم کیا گیا تاکہ تنظیم کے مالی امور کا خیال رکھا جا سکے۔ ہرزل نے سلطنت عثمانیہ سے اس سلسلے میں بات چیت کر کے مالی تعاون کی پیش کش کی تاکہ انہیں رہنے کے لیے الگ جگہ مل جائے۔ عبدالحمید دوم (1842-1918) نے بعض خدشات کی وجہ سے ہرزل کو فلسطین میں ایک خود مختار ریاست دینے سے انکار کر دیا لیکن اس نے انہیں یہ اجازت دی کہ وہ ریاست کے دیگر شہریوں کی طرح سلطنت کے جس حصے میں چاہیں مقیم ہو جائیں۔

صہیونیوں کو فکری بنیادیں زوی کالسچر (1795-1874) جیسے مصنفین مہیا کر چکے تھے جنہوں نے عبرانی بائیبل اور تلمود کے مطالعے سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی تھی کہ یہودی ریاست کے قیام کے لیے مسیحا کے انتظار کی ضرورت نہیں۔ محبان صہیون نے بھی فلسطین ہی میں یہودی آبادکاری شروع کر دی تھی اس وجہ سے صہیونیوں نے بھی فلسطین ہی کی صورت میں نئی ریاست کا مطالبہ کرنے کی ٹھانی۔ ایسا کرنے کی مذہبی وجہ تو موجود ہی تھی جس سے فائدہ تو اٹھایا جا سکتا تھا لیکن اپنایا جانا ممکن نہیں تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ابتدائی صہیونی مفکرین ایک سیکولر ریاست بنانے کے حامی تھے۔ انہوں نے ایک نئی طرز کی یہودیت تشکیل دی

تھی جس میں وحی اور روحانیات کا دخل نہیں تھا۔[54] زیادہ تر اصلاح شدہ یہودی ان نظریات کے حق میں تھے۔ انہوں نے نئی ریاست کے قیام کے لیے دل کھول کر مالی مدد فراہم کی۔ نازی جرمنی میں ہونے والے دردناک واقعات نے یہودیوں کی کسمپرسی میں مزید اضافہ کر دیا۔ اب ان کے نزدیک ایک نئی ریاست کا قیام ضروری عمل بن گیا۔ ترکوں نے چونکہ انہیں فلسطین میں خود مختار ریاست بنانے کی اجازت نہیں دی تھی اس لیے ان کی کدورت بھی ان میں سے بیشتر کے دلوں میں پلنے لگی۔

فلسطین پر حملہ

فلسطین میں موجود عربوں کو اس نئی صورت حال سے تشویش ہوئی کیونکہ وہاں کے بیشتر علاقوں میں مسلمان موجود تھے۔ یہودیوں کی آبادی اس سے پہلے 4 فیصد سے زائد نہیں تھی۔ صہیونیوں کے لیے اب یہ زندگی اور موت کا مسئلہ تھا کیونکہ وہ یورپ میں رہنے کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔ انہوں نے اس کے لیے طاقت کے بے دریغ استعمال کو بھی اپنانے کا فیصلہ کر لیا۔ عسکری طور پر وہ خود کو منظم کرنے لگے کیونکہ بغیر طاقت کے وہ عربوں سے معاملہ نہیں کر سکتے تھے۔[55] 1917 میں برطانیہ نے ترکی کی طاقت کو توڑا اور فلسطین پر اپنا تسلط جما لیا۔ اسی سال صہیونیوں کے ساتھ ایک معاہدے میں برطانوی کابینہ نے یہ فیصلہ کیا کہ فلسطین پر یہودیوں کو اپنی نئی ریاست بنانے کی اجازت دے دی جائے گی۔ بالفرڈ ڈکلیریشن نامی اس فیصلے کا صہیونیوں نے دل کھول کر خیر مقدم کیا۔ اگرچہ اس سے پہلے انہیں دیگر کئی علاقے دیے جانے کی پیشکش ہو چکی تھی لیکن اب وہ فلسطین ہی میں اپنی نئی ریاست بنانا چاہتے تھے۔

اسرائیل کا قیام

1947 میں برطانیہ نے فلسطین کا معاملہ اقوام متحدہ کے سپرد کر دیا جہاں یہ فیصلہ کیا گیا کہ فلسطین کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ عربوں کو ایک حصے سے بے دخل کر کے وہاں صہیونیوں کو اسرائیلی ریاست کے قیام کی اجازت دے دی جائے۔ اس فیصلے کو عربوں نے قبول نہیں کیا جس کے نتیجے میں مسلم یہودی فسادات روز مرہ کا معمول بن گئے۔ مارچ 1948 تک 1،000 یہودی ان فسادات کی نظر ہوئے۔[56] صہیونیوں نے بھی مسلح کوششیں جاری رکھیں اور اپنے خلاف اٹھ کھڑے ہونے والے عربوں کا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ خلافت عثمانیہ کے خاتمے کی

وجہ سے مسلمان مزید کسی جنگ کا بار نہیں سہہ سکتے تھے۔ ان کی آپسی لڑائیوں نے بھی انہیں کمزور کر دیا تھا۔ صہیونی اس بات سے آگاہ تھے اور برطانیہ نے ان کی کھلی حمایت کر کے ان کے عزم کو مزید حوصلہ بخشا تھا۔ اب وہ اس بات میں آزاد تھے کہ عربوں سے بزور قوت نبرد آزما ہو سکیں۔ عرب لیگ نے متحد ہو کر جنگ کرنے کی کوشش کی لیکن صہیونیوں کی عسکری طاقت کا مقابلہ کرنے میں ناکام رہے۔ آخر کار 14 مئی 1948 کو تل ابیب میں یہودیوں نے اسرائیلی ریاست کے قیام کا اعلان کر دیا۔

اس اقتدار کے لیے صہیونی، عربوں پر مظالم بھی کرتے رہے۔ یہاں تک کہ دیر یاسین جیسے علاقوں میں بسنے والے غریب اور نہتے عرب جنہیں اس جنگ سے کوئی سروکار نہ تھا بے رحمی سے صہیونی افواج کے ہاتھوں قتل ہوئے۔[57] عرب اقلیت تنگ آکر ہجرت پر مجبور ہوئی۔ ان مہاجرین کی کل تعداد دس لاکھ کے قریب بتائی جاتی ہے۔ اسرائیلی ریاست کے قیام کے اگلے ہی دن لاکھوں مسلمانوں کو ریاست سے بے دخل کر دیا گیا۔ عربوں نے اس دن کو نکبہ کے نام سے یاد رکھا اور ہر سال اس کو یادگار کے طور پر منانے لگے۔ 2011 میں اسرائیلی ریاست میں رہنے والے عربوں پر اس دن کو منانے پر بھی پابندی عائد ہوئی اور حکم عدولی پر بھاری جرمانہ کیا جانے لگا۔ وجہ یہ ہے کہ اسرائیلی حکام سمجھتے ہیں کہ ان کے ہاں بسنے والے عرب دیگر علاقوں کی نسبت زیادہ خوشحال ہیں۔ اس لیے نکبہ جیسے کسی دن کو منانے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔

اسرائیل کے قیام سے لے کر اب تک صہیونیوں اور مسلمانوں میں کئی جنگیں ہو چکی ہیں۔ صہیونیوں کے لیے تاریخ ساز فتح 1967 کی ہے جب چھ روزہ جنگ میں انہوں نے یروشلم، غزہ کی پٹی، صحرائے سینا اور گولان کی پہاڑیوں سمیت کئی علاقوں کو پوری طرح اپنے قبضے میں لے لیا۔ یہ علاقے اقوام متحدہ کی تقسیم کے مطابق صہیونیوں کے نہیں تھے۔ 1973 میں مصر اور شام نے کوشش کر کے اپنے مقبوضہ علاقوں کو واپس لینا چاہا لیکن بُری طرح ناکام رہے۔ 1979 میں مصر کی اسرائیل سے صلح ہوئی جس کے نتیجے میں صحرائے سینا کا علاقہ اسے واپس کر دیا گیا۔ 1989 کے قریب اسرائیلی محاصروں، آبادکاریوں اور مقبوضہ علاقوں کی آزادی کے لیے غزہ کے اندر سے حماس نامی عسکریت پسند تحریک قائم ہوئی۔ 2005 میں اسرائیل نے غزہ کا مقبوضہ علاقہ واپس کر دیا جہاں حماس نے اپنی حکومت قائم کر لی۔ اب تک

فلسطینیوں اور اسرائیلیوں میں امن کے لیے درجنوں مذاکرات ہو چکے ہیں لیکن دونوں فریقین کسی قابلِ عمل حل پر متفق نہیں ہو سکے جس کی بڑی وجہ یہودی آبادکاریاں ہیں۔

اسرائیل اب مشرق وسطی میں بحیرہ روم کی ساحلی پٹی کے ساتھ آباد ہے۔ اس کے اطراف میں لبنان، شام، اردن اور مصر ہیں۔ یہ ایک طرح سے یورپ، ایشیا اور افریقہ کے درمیان واقع ہے۔ یہاں کی سرکاری زبان عبرانی ہے۔ نیلے اور سفید پرچم پر نجم الداؤد یعنی چھ کونوں والا ستارہ آویزاں ہے۔ آبادی تقریباً 7.8 ملین ہے جس میں 75 فیصد یہودی اور 20 فیصد مسلمانوں کے علاوہ 5 فیصد دیگر اقلیتیں شامل ہیں۔ بڑے شہروں میں اس کا دارالخلافہ یروشلم (جسے 2017 میں امریکا نے تسلیم کیا)، تل ابیب، ہائیفا اور بئر السبع شامل ہیں۔ اس مذہبی و جمہوری ریاست کو چلانے کی ذمہ داری صدر ادا کرتا ہے جس کو چار سال بعد الیکشن کے ذریعے منتخب کیا جاتا ہے۔ اس کی سرکاری ویب سائٹ https: //www.gov.il ہے۔ یہاں کے باسی اس بات کے حق میں نہیں ہیں کہ انہیں اس جگہ سے نکالا جائے کیونکہ ان میں سے بیشتر کا خیال ہے کہ دیگر علاقوں میں انہیں سامی مخالفت کی بھینٹ چڑھایا جا سکتا ہے۔

سامی مخالفت کی نئی لہریں

اگرچہ یورپ کے بیشتر علاقوں میں سامی مخالف نظریات وقت کے ساتھ ساتھ دم توڑ رہے ہیں جن کے لیے باقاعدہ یورپ و امریکہ میں قانون سازیاں کی گئی ہیں۔ مسیحیوں کی جانب سے ویٹیکن روم میں یہ اصولی فیصلہ کیا گیا کہ عصرِ حاضر کے یہودیوں کو مسیحؑ کی موت کا ذمہ دار نہیں ٹھہرایا جائے گا۔ تاہم ریاستِ اسرائیل کے قیام نے سامی مخالفت کے ایک نئے انداز کو فروغ دیا۔ یہودیوں کو کم از کم دو ہزار سال بعد خود مختار ریاست کے قیام کا موقعہ ملا۔ اس سے پہلے تک وہ دوسروں کی غلامی میں زندگی بسر کرتے رہے۔ یہودی روایات کے مطابق بیشتر حکمرانوں نے ان سے جانوروں کا سا سلوک کیا۔ ان کی طویل تاریخ میں اسلام ان پر احسان بن کر ابھرا اور ان کو داؤدؑ و سلیمانؑ کے دور کے بعد عہدِ زریں نصیب ہوا۔ ایسا بھی ہوا کہ جب اسرائیلی ریاست کا قیام عمل میں آیا تو کچھ لوگ ایک دفعہ پھر عہدِ زریں کے خواب دیکھنے لگے لیکن اس خواب کی تعبیر ممکن نہ ہو سکی۔ راسخ العقیدہ یہودی اس نئی ریاست کے قیام کے مذہبی بنیادوں پر خلاف تھے کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ ارضِ موعود کا حصول مسیحِ موعود کے ہاتھوں ہوگا لیکن بعد میں تدریجاً

وہ بھی انہیں خطوط پر چلنے پر مجبور ہوئے جن پر صہیونیوں نے ان کو چلایا۔

یورپ میں جس طرح انہیں ظلم و ستم کا نشانہ بنایا گیا اس نے صہیونیوں کو مجبور کر دیا کہ اپنی الگ ریاست جس طرح بن سکے قائم کریں۔ چنانچہ انہوں نے فلسطین کے بہت سے علاقوں کو بزورِ قوت اپنے قبضے میں لے لیا۔ ایمنسٹی انٹرنیشنل کے مطابق، عربوں کو ان کے گھروں سے بے دخل کرنا، مختلف قوانین بنا کر ان کے حقوق غصب کرنا، قتل و غارت، آزادانہ نقل و حمل پر پابندی، عدالتی بے انصافیاں اور تشدد اس نئی اسرائیلی ریاست کا معمول ہیں۔[58] مسلمان یہ سمجھتے تھے کہ ان کے دورِ حکومت میں یہودیوں کے ساتھ اچھا سلوک ہوتا رہا تھا لہذا یہودی بھی ان کے مفاد کا خیال رکھیں گے۔ جب استعماری طاقتیں مختلف مسلم علاقوں کو اپنے قبضے میں لے رہی تھیں تو یہودیوں سے یہ توقع کی جا رہی تھی کہ وہ اس لڑائی میں مسلمانوں کا ساتھ دیں گے۔ اب یہودیوں کے طرزِ عمل نے انہیں مایوس کیا۔ وہ یہ کہنے پر آمادہ ہونے لگے کہ یہودی، استعماری قوتوں کے مددگار ہیں۔[59] یہودیوں کے کام کو شک کی نظر سے دیکھا جانے لگا۔ **صہیونی دستاویزات (دا پروٹوکولز آف دا ایلڈرز آف زائن)** کے عنوان سے ایک کتاب لکھی گئی جس میں یہ بیان تھا کہ صہیونی پوری دنیا پر قبضہ کا خواب دیکھ رہے ہیں۔ اس کتاب کے اردو سمیت متعدد زبانوں میں تراجم ہوئے جس سے یہودیوں کے خلاف مجموعی نفرت میں اضافہ ہوا۔ صہیونی خود اس کتاب اور اس میں لکھی گئیں باتوں کو مسترد کرتے ہیں لیکن سامی مخالفت کے حوالے سے جس قدر شہرت اس کتاب کو نصیب ہے شاید ہی کوئی دوسری کتاب اس درجہ تک پہنچ پائی ہو۔

ان تمام عوامل، جن میں جدید ریاست اسرائیل کا کردار سب سے اہم رہا ہے، نے مسلمانوں کو یہود مخالف بنا دیا ہے۔ اردو زبان میں متعدد ایسی کتب لکھی جا چکی ہیں جن میں انہیں "شر کے نمائندوں" کے طور پر پیش کیا گیا ہے (دیکھیے اس کتاب کا مقدمہ)۔ آئے دن مختلف مسلم ممالک جنہوں نے ابھی تک اسرائیل کو سرکاری طور پر قبول نہیں کیا، اس کے خلاف بیان جاری کرتے رہتے ہیں۔ مسلمان جو پہلے یہودیوں کو اہلِ کتاب اور ایک "امت" سمجھتے تھے اب سامی مخالفوں میں شامل ہونے لگے ہیں۔ لیکن یہ مخالفت اس طرح کی نہیں ہے جیسی یورپی مسیحیوں یا جرمن نازیوں نے ان سے روا رکھی بلکہ اس میں ایک نیا پن ہے۔ مسلمانوں میں اس کے پروان چڑھانے میں یہودی خود حصہ دار بنے ہیں۔ مسلمان، یہودی مذہب، نسل، قوم یا زبان

کے پوری طرح مخالف نہیں ہوئے بلکہ ان کی مخالفت کا خصوصی مرکز اسرائیل ہے۔ جس نوعیت کی کاروائیاں اسرائیلی افواج کی طرف سے کی جارہی ہیں اس سے لگتا ہے کہ سامی مخالفوں کا ایک نیا گروہ خود یہودیوں میں وجود پا چکا ہے۔ یہ نئے سامی مخالف بھی ابراہیمؑ کی اولاد ہی کو قتل کر رہے ہیں اور انہیں اسی زمین سے بے دخل کر رہے ہیں جس کا وعدہ خدا نے آپؑ کے ساتھ کیا تھا۔ اگر اسرائیل کا قیام پرامن طریقے سے ہوتا چاہے اس میں یہودیوں کو کچھ انتظار ہی کرنا پڑتا تو شاید سامی مخالفت کی یہ نئی لہر پیدا نہ ہوتی اور خطہ امن و سکون کا گہوارہ ہوتا۔

مشقی سوالات

مختصر سوالات

1. یہودی، عرب میں کب مقیم ہوئے؟
2. میثاقِ مدینہ کسے کہتے ہیں؟
3. عہد نبوی کے یہودیوں پر نوٹ لکھیں؟
4. اسلام اور یہودیت میں مشترک کیا ہے؟
5. مسلمانوں کے تحت یہودیوں نے کتنا عرصہ گزارا؟
6. یہودیوں پر عرب ماحول کے کیا اثرات تھے؟
7. اہل کتاب کون ہیں؟
8. دیہیا کاہنہ کون تھی؟
9. یہودیوں نے جنگوں میں مسلمانوں کا ساتھ کیوں دیا؟
10. عہدِ عمرؓ میں یہودیوں کے حالات کیسے تھے؟
11. مسلماں کی فتحِ یروشلم یہودیوں کے لیے کیوں اہم تھی؟
12. مسلمانوں نے یہودیوں کو بحیثیت قوم مخالفت کا نشانہ کیوں نہیں بنایا؟
13. عقدِ عمر کی بنیادی شرائط کیا تھیں؟
14. گاؤنیم کون تھے؟
15. عقدِ عمر کی شرائط عملی طور پر کیوں رائج نہ کی گئیں؟
16. مدراش عمر ابن خطابؓ کے بارے میں کیا کہتی ہے؟
17. قرائٹ کون تھے؟
18. سعدیا گاون کون تھا؟
19. عہد عباسی میں یہود کی کیا حالت تھی؟
20. یہودیت کا عہد زریں کسے کہا جاتا ہے؟
21. عبدالرحمن دوم کے دور میں سپین نے کیسے ترقی کی؟
22. سپین میں یہودیوں کو کیا سہولیات میسر تھیں؟

23. سفاردی یہودی کون ہیں؟
24. یہودی سپین میں کب آباد ہوئے؟
25. موحدون کون تھے؟
26. فاطمی کون تھے؟
27. موحدون کے دور میں یہود کی کیا حالت تھی؟
28. حکمرانی کے لیے فاطمیوں کی کیا حکمت عملی تھی؟
29. فاطمی عہد میں یہود کی کیا حالت تھی؟
30. الحاکم نے یہودیوں سے کیا سلوک کیا؟
31. مملوک دور میں یہود کی کیا حالت تھی؟
32. نجد کون تھا؟
33. صلاح الدین ایوبی کے دور میں یہودیوں کی کیا حالت تھی؟
34. عبد الرحمن سوم کے دور میں یہودیوں کی حالت کیسی تھی؟
35. مملوک کون تھے؟
36. عثمانی کون تھے؟
37. عثمانی دور میں یہود کی کیا حالت تھی؟
38. مارانو کو پوشیدہ یہودی کیوں کہا جاتا ہے؟
39. مارانو یہودی کون تھے؟
40. اشکنازی یہودی کون تھے؟
41. عثمانی دور کے یہودیوں میں کن زبانوں نے رواج پایا؟
42. عثمانی دور میں یہودیوں کی مقدس کتب کی ترویج کیسے ہوئی؟
43. قبالہ کسے کہتے ہیں؟
44. حاخام باشی کون تھے؟
45. عثمانی دور میں یہودیوں کا ذمیوں کا درجہ کیسے ختم ہوا؟
46. دنیا بھر سے یہودی عثمانی سلطنت میں کیوں آبسے؟
47. شولحان عاروخ کیا ہے؟
48. شمعون باریوحائی کون تھے؟
49. خلافت عثمانیہ کے اختتام پر کتنے یہودی مصر میں آباد تھے؟
50. خلافت عثمانیہ کے اختتام پر کتنے یہودی استنبول میں آباد تھے؟
51. یہودیوں پر عربی زبان کے کیا اثرات مرتب ہوئے؟
52. مسلمانوں میں رہ کر یہودی عقیدہ توحید کو کیسے استحکام ملا؟
53. مسیحیوں نے سپین پر کب قبضہ کیا؟
54. ہینری دوم نے یہود سے کیا سلوک کیا؟
55. پیٹر عادل نے یہود سے کیا سلوک کیا؟
56. طاعون کی وبا کا الزام یہود پر کیسے لگا؟
57. ابتدا کے صلیبی سپین میں یہودیوں کی کیا
58. آراگون اور قشتالہ کے یہودیوں سے کیا

حالت تھی؟ سلوک کیا گیا؟

59. یورپ میں یہودیوں کے قتل کے رائج طریقے کون کون سے تھے؟

60. یورپی یہودی خودکشی کیوں کرتے تھے؟

61. مارٹن لوتھر کا یہود سے رویہ کیسا تھا؟

62. یہودیوں کے ہاں سود کا کیا تصور ہے؟

63. درباری یہودی کسے کہتے تھے؟

64. گھیٹو کسے کہتے ہیں؟

65. کازمیر سوئم کا یہود سے رویہ کیسا تھا؟

66. پالینڈ میں یہودیت کا فروغ کیسے ہوا؟

67. قازقوں نے یہود سے کیا سلوک کیا؟

68. ہالینڈ میں یہودیوں کے ساتھ کیا ہوا؟

69. اٹلی میں یہودیوں کے ساتھ کیا ہوا؟

70. موسی مینڈلزن کون تھے؟

71. یہودی نشاط ثانیہ کسے کہتے ہیں؟

72. اسرائیل جیکب سن کون تھے؟

73. سامی مخالفت سے کیا مراد ہے؟

74. ویلیم مار کون تھے؟

75. سامی مخالفت کی جدید تشریح کیا ہے؟

76. امریکہ میں یہودیوں کی کیا حالت تھی؟

77. الفرڈ ڈریفس کیس کیا ہے؟

78. فرانس نے یہود سے کیا سلوک کیا؟

79. نازیوں نے یہود سے کیا سلوک کیا؟

80. ایڈولف ہٹلر کون تھا؟

81. ہٹلر کا یہودیوں کے متعلق کیا خیال تھا؟

82. مسیح کے تصور میں کیا تبدیلی آئی ہے؟

83. محبان صہیون کون تھے؟

84. صہیونیت کسے کہتے ہیں؟

85. لیونس پنسکر کون تھے؟

86. تھیوڈر ہرزل کون تھے؟

87. ہرزل نے عبدالحمید دوم سے کیا بات چیت کی؟

88. زوی کالسچر نے اسرائیل کے قیام میں کیا مدد کی؟

89. اصلاحی یہودیوں کا اسرائیل کے متعلق کیا خیال تھا؟

90. اقوام متحدہ نے فلسطین کے متعلق کیا فیصلہ دیا؟

91. بالفرڈ ڈکلیریشن سے کیا مراد ہے؟

92. اسرائیل کی نئی ریاست کب بنی؟

93. نکبہ کسے کہتے ہیں؟

94. اسرائیل کا جغرافیہ بیان کریں؟

95. اسرائیل کی قومی زبان کیا ہے؟

96. اسرائیل کے بڑے شہر کونسے ہیں؟

97. اسرائیل کا قانون کیا ہے؟

98. سامی مخالفت کی نئی لہر کیا ہے؟

99. راسخ العقیدہ یہودی اسرائیل کے قیام کے مخالف کیوں تھے؟

100. فلسطین میں بسنے والے عربوں سے صہیونیوں نے کیا سلوک کیا؟

تفصیلی سوالات

1. عہد نبوی میں مسلم یہودی تعلقات پر نوٹ لکھیں۔
2. اموی دور میں یہودیوں کے حالات پر نوٹ لکھیں۔
3. عہد عمرؓ کے یہودیوں پر نوٹ لکھیں۔
4. عباسی عہد کے یہودیوں پر نوٹ لکھیں۔
5. یہودیت کے عہد زریں پر نوٹ لکھیں۔
6. مملوک عہد کے یہودیوں پر نوٹ لکھیں۔
7. فاطمی عہد کے یہودیوں پر نوٹ لکھیں۔
8. عثمانی عہد کے یہودیوں پر نوٹ لکھیں۔
9. اسلامی ادوار میں یہودیوں کے حالات کا تقابل کریں۔
10. صلیبی سپین میں یہودیوں کے حالات پر نوٹ لکھیں۔
11. یورپی یہودیوں پر نوٹ لکھیں؟
12. یہودی نشاۃ ثانیہ پر نوٹ لکھیں۔
13. سامی مخالفت پر نوٹ لکھیں۔
14. اسرائیل کے قیام پر نوٹ لکھیں۔

حوالہ جات

[1]Norman A. Stillman, *The Jews of the Arab Lands: A History and Source Book* (Philadelphia: The Jewish Publication Society of America, 1979), 4.

[2]Grayzel, *A History of the Jews: From the Destruction of Judah in 586 BC to the Present Arab Israeli Conflict* 227.

[3]Stillman, *The Jews of the Arab Lands: A History and Source Book*, 23.

[4] Eliezer Bashan, "Omar Ibn Al-Khaṭṭāb," in *Encyclopaedia Judaica*, ed. Michael Berenbaum and Fred Skolnik (Detroit: Macmillan Reference US, 2007), 15:419.

[5]John Efron, Steven Weitzman, and Matthias Lehmann, *The Jews: A History* (London: Routledge, 2016), 154.

[6]Stillman, *The Jews of the Arab Lands: A History and Source*

Book, 27.

[7]القرآن 256:2

[8] Menahem Mansoor, *Jewish History and Thought: An Introduction* (New York: KTAV Publishing House, 1991), 182.

[9]Martin Gilbert, *In Ishmael's House: A History of Jews in Muslim Lands* (London: Yale University Press, 2010), 39.

[10]Efron, Weitzman, and Lehmann, *The Jews: A History*, 155.

[11]عبدیاہ 20:1

[12] Howard N. Lupovitch, *Jews and Judaism in World History* (London: Routledge, 2010), 68.

[13] Esperanza Alfonso, *Islamic Culture through Jewish Eyes: Al-Andalus from the Tenth to Twelfth Century* (London: Routledge, 2008), 61.

[14]Maurice H. Harris, *History of the Mediaeval Jews: From the Moslem Conquest of Spain to the Discovery of America* (New York: Bloch Publishing, 1921), 61.

[15]David Biale, *Cultures of the Jews: A New History* (New York: Schocken Books, 2010), 317.

[16]María Rosa Menocal, *The Ornament of the World: How Muslims, Jews, and Christians Created a Culture of Tolerance* (New York: Little, Brown and Company, 2002), 85.

[17]Kate Friedman, "Almoravids," in *The Cambridge Dictionary of Judaism and Jewish Culture*, ed. Judith R. Baskin (New York: Cambridge University Press, 2011), 10.

[18]Janes S. Gerber, *The Jews of Spain: A History of the Sephardic Experience* (New York: Macmillan, 1992), 57.

[19]Yitzhak Baer, *A History of the Jews in Christian Spain*, tr. Louis Schoffman (Skokie: Varda Books, 2001), 1: 61.

[20]Cohn-Sherbok, *Judaism: History, Belief and Practice*, 152.

[21]Ibid., 159.

[22] Eliyahu Ashtor, "Egypt: Arab Period," in *Encyclopaedia Judaica*, ed. Michael Berenbaum and Fred Skolnik (Detroit: Macmillan Reference US, 2007), 230.

[23]Ibid., 231.

[24]Ibid., 230.

[25]Cohn-Sherbok, *Judaism: History, Belief and Practice*, 160.

[26]Ashtor, "Egypt: Arab Period," 232.

[27]Mark R. Cohen, "Jews in the Mamlūk Environment: The Crisis of 1442 (A Geniza Study)," *Bulletin of the School of Oriental and African Studies, University of London* 47, no. 3 (1984): 426.

[28] Yaron Ayalon, "The Wiley-Blackwell History of Jews and Judaism," in *The Wiley-Blackwell Histories of Religion*, ed. Alan T. Levenson (West Sussex: Wiley-Blackwell, 2012), 310.

[29]Cohn-Sherbok, *Judaism: History, Belief and Practice*, 211.

[30]Marc D. Angel, "Jews in the Ottoman Empire," in *Encyclopedia of the Jewish Diaspora: Origins, Experiences, and Culture*, ed. Avrum M. Ehrlich (Santa Barbara: ABC-CLIO, 2009), 777.

[31]Jessica Vance Roitman, *The Same but Different?: Inter-cultural Trade and the Sephardim,1595–1640*, ed. David S. Katz, vol. 42, Brill's series in Jewish Studies (Boston: Brill, 2011), 75.

[32]Minna Rozen, "The Ottoman Jews," in *The Cambridge History of Turkey: The Later Ottoman Empire, 1603 – 1839*, ed. Suraiya N. Faroqhi (New York: Cambridge University Press, 2006), 258.

[33]Efron, Weitzman, and Lehmann, *The Jews: A History*, 221.

[34]Ashtor, "Egypt: Arab Period," 234.

[35]Yohanan Aharoni, *The Jewish People: An Illustrated History* (New York: Contiuum, 2006), 388.

[36]Magnus, *Outlines of Jewish History: B.C 586 to C.E 1885*, 140.

[37] Harris, *History of the Mediaeval Jews: From the Moslem Conquest of Spain to the Discovery of America*, 267.

[38]Cohn-Sherbok, *Judaism: History, Belief and Practice*, 166.

[39]Melvin Koner, *Unsettled: An Anthropology of Jews* (New York: Penguin, 2004), 155.

[40]Yitzhak Baer, *A History of the Jews in Christian Spain*, tr. Louis Schoffman (Skokie: Varda Books, 2001), 2: 438.

[41] Harris, *History of the Mediaeval Jews: From the Moslem*

Conquest of Spain to the Discovery of America, 278.

[42]Sean Martin, *The Black Death* (Harpenden: Pocket Essentials, 2007), 77.

[43]Marion A Kaplan, *Jewish Daily Life in Germany 1618–1945* (New York: Oxford University Press, 2005), 13.

[44]Cecil Roth, *The Jewish Contribution To Civilization* (New York: Harper & Brothers Publishers, 1940), 37.

[45]Bava Metzia 5: 6

[46]Cohn-Sherbok, *Judaism: History, Belief and Practice*, 229.

[47] Harris, *History of the Mediaeval Jews: From the Moslem Conquest of Spain to the Discovery of America*, 294.

[48] Chaim Schloss, *2000 Years of Jewish History: From the Destruction of the Second Bais Hamikdash Until the Twentieth Century* (Jerusalem: Feldheim Publishers, 2002), 217.

[49]Cohn-Sherbok, *Judaism: History, Belief and Practice*, 273.

[50]Cohn-Sherbok and Cohn-Sherbok, *A Short History of Judaism*, 103.

[51]Efron, Weitzman, and Lehmann, *The Jews: A History*, 407.

[52]Victor Karady, *The Jews of Europe in the Modern Era: A Socio-historical Outline* (Central European University Press: Budapest, 2004), 260.

[53]Mansoor, *Jewish History and Thought: An Introduction*, 376.

[54]Ibid., 381.

[55]Efron, Weitzman, and Lehmann, *The Jews: A History*, 395.

[56]Cohn-Sherbok, *Judaism: History, Belief and Practice*, 314.

[57]Matthew Hogan, "The 1948 Massacre at Deir Yassin Revisited," *Historian* 63, no. 2 (2001): 1.

[58] https: //www.amnesty.org/en/countries/middle-east-and-north-africa/israel-and-occupied-palestinian-territories/report-israel-and-occupied-palestinian-territories/, accessed on 23-4-2021.

[59]Michel Abitbol, “From Coexistence to the Rise of Antagonisms,” in *A History of Jewish-Muslim Relations: From the Origins to the Present Day*, eds. Abdelwahab Meddeb and Benjamin Stora, trans. Jane Marie Todd and Michael B. Smith (Princeton, NJ: Princeton University Press, 2013), 307.

چوتھا باب: کتب مقدسہ

تنخ

مذہبی یہودی اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ ان کی رہنمائی کے لیے خدا نے متعدد کتابیں نازل کیں۔ یہ کتب خدا کے الفاظ ہیں جو مختلف ادوار میں مختلف انبیاورسل پر نازل ہوئے۔ چنانچہ وہ ان کتب کو یہودی مذہب کی بنیاد مانتے ہیں۔ یہودیوں کے تمام فرقے ان کتب کی عزت کرتے ہیں، تاہم معنی اخذ کرنے اور تشریحات میں دیگر مذاہب کے پیروکاروں کی طرح ان میں بھی اختلاف پایا جاتا ہے جو مذہبی نقطہ نظر سے کافی اہمیت کا حامل ہے۔ جلاوطنی سے پہلے تک یہ کتب یہودیوں کے ہاں زبانی رائج رہیں۔ جلا وطنی کے بعد جب ہیکل سلیمانی کی از سر نو تعمیر ہوئی تو عزراؑ نے انہیں اکٹھا کیا۔

باب چہارم کے اہم نکات

1. یہودی کتب مقدسہ کا تعارف۔
2. مصنفہ وزبانی قانون میں فرق۔
3. عبرانی بائیبل اور اس کے تراجم کا تعارف، تاریخ اور اہمیت۔
4. مشنا، جمارا اور تلمود کا تعارف۔
5. ہلاخا کی تاریخ واہمیت۔
6. اپاکرفا، مدراش، زوہر اور سیدور کا تعارف۔

دریائے نیل کے کنارے اگنے والے نرسل کی طرح کے پودے سے بنائے گئے کاغذ جسے پیپرس/پپائرس/قرطاس مصری کہا جاتا ہے یا جانوروں کی چمڑی سے بنے کاغذ پر انہیں مختلف ادوار میں مختلف لوگوں نے لکھا۔ ہاتھ سے لکھی جانے والی ان کتب میں کاتبین نئے مشمولات بھی شامل کرتے رہے، مثلاً "کتابِ یسعیاہ" چونکہ تین مختلف ادوار سے متعلق ہے اس لیے کہا جاتا ہے کہ اسے تین مختلف لوگوں نے لکھا ہے۔ زیادہ تر محققین کا خیال ہے کہ تقریبا 400 قبل مسیح تک ان کتب کی تکمیل ہوتی رہی ہے۔[1] ان میں سے بیشتر کتب کی زبان عبرانی ہے جبکہ کچھ کتابیں آرامی زبان میں بھی لکھی گئیں ہیں۔ آرامی ذخیرہ الفاظ میں عبرانی سے ملتی جلتی ہے لیکن گرائمر اور لغوی اعتبار سے مختلف ہے۔

مجموعی طور پر ان کتب کو عبرانی بائیبل، تنخ یا تنک کہا جاتا ہے جس کے تین حصے ہیں۔ یہودی عام طور پر الفاظ کے مخففات بنانے کے شائق ہیں اس لیے ان تینوں حصوں کے لیے "تنخ/تنک" کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔ تنک میں "ت" سے مراد توریت، "ن" سے مراد "نویئیم" یعنی نبی اور "خ/ک" سے مراد "کیتُوبیم" یعنی کتب ہے۔ لہذا عبرانی بائیبل توریت، نبی

اور کتب کا مجموعہ ہے۔ ان تینوں حصوں میں الگ الگ کتابیں ہیں جن کو مختلف انداز میں گنا جاتا ہے، مثلاً سلاطین کے عنوان سے دو کتب ہیں جنہیں "اول سلاطین" اور "دوم سلاطین" بھی کہا جاتا ہے۔ یہودی ان دونوں کتابوں کو ایک ہی کتاب تصور کرتے ہیں۔ اس لیے ان کے ہاں رائج طریقہ کار کے مطابق عبرانی بائیبل میں کتب کی کل تعداد 24 ہے۔ مجموعی طور پر عبرانی بائیبل اس ذکر سے معمور ہے کہ جس نے بھی خدا کے احکامات کو مانا، وہ فلاح پا گیا اور جس نے ان سے روگردانی کی، اس کو زوال سے کوئی نہیں بچا سکا۔ بنی اسرائیل جب بھی گناہ کرتے، ذلیل و خوار ہوتے اور جب جب خدا کے احکامات کی پیروی کرتے، دنیا کے حکمران بن جاتے۔

عبرانی بائیبل میں بہت سے تاریخی واقعات بھی ملتے ہیں جن میں سے کئی ایک تو ایسے ہیں جن کا تاریخ کی دیگر کتب میں کوئی حوالہ نہیں، مثلاً مصری تاریخی کتب میں موسیٰؑ سے متعلق واقعات کا ذکر نہیں ملتا جس پر کچھ محققین کا خیال ہے کہ اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ فراعنہ کے لیے یہ کوئی بڑا واقعہ نہیں تھا کہ اسرائیلیوں کی ایک جماعت جو کہ ان کی غلام تھی موسیٰؑ کی راہبری میں کنعان چلی گئی۔[2] اسی طرح خروج کے متعلق تاریخی آرا مختلف نوعیت کی ہیں، جن میں سے کچھ تو عبرانی بائیبل کے واقعات کی شہادت دیتی ہیں اور بہت سی ایسی ہیں جن کے مطابق خروج کو جس طرح یہودیت میں بیان کیا گیا ہے غیر واضح اور مبہم معلوم ہوتا ہے، مثلاً جس پہاڑ کے قریب اسرائیلیوں نے مصر سے نکل کر پڑاؤ ڈالا تھا وہیں موسیٰؑ کو خدا نے شریعت بھی دی تھی۔ خصوصیت سے یہ بتایا گیا ہے کہ کوہ سینا کے جنوب میں موسیٰؑ کی ملاقات خدا سے ہوئی لیکن تاریخی حوالوں سے پتہ چلتا ہے یہاں موجود کانوں کی وجہ سے مصریوں کا یہاں بہت آنا جانا تھا جو کہ اسرائیلیوں کے لیے ایک خطرناک بات تھی کیونکہ وہ انہیں کی غلامی سے فرار ہو کر آئے تھے۔ چنانچہ یہاں یہ سوال اٹھتا ہے کہ وہ وہاں ان خطرات کے باوجود کیسے پڑاؤ کر پائے؟ دوم یہ کہ روایات میں اس پہاڑ کو لاوا اگلنے والا پہاڑ بیان کیا گیا ہے۔ جدید تحقیق کے مطابق ان اطراف کوئی بھی ایسا پہاڑ نہیں ہے جو لاوا اگلتا رہا ہو۔ اسی طرح خروج کی تاریخ کے متعلق بائیبل یہ بتاتی ہے کہ وہ سلیمانؑ کے عہد سے 480 سال پہلے کا زمانہ ہے۔ اس لحاظ سے خروج کا زمانہ تقریباً 1480 قبل مسیح بنتا ہے۔ تاہم اگر اسرائیلی، رامسیس دوم کے دور میں غلامانہ زندگی بسر کرتے رہے ہیں تو خروج کا زمانہ بہت بعد کا ہونا چاہیے۔[3]

آثار قدیمہ کی تحقیقات سے ایسی معلومات بھی ملتی ہیں جو عبرانی بائیبل کی بعض روایات کی تصدیق کرتی ہیں، مثلاً الخلیل گاؤں جو آج بھی سلسلہ کوہ خلیل کی تین ہزار فٹ بلندی پر آباد ہے، کا ذکر توریت میں موجود ہے۔ ابراہیمؑ کی یادگار، یہ گاؤں یروشلم سے بیس میل جنوب میں واقع ہے۔ یہی وہ جگہ ہے جہاں عبرانیوں نے اولین پڑاؤ ڈالا۔ یہاں آج بھی مقبروں کا ایک سلسلہ موجود ہے جس میں مسجد الخلیل یا الحرم الابرہیمی سب سے نمایاں ہے۔ یہ جگہ ابراہیمؑ نے اپنی تدفین کے لیے خریدی تھی۔ یہاں ایک چھوٹا سا کمرہ ہے جس میں روایات کے مطابق ابراہیمؑ دفن ہیں۔ ان کے ساتھ سارہؓ کا مقبرہ ہے اور ساتھ دو چھوٹے مقبرے اسحاقؑ اور ربقہ کے ہیں۔ قریب ہی یعقوبؑ اور یوسفؑ کے مقبرے ہیں۔ الخلیل گاؤں یہودیت کا ایک تاریخی ثبوت اور یادگارِ ابراہیمی ہے۔

توریت کی پانچ کتابیں

1. پیدائش 2. خروج
3. احبار 4. گنتی
5. استثنا

عبرانی بائیبل میں شامل یہودیوں کے خلاف منفی آرا کو بھی یہودیت کی سچائی کی دلیل کے طور پر پیش کیا جاتا ہے، مثلاً داؤدؑ کا شمار یہودی قائدین میں کیا جاتا ہے۔ عبرانی بائیبل نے جہاں ان کی تعریف کی ہے، وہیں ان کو سخت تنقید کا نشانہ بھی بنایا ہے۔ اس بات پر خدا ان سے ناراضگی کا اظہار کرتا ہے کہ انہوں نے اپنے ایک سپاہی کی بیوی کے ساتھ جنسی تعلق قائم کیا اور اس سپاہی کے قتل کا سامان کیا۔[4] اس کے علاوہ یہ غیر یہودیوں (جیسا کہ سائرس) کے متعلق مثبت آرا بھی رکھتی ہے جو یہودیوں کے نزدیک اس کی سچائی کی ایک اور دلیل ہے۔

تنخ کے تین حصے

1. توریت (5 کتب)
2. نبی (8 کتب)
3. کتابیں (11 کتب)

توریت

توریت/تورات/القانون/اسفار خمسہ/شریعت، عبرانی بائیبل کا پہلا اور اہم ترین حصہ ہے جس کا نزول موسیٰؑ پر ہوا۔ اس کا لفظی مطلب "سِکھانا" اور "رہنمائی" کرنا ہے۔ اس میں پانچ کتابیں شامل ہیں جن کے نام بالترتیب پیدائش، خروج، احبار، گنتی اور استثنا ہیں۔ چونکہ اس میں

پانچ کتابیں ہیں اس لیے اسے "خماش" بھی کہہ دیا جاتا ہے جو عبرانی زبان میں پانچ کے عدد کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ سیناگاگ کے اندر توریت کو طومار / سکرول میں درج کر کے رکھا جاتا ہے جسے "سوفر" لکھتے ہیں۔ سوفر ہاتھ سے توریت کو طوماروں پر لکھنے لیے باقاعدہ تربیت حاصل کرتے ہیں۔ ہاتھ سے لکھی گئی سوفروں کی توریت کو "سفر توریت" کہا جاتا ہے۔ جب یہودی، تاریخ کے مختلف ادوار میں غلام بنے اور ان کے ہیکل کو تباہ کر دیا گیا تو توریت کی تلاوت اور سبت کی پیروی ہی ان کے لیے سب سے بڑی عبادت تھی۔ آج بھی ایک مذہبی یہودی کے گھر دو چیزیں لازمی ہوتی ہیں: ایک توریت اور دوسری سیدور یعنی عبادات کی کتب۔ یہودیوں کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ وہ توریت کی تلاوت کریں، چاہے وہ گھر بیٹھے ہوں یا چل پھر رہے ہوں۔[5]

توریت دنیا اور انسان کی تخلیق سے متعلق گفتگو سے شروع ہوتی ہے، بنی اسرائیل کے مصر اور کنعان کے سفروں کے متعلق معلومات فراہم کرتی ہے اور موسیٰؑ کی وفات کے ساتھ اس کا اختتام ہو جاتا ہے۔ یہ یہودیوں کو دیے گئے اخلاقی اور رسمی قوانین کے متعلق بتلاتی ہے، خدا کی آگاہی دیتی ہے اور اسے بطور خالق، قانون ساز اور نجات دہندہ پیش کرتی ہے۔ اس میں موجود بزرگوں کے بیانیوں میں شادی بیاہ سمیت وراثت، تعلقات عامہ اور اراضی کی تقسیمات کے حوالے سے احکامات کا علم ہوتا ہے۔ یہ احکامات یہودی سماجی، معاشی اور سیاسی زندگی کے متعلق معلومات کا ایک اہم ذریعہ بھی ہیں۔[6] ایک مذہبی یہودی کے نزدیک توریت مندرجہ ذیل خصوصیات سے معمور ہے:

1. یہ انصاف، محبت اور رحمدلی کی داستان ہے۔
2. یہ مقدس ایام، تہواروں اور عبادات کی رہنما ہے۔
3. یہ دیوانی و فوجداری سمیت زندگی گزارنے کے دیگر قوانین کا احاطہ کرتی ہے۔
4. یہ مذہبی، معاشرتی، سیاسی اور گھریلو نوعیت کے احکامات سے معمور ہے۔
5. یہ بنی اسرائیل کے مقدس تصور کی وضاحت کرتی ہے اور ان روحانی پیشواؤں کا بیان ہے جن سے تمام دنیا نے برکات حاصل کیں۔
6. یہ ایک ادبی شاہکار ہے جس میں قصوں کو ایسے بیان کیا گیا ہے، جو ایک مذہبی کتاب ہی کے شایان شان ہے۔

7. کسی یہودی کے لیے یہ مندرجہ بالا باتوں سے بھی بڑھ کر ہے کیونکہ یہ اس کے یہودی اور مذہبی ہونے کا ماخذ ہے۔7

مختصر یہ کہ توریت، یہودیت کا خلاصہ سمجھی جاتی ہے۔یہودی اس کو 54 حصوں میں تقسیم کرتے ہیں۔ہر ہفتے ایک حصہ پڑھا جاتا ہے۔ہر حصے کا پہلا جزو سبت کی شام کو پڑھا جاتا ہے اور سوموار اور جمعرات کی صبح کو دوہرایا جاتا ہے۔مکمل حصے کو سبت کی صبح پڑھا جاتا ہے۔ کبھی کبھی دو حصوں کو ملا کر پڑھا جاتا ہے تاکہ سال کے اندر اندر اسے ایک دفعہ ختم کر لیا جائے۔اسی طرح تہواروں میں بھی اس کی تلاوت کی جاتی ہے۔اس میں شامل کتب کا خلاصہ درج ذیل ہے:

کتابِ پیدائش

پیدائش توریت کی پہلی کتاب ہے، جسے عبرانی زبان میں "بیریشیت" کہا جاتا ہے۔ یہ کتاب دنیا اور اولین انسان کی تخلیق کی تاریخ ہے۔ اس میں آدمؑ و ہوا کا قصہ، ابراہیمؑ، اسحاقؑ، یعقوبؑ اور یوسفؑ کے ادوار اور ان کے خاندانوں کے متعلق معلومات درج ہیں۔ابراہیمؑ سے کیے گئے عہد کا ذکر بھی اس حصے میں آیا ہے جس کی وجہ سے یہ کتاب یہودیوں کے لیے خاصی اہم ہے۔اس میں ان کے مصر میں آباد ہونے تک کی تاریخ ہے۔

کتاب خروج

خروج توریت کی دوسری کتاب ہے۔اسے عبرانی زبان میں "شِموت" کہا جاتا ہے جس کا لفظی معنی "نام" ہے۔ عبرانیوں کے مصریوں کی غلامی سے نکلنے کے واقعات، صحرائے سینا میں قیام، خدا کی بنی اسرائیل پر عنایات، توریت اور احکام عشرہ کا حصول اس کتاب کے بنیادی مشمولات ہیں۔

کتاب احبار

احبار توریت کی تیسری کتاب ہے جسے عبرانی زبان میں "وایکراہ" اور لاطینی زبان میں لاوی کہا جاتا ہے۔یہ سمجھا جاتا ہے کہ یہ کتاب 1410 سے 1450 قبل مسیح کے درمیانی عرصے میں تصنیف کی گئی تھی۔اس کے ذریعے بنی اسرائیل کو ایک سچی اور بہتر زندگی گزارنا سکھایا گیا ہے۔ مذہبی پیشواؤں کو وہ احکام و قوانین فراہم کیے گئے ہیں جن پر عمل پیرا ہو کر وہ مذہبی معاملات بہتر انداز میں چلا سکتے ہیں۔اسی کتاب میں یہودیوں کو حلال و حرام غذا کا فرق بھی سمجھایا

گیا ہے۔

کتاب گنتی

گنتی توریت کی چوتھی کتاب ہے جسے عبرانی زبان میں "بامِدبار" کہا جاتا ہے۔ اس کے لفظی معنی "صحراؤں میں" کے ہیں۔ یہ کتاب صحرائے سینا میں موجود بنی اسرائیل کی مردم شماری سے شروع ہوتی ہے اور اس سفر کی مشکلات پر روشنی ڈالتی ہے۔ مزید یہ بنی اسرائیل کو دیے گئے اخلاقی ورسمی قوانین بیان کرتی ہے۔

کتاب استثنا

استثنا توریت کی پانچویں اور آخری کتاب ہے جسے عبرانی زبان میں "ذواریم" کہا جاتا ہے۔ اس میں موسیٰؑ کا ایک طویل خطبہ موجود ہے جو انہوں نے ارضِ موعود میں داخل ہونے سے پہلے بنی اسرائیل کو دیا اور تنبیہ کی کہ اگر انہوں نے خدا کو بھلا دیا تو ان پر کیسا برا وقت آسکتا ہے۔ اس کتاب کا خاتمہ موسیٰؑ کی وفات کے ساتھ ہوتا ہے۔

نبیوں کی کتب کی تقسیم

انبیائے متقدمین

انبیائے متاخرین

چھوٹے انبیا　　بڑے انبیا

نبی

عبرانی بائبل کا دوسرا حصہ نبیئیم (نبی) کہلاتا ہے۔ اس حصے میں انبیا کی آٹھ کتابیں شامل ہیں۔ اس کے علاوہ ایک کتاب میں بارہ انبیا کا تذکرہ ہے۔ یہ آٹھ کتابیں یوشعؑ کی رہنمائی میں بنی اسرائیل کے کنعان پہنچنے سے لے کر بابل میں ان کی جلاوطنی تک کا بتاتی ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ ان کتابوں میں انبیا کی ہدایات بھی موجود ہیں جو انہوں نے وقت پڑنے پر بنی اسرائیل کو دیں تاکہ وہ مشکل حالات کا مقابلہ کر سکیں اور بہت دیر ہو جانے سے پہلے پہلے خدا سے معافی مانگ لیں۔ توریت کے بعد انبیا کی کتب کو یہودیت میں سب سے بڑا درجہ حاصل ہے۔ ان آٹھ کتب کو دو بڑے حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلے حصے کو انبیائے متقدمین کہا جاتا ہے اور دوسرے حصے کو انبیائے متاخرین کہا جاتا ہے۔ انبیائے متقدمین میں یوشع، قضاۃ، سموئیل، سلاطین اور بادشاہ شامل ہیں جبکہ انبیائے متاخرین میں یسعیاہ، یرمیاہ، حزقی ایل اور بارہ نبی شامل ہیں۔ انبیائے متاخرین کو مزید دو حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے: بڑے انبیا اور چھوٹے انبیا۔ ان کو

بڑے چھوٹے میں تقسیم کرنا ان کی اہمیت میں کمی یا زیادتی کی وجہ سے نہیں بلکہ ان کی کتب کی لمبائی کی وجہ سے ہے۔ان کتب میں موجود واقعات کا خلاصہ دوسرے باب میں بیان ہو چکا ہے۔ ان کا مختصر تعارف ذیل میں درج کیا جا رہا ہے:

انبیائے متقدمین

1. کتابِ یوشع میں موسیٰؑ کی وفات سے لے کر یوشعؑ کی جانشینی تک کے واقعات درج ہیں۔ یہ بتایا گیا ہے کہ کس طرح آپؑ کی رہنمائی میں بنی اسرائیل دریائے اردن پار کر کے مختلف جگہوں پر آباد ہوئے۔اس کتاب کا اختتام آپؑ کے بنی اسرائیل کو دیے گئے ایک خطبے اور آپؑ کی وفات کے واقعات سے ہوتا ہے۔
2. کتاب قضاۃ میں بنی اسرائیل میں مختلف وقفوں سے بھیجے گئے بارہ قاضیوں یا منصفوں کے واقعات ہیں جنہوں نے مشکل وقت میں بنی اسرائیل کو سہارا دیا اور ان کو خدا کی عبادت کی طرف لے کر آئے۔
3. کتب سموئیل میں سموئیلؑ کی زندگی، بنی اسرائیل کو کی گئی نصیحتیں اور سلاطین کے ساتھ گزارے وقت کا بتایا گیا ہے۔
4. کتب سلاطین میں بادشاہوں کے ادوار، متحدہ اسرائیل کی تقسیم اور دونوں ریاستوں اور ہیکل سلیمانی کی تباہی کے واقعات درج ہیں۔

انبیائے متاخرین

1. کتابِ یسعیاہ ایک طویل کتاب ہے جو 66 ابواب پر مشتمل ہے۔اس میں کم از کم دو مختلف یسعیاہ کے واقعات ہیں جو دو مختلف اشخاص تھے۔ پہلے یسعیاہ آٹھویں صدی قبل مسیح کے دوران تھے اور دوسرے چھٹی صدی قبل مسیح کے۔ پہلے حصے میں بہت سی پیشین گوئیاں ہیں اور خدا کے عذاب کے متعلق خبر دی گئی ہے۔ دوسرے یسعیاہ والے حصے میں ایک ایسے دور کے متعلق بتایا گیا ہے جہاں خدا کے احکامات پورے ہونے کی وجہ سے امن و امان ہے۔
2. کتابِ یرمیاہ میں ہیکلِ سلیمانی کی تباہی اور یہودیوں کی جلاوطنی کے واقعات ہیں۔
3. کتابِ حزقی ایل میں عہد بابل میں کی گئی پیشن گوئیاں ہیں۔ یہ کتاب ہیکل سلیمانی کے دوبارہ بننے کے بعد روحانی پیشواؤں کو دیے گئے احکامات، قربانی اور عبادات وغیرہ کا بتاتی ہے۔

4. کتابِ ہوسیع ظاہری قربانی کی پستی اور اخلاقی سربلندی کی اہمیت بیان کرتی ہے۔

5. کتابِ یوایل میں یہودیوں کو معافی مانگنے کی ہدایات کی گئی ہیں۔ بنی اسرائیل کے دشمنوں کو وعید کی گئی ہے کہ ایک دن ان کو سزا ملنی ہے اور حکومت ان سے چھین لی جائے گی تاکہ یہودی قوم امن سے رہ سکے۔

6. کتابِ عموس میں لوگوں اور قوموں کے درمیان رحم دلی اور خدا ترسی کو فروغ دینے کی ہدایات ہیں۔

7. کتابِ عبدیاہ میں ادومیوں کے زوال کی روایات ہیں۔

8. کتابِ یوناہ میں گناہوں سے معافی مانگنے اور معافی کی اہمیت سے متعلق روایات ہیں۔

9. کتابِ میکاہ میں بنی اسرائیل کی نافرمانیوں کی وجہ سے یروشلم کی تباہی اور خدا کے احکامات پر عمل کی ہدایات ہیں۔

10. کتابِ ناحوم میں اشوریوں کی پستی اور اسرائیل کے لیے خوشیوں کی پیشن گوئیاں ہیں۔

11. کتابِ حبقوق میں برائی کے برے انجام کے متعلق خبردار کیا گیا ہے۔

12. کتابِ صفنیاہ میں بھی برے لوگوں کی تباہی کی پیشن گوئیاں اور معافی کی برکات و ثمرات کا ذکر کیا گیا ہے۔

13. کتابِ حجی میں یہودیوں کو جلاوطنی میں امن سے رہنے کی تلقین اور ہیکلِ سلیمانی کی تعمیر کے متعلق ہدایات ہیں۔

14. کتابِ زکریا میں زکریاؑ کے حوالے سے مایوس لوگوں کو امید دلانے کی روایات ہیں۔

کتابوں کی تقسیم

1. حصہ حکمت
2. حصہ مجلات
3. حصہ تاریخ

15. کتابِ ملاکی میں عبادات اور اخلاقی قوانین کی پیروی نہ کرنے پر تنبیہ کی گئی ہے۔ اس کے علاوہ مسیحا، قیامت اور دائمی امن کے متعلق معلومات مہیا کی گئی ہیں۔

کتابیں

کیتُویم، کتابیں یا تصنیفات عبرانی بائیبل کا تیسرا اور آخری حصہ ہے۔ اس حصے میں کل گیارہ کتابیں ہیں جن کو تین حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ پہلے حصے میں شاعری کی تین کتابیں

ہیں جن کے نام بالترتیب زبور، امثال اور ایوب ہیں۔ ان تین کتب سے مل کر حصہ حکمت و دانائی بنتا ہے۔ ان کو حصہ حکمت اس لیے کہا جاتا ہے کہ ان کتب میں قربانی اور رسمی عبادات وغیرہ کی بجائے علم و حکمت کی باتیں ہیں جو انسان کی عقلی رہنمائی کرتی ہیں۔ مجموعی طور پر ان تینوں کتابوں میں حکمت، ادب، شعر، غزل، تاریخ، مذہبی فلسفہ اور محبت پر بات کی گئی ہے۔ دوسرے حصے میں پانچ مجلات ہیں جو طوماروں میں لکھے گئے ہیں۔ ان میں سے ہر طومار مختلف یہودی تہواروں پر پڑھا جاتا ہے۔ مجلات میں غزل الغزلات، روت، نوحہ، واعظ اور آستر شامل ہیں۔ تیسرا حصہ تاریخی کتب پر مبنی ہے جن میں دانی ایل، عزرا و نحمیاہ اور تواریخ شامل ہیں۔ ان کتب میں جلاوطنی کے بعد کا زمانہ (586-300 ق۔م) اور ہیکل کی تعمیر نو کے متعلق معلومات درج ہیں۔ کتابوں کا مختصر تعارف درج ذیل ہے:

> **تنخ کے مشہور تراجم**
>
> 1. ترجمین 2. ہفتادی ترجمہ
>
> 3. پشیطتا 4. سامری ترجمہ

حصہ حکمت

1. زبور میں داؤدؑ کی 150 عبادات ہیں۔ یہ خدا کی محبت کے گیت اور نوحے ہیں۔
2. کتابِ امثال میں مختصراً راستباز زندگی گزارنے کی ہدایات ہیں۔
3. کتابِ ایوب میں ایوبؑ پر آنے والی سختیاں اور ان سے مقابلے کا ذکر ہے جن سے اچھائی اور برائی کے مفہوم کی وضاحت ہوتی ہے۔

حصہ مجلات

1. غزل الغزلات ایک محبت بھری نظم ہے جو مرد اور عورت کی روحانی و جسمانی یک جائی کی داستان ہے۔ اسے خدا اور انسان کی محبت کی علامت سمجھا جاتا ہے۔
2. کتابِ روت ایمانیات کی کتاب ہے جس میں خدا اور توریت پر ایمان کو بیان کیا گیا ہے۔ یہ ایک ایسی غیر یہودی عورت کا قصہ ہے، جو صدقِ دل سے خوش ہو کر خدا پر ایمان لائی تھیں اور شریعت کو اپنایا تھا۔
3. کتاب نوحہ ہیکل کی تباہی کی غمزدہ داستان ہے۔ چونکہ تیشا باؤ کے دن ہیکل تباہ ہوا تھا اس لیے تیشا باؤ کے تہوار پر اس کتاب کو پڑھا جاتا ہے۔

4. کتاب واعظ میں زندگی کے معنی، حقیقت اور اسے گزارنے کے اعلی مقاصد بیان کیے گئے ہیں۔اسے سکوت/عید خیام کے موقع پر فصل کی کٹائی کے وقت پڑھا جاتا ہے۔
5. کتابِ ایستر خدا سے وفاداری اور بنی اسرائیل کی ہمت کی داستان ہے۔اسے پیوریم کے تہوار پر پڑھا جاتا ہے۔

حصہ تاریخ

1. کتابِ دانی ایل، خدا کی طاقت اور حکمرانی کے متعلق معلومات فراہم کرتی ہے۔
2. کتابِ عزرا و نحمیاہ میں ہیکل سلیمانی کی تعمیر، عہدِ خداوندی کی تجدید اور توریت کے دوبارہ اکٹھے کرنے اور رواج پانے کے متعلق معلومات ملتی ہیں۔
3. تواریخ دو حصوں پر مبنی ہیں: تواریخ اول و دوم۔ان کتب میں یہودی تاریخ کو اجمالاً بیان کیا گیا جو دنیا کی تخلیق سے لے کر ہیکل سلیمانی کی تعمیر پر مشتمل ہے۔

مشہور تراجم

عبرانی بائیبل دنیا کی بیشتر زبانوں میں ترجمہ ہو چکی ہے جن میں سے کچھ تراجم زمانہ قدیم سے یہودیوں میں مشہور ہیں۔ذیل میں ان کا تعارف وتاریخی پس منظر بیان کیا گیا ہے۔

ترجمین

ترجمین آرامی زبان میں کیے گئے عبرانی بائیبل کے زبانی تراجم کو کہتے ہیں۔آرامی لفظ "ترجُم" کا اردو متبادل بھی ترجمہ ہی ہے۔جیسا کہ دوسرے باب میں بیان کیا جا چکا ہے کہ بابل میں غلامی کے درمیان یہودیوں سے عبرانی بائیبل کا اصل نسخہ کھو گیا تھا۔بعد میں عزراؑ نے ان کے لیے اسے جمع کیا۔یہود میں عبرانی کی بجائے آرامی زبان رواج پا چکی تھی۔اس دور میں ان کو عبرانی بائیبل کے مطالب سمجھانے کے لیے لاویوں کو مقرر کیا گیا تھا جو خصوصی طور پر توریت کا زبانی ترجمہ کر کے لوگوں کو مذہب کا علم دیا کرتے۔زبانی ترجمہ کے دو نسخے زیادہ مشہور ہیں:

1. ترجُم اونقیلسو جو توریت کی پانچ کتابوں کا ترجمہ ہے۔یہ دوسری صدی عیسوی میں احاطہ تحریر میں لایا گیا۔اسے یہودیوں کے ہاں مستند ترجمہ مانا جاتا ہے۔تلمود کے مطابق اس کے مصنف ایک رومی تھے جنہوں نے تنائیم کے دور (35-120) میں یہودیت قبول کی تھی۔[8]
2. ترجُم یوناتھن جو نبیوں کی کتب کا ترجمہ ہے۔اس ترجمہ نے یمنی یہودیوں میں رواج پایا۔اس

کے مصنف کو تلمود نے یوناتھن بن عزیل کے نام سے یاد کیا ہے۔[9]

ہفتادی ترجمہ

جیساکے دوسرے باب میں بیان کیا جاچکا ہے کہ یونانیوں کے زیر اثر یہودیوں میں یونانی زبان و ثقافت نے رواج پایا۔اس دور میں بیشتر یہودیوں کے لیے عبرانی ایک مشکل زبان بن گئی تھی۔ اس دور میں کیے جانے والے عبرانی بائیبل کے یونانی ترجمے کو ہفتادی ترجمہ کہتے ہیں۔ ایک روایت کے مطابق یونانی میں کیے گئے ترجمہ کو ابتدامیں مشکوک سمجھا گیا لیکن پھر ایک ایسا واقعہ ہوا جس نے ان کا اس ترجمے پر یقین مستحکم کر دیا۔واقعہ یوں ہے کہ ستر مختلف علمائے یہود جو ایک دوسرے کو نہیں جانتے تھے جب مذہبی ادب کا ترجمہ کرتے ہیں تو سب کے تراجم بالکل ایک جیسے ہوتے ہیں۔ تراجم کی اس مماثلت نے لوگوں کو یقین دلادیا کہ یہ درست ترجمہ ہے۔ ستر لوگوں کی نسبت ہی سے اس ترجمہ کو ہفتادی کہا گیا ہے۔

کچھ دستاویزات سے یہ بھی علم ہوتا ہے کہ اس ترجمے کے لیے ہدایات اسکندریہ سے بطلیموس دوم (285-246ق۔م) کی جانب سے یروشلم میں کاہن اعظم کو موصول ہوئیں تھیں جس میں یہ کہا گیا تھا کہ یہودیوں کے بارہ قبیلوں میں سے چھ چھ شخص چن کر بھیجے جائیں جو شریعت کو اچھی طرح سمجھتے ہوں اور ترجمہ کرنے پر قادر ہوں۔ جب ترجمہ مکمل ہوا تو یہودیوں کو اکٹھا کر کے ان کے سامنے اس ترجمے کو اونچی آواز میں پڑھا گیا۔ ترجمہ سن کر یہودیوں کے بڑے بوڑھوں نے اس ترجمے کی صداقت کی توثیق کی۔[10] بہت سے یہودیوں کے نزدیک یہ ترجمہ مشکوک ہے لہذا وہ اس میں شامل کتب، مثلاً مکابیین اور سیراخ پر عبرانی بائیبل کی دیگر کتب کی طرح اعتقاد نہیں رکھتے۔ بعض مصنفین نے عبرانی اور یونانی تراجم کا موازنہ کر کے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ اس ترجمے کا ایک مقصد یہودیوں کو یونانیت کی طرف لے جانا تھا۔[11]

پشیطتا

پشیطتا/پشیتتہ سریانی زبان کا لفظ ہے جس کا مطلب "سادہ نسخہ" ہے۔ یہ ترجمہ جو سریانی زبان میں کیا گیا سریانی کلیساؤں میں رائج رہا ہے۔ عصر حاضر میں اس کے کئی نسخے دریافت ہوئے ہیں جن کی تعداد 200 سے زائد ہے۔ خیال کیا جاتا ہے کہ شاید یہ 200 عیسوی کے قریب لکھا گیا۔ حالانکہ اس میں عبرانی بائیبل کا مکمل ترجمہ موجود ہے تاہم اس نے زیادہ تر مسیحیوں ہی میں

رواج پایا۔ کچھ مصنفین کا استدلال ہے کہ اس میں موجود داخلی ثبوت اس بات کے عکاس ہیں کہ یہ ترجمہ اصل عبرانی زبان سے کیا گیا تھا جس وجہ سے اس کا تعلق یہودیت اور مسیحیت دونوں سے ہے۔[12] بہر کیف یہودیوں کے ہاں یہ ترجمہ زیادہ مقبول نہیں ہو پایا۔ شاید اس کی وجہ اس کا کلیساؤں میں رواج پانا ہے۔

سامری ترجمہ

سامری خود کو اسرائیلی گروہ سمجھتے ہیں جو اپنا سلسلہ نسب یوسفؑ اور لاوی سے شروع کرتے ہیں۔ اولین دور میں سامریوں نے یہودیوں ہی کے ایک فرقے کے طور پر رواج پایا اور سامری زبان میں توریت کا ترجمہ کیا۔ یہودی جس عبرانی متن پر بھروسہ کرتے ہیں اسے مسورتی متن کہا جاتا ہے۔ مسورتی اور سامری متن باہم مختلف ہیں۔ اس لیے یہودیوں کے ہاں اس ترجمے کو مستند نہیں سمجھا جاتا۔ سامری نسخے کے مطابق یہ احکام عشرہ کا حصہ ہے کہ تمام قربانیاں جبل جرزیم پر ادا کی جائیں۔ سامری ترجمہ میں جبل جرزیم کو ہی قربان گاہ تعمیر کرنے کی جگہ بتایا گیا ہے۔ اس کے برعکس مسورتی متن کے احکام عشرہ میں یہ حکم موجود نہیں ہے۔

عصر حاضر کے تراجم

چونکہ مسیحیوں کے نزدیک بھی عبرانی بائیبل، مقدس کتاب ہے لہذا بہت سے مسیحیوں نے بھی اس کا ترجمہ کیا ہے۔ اس کا مشہور نام بائیبل یا عہد نامہ قدیم بھی مسیحیت ہی سے رواج پایا۔ بائیبل یونانی زبان کا لفظ ہے جس کا مطلب "کتاب" ہے۔ عبرانی بائیبل کے یہودی اور مسیحی نسخوں میں ترتیب کا فرق ہوتا ہے۔ انگریزی بولنے والے علاقوں میں رہائش پذیر یہودی زیادہ تر مسیحیوں کی ترتیب دی ہوئی بائیبل خصوصاً کنگ جیمز ورژن استعمال کرتے ہیں جو ان کے نزدیک اس لیے درست ہے کہ یہ عبرانی سے ترجمہ کی گئی تھی۔ عبرانی بائیبل کو سب سے پہلے 1488 عیسوی میں اٹلی سے شائع کیا گیا۔ بعد میں اس کا ایک عبرانی ترجمہ اور ربیائی تفاسیر 1516 عیسوی میں دانیال بومبرگ (تقریبا 1483-1549) نے شائع کی جو ایک مسیحی تھے۔ اس کے بعد سے بہت سے نسخے شائع ہو چکے ہیں جن کی بنیاد مسورتی متن یعنی وہ عبرانی متن ہے جو عام طور پر یہودیوں کے ہاں رائج ہے۔[13] مسیحیوں نے بائیبل کا تقریباً ہر زبان میں ترجمہ کر دیا ہے۔ کچھ ایسے نسخے بھی شائع ہوئے ہیں جو تفاسیر سے بھی مزین ہیں۔ مشہور برطانوی ربی

جوزف ہر من ہر ٹز(1872-1946) کا شائع کردہ توریت کا نسخہ بھی کافی مقبول ہے۔اس کے علاوہ جیوش پبلیکیشن سوسائٹی کے تراجم اور آرٹ سکرول کے ترجمہ کو خصوصی مقبولیت حاصل ہے جس پر عبرانی اور انگریزی ساتھ ساتھ ہیں۔

زبانی قانون

ربیوں کا یہ کہنا تھا کہ موسیٰؑ کو کوہ سینا پر دو قوانین دیے گئے تھے: "لکھا ہوا قانون" یعنی تنخ اور "زبانی قانون" جس کے وہ خود امین ہیں۔ یہ زبانی قانون ہی ہیکل کی تباہی کے بعد کی یہودیت جسے ربیائی یہودیت کہا گیا کے رواج کا سبب بنا۔ وجہ یہ تھی کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بہت سے ایسے سوالات اٹھنے لگے جن کے متعلق براہ راست معلومات شریعت میں موجود نہیں تھیں۔ خاص طور پر جب وہ لوگ جلا وطنی کی زندگی گزار رہے تھے یا بابل اور فارس کے علاقوں میں رہائش پذیر تھے تو ان کا طرزِ زندگی تبدیل ہو چکا تھا۔ یہ نیا طرزِ زندگی اپنے ساتھ نئی مشکلات اور سوالات لے کر آیا۔ اب ان کے مذہبی پیشوا آپس میں مل بیٹھ کر ہر نئے آنے والے مسئلے پر گفتگو کرتے اور یہ دیکھنے کی کوشش کرتے کہ ان کے آباؤاجداد نے اس مسئلے یا اس سے ملتے جلتے مسئلے کے لیے کیا حل پیش کیا تھا۔ اس گفتگو کو محفوظ کر لیا جاتا تھا تاکہ اگر بعد میں اس قسم کا مسئلہ درپیش ہو تو زیادہ دقت نہ ہو۔ یہاں یہ ملحوظ خاطر رکھا جاتا تھا کہ جو مسائل براہِ راست عبرانی بائبل میں موجود ہیں ان پر بحث نہ کی جائے۔ بعد ازاں جب ہیکل بھی رومیوں نے تباہ کر کے ان کو غلام بنا لیا تو مسائل مزید بڑھ گئے۔ سب سے بڑا سوال تو یہ تھا کہ یہودیت تو ہیکل کے ساتھ مشروط تھی جو تباہ کر دیا گیا۔ لہٰذا اب یہودیت کو کیسے اپنایا جائے؟ اس سوال کا جواب بیشتر یہودیوں میں زبانی قانون کی صورت میں رواج پایا۔

مشنا

تقریباً 200 عیسوی میں زبانی قانون کو بھی ایک کتاب کی صورت میں مرتب کر لیا گیا جسے مشنا کہتے ہیں۔ یہ ایک طرح سے موسیٰؑ کی حدیث اور بعد کے ربیوں کے فقہی اجتہادات ہیں جو انہوں نے فروعی مسائل کے متعلق پیش کیے۔ جیسا کہ دوسرے باب میں تفصیلاً ربیوں کا ظہور اور بابل میں ربیائی یہودیت کے فروغ کے متعلق بتایا گیا ہے کہ ہیکل کی تباہی کے بعد ربیوں نے

مذہب کی خدمت کا بیڑہ اٹھایا۔ مختلف مسائل پر ربی ہی مذہبی بحثیں کیا کرتے جو ابتدا میں توز بانی لوگوں کو بتائی جاتی رہیں اور سینہ بہ سینہ منتقل ہوئیں تاہم بعد میں انہیں لکھے جانے کا بھی اہتمام کیا گیا۔ یہودی عقیدے کے مطابق زبانی قانون ان کا خود کا بنایا ہوا نہیں ہے بلکہ یہ وہی اضافی احکامات ہیں جو خدا نے موسیٰؑ کو زبانی دیے اور بعد میں سینہ بہ سینہ منتقل ہوئے۔[14] ربیائی یہودیت میں لکھے ہوئے اور زبانی دونوں قوانین مساوی اہمیت رکھتے ہیں۔ جبکہ صدوقی، سامری اور قرائٹ جیسے فرقوں کے ہاں زبانی قانون کی کوئی خاص اہمیت نہیں۔

مشنا کا لفظی مطلب "دوہرا کر پڑھنا" ہے۔ ربیائی یہودیت میں اسے سب سے اہم کتاب تصور کیا جاتا ہے۔ ایک روایت کے مطابق یہودا ہناسی نے اسے مرتب کیا اور اس پر نظر ثانی کی۔ اس کے 6 بڑے حصے ہیں جو "سیدر" کہلاتے ہیں۔ سیدر 63 رسائل میں منقسم ہیں جنہیں "مسوخت" کہتے ہیں۔ ہر مسوخت میں کئی ابواب ہیں جنہیں "ہلوخت" کہا جاتا ہے۔ ہر ہلوخت کے متعدد پیراگراف ہیں جنہیں "مشنایات" کہا جاتا ہے۔ مشنایات، مشناہی کی جمع ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ ہلوخت میں شامل ہر پیراگراف کو بھی مشناہی کہتے ہیں اور پوری کتاب بھی مشناہی کہلاتی ہے۔ ذیل میں سیدروں کا خلاصہ درج کیا جارہا ہے:

1. سیدر زرعیم میں لفظ زرعیم اردو لفظ زراعت ہی کی طرح ہے جس کا مطلب "بیج" ہے۔ جیسا کہ نام سے ظاہر ہے اس میں زراعت سے متعلق شرعی قوانین درج ہیں۔ اس میں کل 11 مسوخت ہیں۔
2. سیدر موعید بھی اردو کے لفظ عید کی طرح ہے جس کا مطلب "تہوار" ہیں۔ اس سیدر میں موجود 11 ابواب تہواروں کے متعلق معلومات فراہم کرتے ہیں۔
3. سیدر ناشیم یعنی "نساء۔" اس سیدر میں 10 مسوخت ہیں جو عورتوں سے متعلق قوانین بیان کرتے ہیں۔
4. سیدر نیزقین یعنی "نقصانات۔" اس سیدر میں 10 مسوخت ہیں جو دیوانی و فوجداری قوانین سے متعلقہ ہیں۔
5. سیدر کدوشیم یعنی "مقدسات۔" اس سیدر میں 11 مسوخت ہیں جن میں ہیکل سے متعلق قوانین اور حلال و حرام کا بتایا گیا ہے۔

6. سیدر طہروت یعنی "طہارت۔" اس سیدر میں طہارت سے متعلق قوانین ہیں جو 12 مسوختوں میں منقسم ہیں۔

جیمارا

مشنا کی تکمیل 200 عیسوی میں ہو گئی تھی تاہم آنے والا وقت اپنے ساتھ نئے مسائل لے کر آرہا تھا۔ جیسا کہ دوسرے اور تیسرے باب میں بتایا گیا ہے کہ یہودیوں نے مختلف قوموں کے ساتھ وقت گزارا جس سے ان کے مسائل کی نوعیت بھی بدلتی رہی۔ اب وہ مسائل سامنے آنے لگے جو نہ ہی عبرانی بائیبل سے حل ہوتے تھے اور نہ ہی مشنا سے۔ اس صورتحال سے نپٹنے کے لیے ربیوں نے نئے قانون اور نئی تشریحات متعارف کروانا شروع کیں جو بعد میں جیمارا/گمارا میں اکٹھی کی گئیں۔ جیمارا دو طرح کی تھیں جنھیں الگ الگ یروشلم اور بابل میں تصنیف کیا گیا تھا۔ مشنا میں موجود کچھ مسوختوں کی مزید تشریحات یروشلم کی جیمارا میں اور کچھ بابلی جیمارا میں ملتی ہیں۔ جیمارا میں معلومات بھی دو طرح کی ہیں جن میں سے ایک کو "ہگدا" کہا جاتا ہے اور دوسری کو "ہلاخا۔ "ہگدا سے مراد ایسے مذہبی قصے اور کہانیاں ہیں جو تعلیم و تربیت اور تفریحی مقاصد کے لیے سنائے جاتے ہیں۔ ہلاخا میں یہودی قانون کے متعلق روایات، فتاوی اور بحثیں ہیں۔ آمورائیم کا زمانہ جیمارا کا زمانہ ہے۔ یروشلم میں جیمارا تقریباً 350 سے 400 عیسوی کے دوران اور بابلی جیمارا تقریباً 500 عیسوی تک لکھی گئی۔ ان کی تکمیل میں تقریباً 100 برس مزید گزر گئے۔ اس لیے جیمارا کا زمانہ تقریباً 600 عیسوی سمجھا جاتا ہے۔[15]

تلمود

مشنا اور جیمارا مل کر تلمود بناتی ہیں۔ تلمود کا لفظی مطلب "پڑھنا" ہے۔ تلمود کی تاریخ دوسرے باب میں گزر چکی ہے۔ جیمارا دو جگہ لکھی گئی اور چونکہ جیمارا تلمود کا ہی ایک حصہ ہے لہذا تلمود بھی دو ہیں جن میں سے ایک یروشلم میں مرتب ہوئی اور دوسری بابل میں۔ بابلی تلمود کو عبرانی میں "باولی" بھی کہا جاتا ہے۔ فلسطینی تلمود میں 39 مسوخت ہیں اور بابلی تلمود میں 37 مسوخت ہیں جو عبرانی اور آرامی دونوں زبانوں میں لکھے گئے ہیں۔ تلمود میں قانون، تاریخ، اخلاقیات اور مختلف ربیوں کی سوانح عمریاں اکٹھی درج ہیں۔ پڑھنے کے لحاظ سے یہ ایک مشکل کتاب ہے کیونکہ بعض دفعہ اس میں بحثیں اتنی لمبی ہو جاتی ہیں کہ اصل مسئلہ جس سے بحث

شروع ہوئی تھی بہت پیچھے رہ جاتا ہے۔ نیز اس میں مسائل کو ایسے دوربیوں کے درمیان اس طرح حل ہوتے بھی دکھایا گیا ہے جن کے زمانے الگ الگ تھے۔ چونکہ فلسطینی تلمود کو نامکمل مان لیا گیا اس لیے بابلی تلمود یہودیوں کے ہاں مستند حیثیت اختیار کر گئی جس کے احکامات سے روگردانی مذہب سے روگردانی تصور کی جانے لگی۔

دیگر مذہبی کتب و اصناف

عبرانی بائیبل اور تلمود کے علاوہ یہودیوں میں درج ذیل کتب اور اصنافِ ادب مشہور ہیں جنہیں ان کی اہمیت کی بنیاد پر مقدس تصور کیا جاتا ہے۔

غیر ملہم کتب

غیر ملہم کتب کو سمجھنے سے پہلے یہودیت میں فہرست مسلمہ کی روایت کا مختصر بیان ضروری ہے۔ تقریبا 90-100 عیسوی میں ربیوں نے یہ فیصلہ کیا کہ نبوت کا سلسلہ ختم ہو گیا ہے لہذا ضرورت اس امر کی ہے کہ عبرانی بائیبل میں شامل کتب کی ایک فہرست مدون کی جائے جو سب یہودیوں کے لیے مسلمہ ہو۔ اس کے لیے انہوں نے کچھ شرائط طے کیں، مثلاً یہ کہ ملاکیؑ چونکہ آخری نبی تھے اس لیے اب نبیوں کی آخری کتاب ملاکی ہی ہے۔ عزراؑ کی تعلیمات آخری تعلیمات ہیں، ان کے بعد تعلیمات کا سلسلہ بند ہوا۔ اس کے بعد کی کتب کو مسلمہ فہرست میں شامل نہیں کیا جائے گا۔ باہم طے کر کے 100 عیسوی کے قریب ربیوں نے فیصلہ دے دیا کہ کن کتب کو فہرست مسلمہ میں شامل کرنا چاہیے۔ جو کتب فہرست مسلمہ میں شامل ہوئیں انہیں مستند مانا گیا اور جنہیں یہ درجہ نہ مل سکا ان میں سے زیادہ تر غیر ملہم کتب/اپاکرفا تصور کی گئیں۔[16] جیسا کہ دوسرے باب میں بتایا جا چکا ہے کہ جب یونانیوں کے زیرِ اثر یہودیوں میں ہیلینیت کا عروج ہوا تو یونانی زبان و فلسفہ سے متاثر ہو کر متعدد کتب لکھی گئیں۔ ان میں سے بیشتر کتب کو غیر ملہم کتب مانا گیا۔ انہیں نظر انداز کرنے کی بجائے عام لوگوں سے پوشیدہ کر دیا گیا۔ اسی لیے اپاکرفا جو ایک لاطینی لفظ ہے اس کا مطلب ہی خفیہ یا غیر مستند ہے۔

غیر ملہم کتب میں مکابیوں کی کتابیں مشہور ترین ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ مکابیین چار کتب تھیں جن میں سے کوئی کتاب بھی عبرانی میں ہم تک نہیں پہنچ سکی۔ کچھ مکابی کتب کا ترجمہ یونانی

میں ہوا جو ہفتادی ترجمہ کا حصہ بنیں۔ یہ کتابیں مکابی خاندان کو توریت کے ہیرو کی طرح بھی پیش کرتی ہیں جنہوں نے نہ صرف شریعت کی حفاظت کی بلکہ ہیکل الہی کی سالمیت کے لیے بھی سر دھڑ کی بازی لگادی۔ اول مکابیین اس بات سے بحث کرتی ہے کہ کس طرح سکندر کے دور میں فتوحات ہوئیں اور یہودی، یونانیوں کے زیر سایہ آتے گئے۔ انطیوقس کے سپاہیوں نے کس طرح یہودیوں کو امن کا پیغام سنا کر دھوکا دیا اور بلا اشتعال قتل و غارت کی۔ یہ کتاب متت یاہ یا متاتھیاس کے متعلق بھی معلومات فراہم کرتی ہے جو یہودا مکابی کا باپ تھا اور جس نے یونانی دیوتاؤں کو سجدہ کرنے سے انکار کر کے اپنا گروہ ان کے ساتھ جنگ کرنے کے لیے ترتیب دیا۔ دوم مکابیین انطیوقس کے خلاف بغاوت کا بیان اور یہودا مکابی کی شجاعت کی داستان ہے۔ سوم مکابیین مصر میں یہودیوں کی آزادی کے متعلق معلومات فراہم کرتی ہے اور چہارم مکابیین میں انطیوقس کے دور میں یہودیوں پر کیے گئے ظلم و ستم کی تصویر کشی کی گئی ہے۔

ہلاخا

یہودی قانون بحیثیت مجموعی ہلاخا کہلاتا ہے جس کی بنیاد عبرانی بائیبل، تلمود اور قانون کی دیگر کتابیں مثلاً، **شولحان عاروخ** وغیرہ پر ہے۔ چونکہ تلمود اور مشنا کی روایات گنجلک اور لمبی ہیں جن سے براہ راست کسی مسئلے کے متعلق جاننا دشوار ہے تو انہیں بنیاد بنا کر بعد میں آنے والے ربیوں نے ہلاخا کو ترتیب دیا۔ ہلاخا خود میں کوئی کتاب نہیں ہے البتہ اس صنف پر بہت سی کتب موجود ہیں جن میں ابن میمون کی **مشنا توریت** اور یعقوب بن آشر (تقریبا1269-1343) کی **اربعہ طوریم** وغیرہ خاصی اہمیت کی حامل ہیں۔ ہلاخا کے متعلق یہودی فرقوں میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ کچھ فرقے تو اسے خدائی قانون کے مساوی سمجھتے ہیں اور کچھ اس کو آج کے زمانے کے لیے مؤثر نہیں مانتے، مثلاً اصلاح شدہ یہودیوں کا یہ کہنا ہے کہ ہلاخا فی زمانہ یہودیوں کے مسائل حل کرنے سے قاصر ہے۔ اسرائیل کی سرکاری ویب سائٹ کے مطابق تلمود اور مشنا "درست ضابطہ حیات نہیں ہیں۔"[17] چنانچہ ہلاخا میں فتاوی اور رسمی ضابطہ بندی کی اصناف شامل کی گئی ہیں۔

1. فتاوی سے مراد ربیوں کے وہ جواب ہیں جو وہ سائلین کو کسی خاص مسئلے کے متعلق دیا کرتے تھے، مثلاً جس طرح مسلمانوں میں مفتی کسی فقہی مسئلے پر کوئی فیصلہ دیتا ہے اسی طرح ربی عام یہودیوں کے مسائل پر انہیں مذہبی رائے مہیا کرتے تھے جو اگرچہ اس مسئلے کا مستقل

حل نہ بھی ہو، اس زمانے کے لیے حل فراہم کر دیتی تھی۔ ان فتاوی کی بنیاد عبرانی بائبل اور تلمود جیسی مقدس یہودی کتب ہی ہوتی تھیں۔

2. رسمی ضابطہ حیات میں تیار شدہ قوانین موجود ہیں جو کسی مسئلے کا فوری حل ہیں۔ فتاوی چونکہ مستقل اور فوری حل نہیں ہوتا تھا لہذا یہودیوں کے بہت سے عالموں نے ایسے قوانین ترتیب دیے ہیں جو رسمی ضابطہ حیات کے طور پر مشہور ہیں۔ ان میں اسحاق بن یعقوب الفاسی (1013-1103) کی **سفر ہلخوت** نہایت اہم تصور کی جاتی ہے۔

سیدور

سیدور یہودی عبادات کی کتب کے مجموعے کو کہتے ہیں جو تاریخ کے مختلف ادوار میں سعدیا گاون اور موسی ابن میمون جیسے ربیوں نے توریت اور دیگر یہودی مقدس کتب سے دعائیں اور مناجات اخذ کر کے ترتیب دیں۔ عصر حاضر میں بھی سیدور ترتیب دی جاتی ہیں۔ ان کتب کا بنیادی مقصد مختلف تہواروں، دنوں اور مواقع پر عبادات کو فروغ دینا ہے۔ یہودی عقیدے کے مطابق یہ کتب انسان کو خدا سے قریب کرتی ہیں اور ایک طرح سے اس سے بات کرنے کا ذریعہ ہیں۔ عصر حاضر کے یہودی فرقوں نے اپنے حساب سے سیدور مرتب کی ہیں۔

مدراش

تلمود ہی کی طرح مدراش بھی ربیائی یہودیت کی اہم روایت ہے۔ اسے عبرانی بائبل کے متعلق قصے کہانیوں، داستانوں اور خطبات کا مجموعہ سمجھا جاتا ہے۔ اس لحاظ سے یہ عبرانی بائبل کی غیر رسمی تفسیر ہے۔ تلمود ہی کی طرح اس کی ترتیب کو سمجھنا بھی مشکل ہے کیونکہ کبھی تو یہ ایک ہی بات کو بار بار دہراتی ہے، کبھی ان باتوں میں آپسی تضادات سامنے آتے ہیں اور کبھی ایک آدھ جملے ہی میں بات ختم کر دی جاتی ہے۔ ان تفسیرات کی خوبی یہ ہے کہ تقریباً ان میں سے ہر ایک بات کو عبرانی بائبل کے حوالے سے بیان کیا جاتا ہے۔ ان کا زمانہ تصنیف دوسری صدی عیسوی سمجھا جاتا ہے۔ مدراش کی دو بڑی قسمیں یا حصے ہیں:

1. مدراش ہلاخا یعنی وہ کہانیاں اور تعلیمات جو یہودی قانون کی وضاحت کرتی ہیں۔
2. مدراش ہگدا یعنی عبرانی بائبل کی اخلاقی اقدار کی وضاحت پر مبنی روایات اور قصے۔

بحر میت کے مخطوطات

بحر میت کے مخطوطات سے مراد وہ قدیم دستاویزات ہیں جو سب سے پہلے 1947 میں دریافت ہوئیں۔ زیادہ تر مخطوطات طوماروں پر مبنی ہیں جو وادی قمران کے گیارہ غاروں سے ملے۔ان کی زبان عبرانی، آرامی اور یونانی ہے۔ زیادہ تر طومار عبرانی بائیبل کے ہیں جن میں ترجم اور ہفتادی ترجمہ کے نسخے بھی شامل ہیں۔ کچھ مخطوطات زبور، کتاب سیراخ، کتاب اخنوخ اور کتاب جوبلی وغیرہ کے ہیں جنھیں یہودی فہرست مسلمہ میں شامل نہیں کرتے۔اس کے علاوہ کچھ اور مخطوطات بھی ہیں جن سے مختلف یہودی فرقوں کے متعلق معلومات ملتی ہیں۔ ان مخطوطات سے عبرانی بائیبل اور فلسطین کی تاریخ کو مرتب کرنے میں مدد ملی ہے۔انہیں عبرانی بائیبل کے قدیم ترین دریافت شدہ نسخے سمجھا جاتا ہے جن کی تاریخ 2300 سال پرانی ہے۔

مشقی سوالات

مختصر سوالات

1. تنخ سے کیا مراد ہے؟
2. عبرانی بائیبل کیسے کاغذ پر لکھی گئی؟
3. تنخ کی زبان کیا ہے؟
4. توریت کسے کہتے ہیں؟
5. توریت کے مختلف نام لکھیں؟
6. سوفر کسے کہتے ہیں؟
7. کتاب پیدائش کا تعارف لکھیں؟
8. کتاب خروج کا تعارف لکھیں؟
9. کتاب احبار کا تعارف لکھیں؟
10. کتاب گنتی کا تعارف لکھیں؟
11. کتاب استثنا کا تعارف لکھیں؟
12. نبیوں میں کل کتنی کتابیں ہیں؟
13. نبیوں کی کتب کو کن دو حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے؟
14. انبیائے متقدمین میں کونسی کتب شامل ہیں؟
15. انبیائے متاخرین میں کونسی کتب شامل ہیں؟
16. کتاب یوشع کا تعارف لکھیں؟
17. کتاب قضاۃ کا تعارف لکھیں؟
18. کتب سموئیل کا تعارف لکھیں؟
19. کتب سلاطین کا تعارف لکھیں؟
20. کتاب یسعیاہ کا تعارف لکھیں؟

21. کتاب یرمیاہ کا تعارف لکھیں؟
22. کتاب حزقی ایل کا تعارف لکھیں؟
23. کتاب ہوسیع کا تعارف لکھیں؟
24. کتاب یوایل کا تعارف لکھیں؟
25. کتاب عموس کا تعارف لکھیں؟
26. کتاب عبدیاہ کا تعارف لکھیں؟
27. کتاب یوناہ کا تعارف لکھیں؟
28. کتاب میکاہ کا تعارف لکھیں؟
29. کتاب ناحوم کا تعارف لکھیں؟
30. کتاب حبقوق کا تعارف لکھیں؟
31. کتاب صنفیاہ کا تعارف لکھیں؟
32. کتاب حجی کا تعارف لکھیں؟
33. کتاب زکریا کا تعارف لکھیں؟
34. کتاب ملاکی کا تعارف لکھیں؟
35. کیتوویم میں کتنی کتابیں شامل ہیں؟
36. کیتویم کے موضوعات کیا ہیں؟
37. کیتویم کے حصوں کے نام لکھیں؟
38. زبور کا تعارف لکھیں؟
39. کتاب امثال کا تعارف لکھیں؟
40. کتاب ایوب کا تعارف لکھیں؟
41. غزل الغزلات کا تعارف لکھیں؟
42. کتاب روت کا تعارف لکھیں؟
43. کتاب نوحہ کا تعارف لکھیں؟
44. کتاب واعظ کا تعارف لکھیں؟
45. کتاب ایستر کا تعارف لکھیں؟
46. کتاب دانی ایل کا تعارف لکھیں؟
47. کتاب عزرا و نحمیاہ کا تعارف لکھیں؟
48. تواریخ کا تعارف لکھیں؟
49. تنخ کے مشہور تراجم کے نام لکھیں؟
50. عصر حاضر میں تنخ کے کونسے تراجم مشہور ہیں؟
51. ترجمین کسے کہتے ہیں؟
52. ترجم انقلیسو کا تعارف لکھیں؟
53. ترجم یوناتھن کا تعارف لکھیں؟
54. ہفتادی ترجمہ کس کہتے ہیں؟
55. سامری ترجمہ کا تعارف لکھیں؟
56. پشیطتا کسے کہتے ہیں؟
57. زبانی قانون سے کیا مراد ہے؟
58. مشنا کسے کہتے ہیں؟
59. مشنا کا لفظی مطلب کیا ہے؟
60. سیدر کسے کہتے ہیں؟
61. مسوخت کسے کہتے ہیں؟
62. ہلوخت کسے کہتے ہیں؟
63. مشنایات کسے کہتے ہیں؟
64. مشنا کی ترتیب کیا ہے؟
65. سیدر زرعیم کا تعارف لکھیں؟
66. سیدر موعید کا تعارف لکھیں؟

67. سیدر ناشیم کا تعارف لکھیں؟
68. سیدر نزقین کا تعارف لکھیں؟
69. سیدر کدوشیم کا تعارف لکھیں؟
70. سیدر طہروت کا تعارف لکھیں؟
71. جیمارا کسے کہتے ہیں؟
72. جیمارا کے نسخوں کے نام لکھیں؟
73. تلمود کسے کہتے ہیں؟
74. تلمود کے نسخوں کے نام لکھیں؟
75. ہلاخا کسے کہتے ہیں؟
76. غیر ملہم کتب سے کیا مراد ہے؟
77. مدراش کا تعارف لکھیں؟
78. بحر میت کے مخطوطات کیا ہیں؟
79. سیدور کسے کہتے ہیں؟
80. سیدور کیوں لکھی گئیں؟

تفصیلی سوالات

1. تنخ پر نوٹ لکھیں۔
2. عبرانی بائیبل پر نوٹ لکھیں۔
3. توریت پر نوٹ لکھیں۔
4. تنخ کے تراجم پر نوٹ لکھیں۔
5. زبانی قانون پر نوٹ لکھیں۔
6. مشنا پر نوٹ لکھیں۔
7. جیمارا پر نوٹ لکھیں۔
8. تلمود پر نوٹ لکھیں۔

حوالہ جات

[1] Kenneth Atkinson, *Judaism* (Philadelphia: Chelsea House Publishers, 2004), 39.

[2] Martha A. Morrison and Stephen F. Brown, *Judaism*, ed. Joanne O'Brien and Martin Palmer, World Religions (New York: Chelsea House Publishers, 2009), 25.

[3] Cohn-Sherbok, *Judaism: History, Belief and Practice*, 29.

[4] دوم سموئیل 9:12

[5] استثنا 8:6

[6] Morrison and Brown, *Judaism*, 23.

[7] Milton Steinberg, *Basic Judaism* (New York: HBJ, 1975), 20-21.

[8] Avodah Zarah.11a

[9] Megillah 3a

[10] Harry M. Orlinsky, "The Septuagint and its Hebrew Text," in *The*

Cambridge History of Judaism: The Hellenistic Age, ed. William David Davie and Louis Finkelstein (Cambridge: Cambridge University Press, 2008), 537.

[11]Kent, *A History of the Jewish People During the Babylonian, Persian, and Greek Periods*, 302.

[12]Michael P. Weitzman, *The Syriac Version of the Old Testament (University of Cambridge Oriental Publications)* (New York: Cambridge University Press, 1999), 1.

[13]Lange, *An Introduction to Judaism*, 48.

[14]Atkinson, *Judaism*, 43.

[15]Wayne Dosick, *Living Judaism: The Complete Guide to Jewish Belief, Tradition, and Practice* (HarperCollins ebooks, 2009), 98.

[16]Ibid., 92.

[17]https://mfa.gov.il/MFA/IsraelExperience/AboutIsrael/Spotlight/Pages/Jewish%20Sacred%20Texts.aspx, accessed on 27-04-2021.

پانچواں باب: عقائد و عبادات

عقائد

ظاہری طور پر یہودیوں کے پاس ایسا کوئی خاص نظام یا قاعدہ موجود نہیں ہے جس کی رو سے یہ کہا جاسکے کہ وہ کن مخصوص عقائد کی پیروی کرتے ہیں۔الہامی مذاہب میں خدا پر ایمان لانا ایک بنیادی عقیدہ ہے تاہم "ملحد یہودی" جیسے تصور نے اس عقیدے کو بھی متاثر کیا ہے۔یہودی خود بھی اس معاملے میں اختلاف کا شکار ہیں کہ کیا رسمی عقیدے جیسی کوئی چیز مذہب میں موجود بھی ہے یا نہیں؟اس معاملے میں ایک فریق یہ کہتا ہے کہ یہودیت میں عقائد جیسی کوئی چیز نہیں؛ صنہادرین تک نے ایسی کوئی وضاحت پیش نہیں کی جس کی رو سے یہودیت کے بنیادی عقائد کی فہرست مرتب کی جاسکے۔موسی ابن میمون نے بھی جو تیرہ اساسی اصول مرتب کیے ہیں ان کو تمام یہودی قبول نہیں کرتے۔اکثر و بیشتر راسخ العقیدہ یہودی ان پر اعتراضات اٹھاتے رہتے ہیں۔ بعض یہ خیال کرتے ہیں کہ وہ اپنے عقائد کی کوئی فہرست مہیا نہیں کر سکتے کیونکہ ان میں عقائد کے معاملات میں کبھی اتفاق رائے نہیں ہو سکا ہے۔یہاں تک کہ عبرانی بائبل کے فراہم کردہ مذہب کو بھی وہ متنوع سمجھتے ہیں۔[1] جو فریق یہ سمجھتا ہے کہ یہودیت میں کچھ بنیادی عقائد موجود ہیں وہ یہ دلیل دیتا ہے کہ اگر یہ مان لیا جائے کہ یہودیت میں عقائد کا وجود ہی نہیں ہے تو مذہب ہوا کے جھونکے کی مانند رہ جائے گا جس کی کوئی پختہ بنیاد نہیں ہو گی۔ وہ یہ سوال بھی اٹھاتے ہیں کہ اگر کوئی مشترک عقیدہ موجود نہیں تھا تو تاریخ کے چار ہزار سالہ دور میں وہ بطور قوم کیسے اکٹھے رہ پائے؟ اس لیے یہودیت کے بنیادی عقائد کی وضاحت ایک دشوار اور گنجلک کام ہے۔البتہ یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ کچھ ایسے بنیادی تصورات ان میں پائے جاتے ہیں جنہیں اس مذہب کی بنیاد کہا جاسکتا ہے لیکن اس بات کی یقین دہانی نہیں کروائی جاسکتی کہ تمام یہودی ان بنیادی تصوارات کو اپنے عقائد سمجھتے ہیں۔

باب پنجم کے اہم نکات

1. یہودی عقائد وعبادات کا تعارف۔
2. تصور خدا کی اہمیت۔
3. منتخب قوم کے نظریہ کا تعارف۔
4. احکام عشرہ اور تیرہ اصول ایمانیات کا تعارف۔
5. نبوت، مسیحِ موعود عقیدہ آخرت۔
6. قربانی، روزہ، نماز اور صدقہ کا تصور۔

خدااور تصور خدا

یہودیت میں خدا کو مختلف انداز میں بیان کیا جا سکتا ہے۔ عمومی طور پر اسے یہوہ کے چار حرفی نام سے پکارا جاتا ہے۔ یہودی اس نام کو اس قدر با عزت و بابرکت اور رعب و جلال والا اسم تصور کرتے ہیں کہ بغیر ضرورت اس نام کو نہیں پکارتے۔ عبرانی بائیبل کے مطابق اس کا حکم خدا نے خود دیا ہے: " تمہیں اپنے خدا یہوہ کا نام بے مقصد نہیں لینا چاہیے کیونکہ اگر کوئی یہوہ کا نام بے مقصد استعمال کرتا ہے تو وہ خطاوار ہے اور خداوند اسے بے خطا نہیں مانے گا۔"[2] اسی طرح وہ غیر یہود میں اس نام کا پکارا جانا بھی پسند نہیں کرتے کیونکہ ان کا خیال ہے کہ غیر اقوام اس نام کی عزت کا پاس نہیں رکھ سکتیں۔ اس اسم کو لکھا بھی حروفِ علت کے بغیر جاتا ہے تاکہ کوئی اس کو پڑھ نہ پائے۔ یہودیت میں خدا کو مختلف ناموں سے پکارا جاتا ہے۔ سب سے مشہور نام یہوہ ہے۔ خدا کے تمام نام اپنی جنس کے لحاظ سے مذکر ہیں۔ عبرانی بائیبل میں بھی خدا کا نام ہمیشہ مذکر کے طور پر استعمال ہوا ہے۔ البتہ ربیائی تحریروں میں خدا کو "سکینہ" کے مؤنث نام سے بھی پکارا گیا ہے۔ بائیبل میں درج شدہ قصوں میں خدا کو ایک ہیرو، رہنما اور ناصح کے طور پر دیکھا جا سکتا ہے جو اپنے منتخب شدہ لوگوں سے محبت کرتا ہے۔

پہلے باب میں بیان کیا جا چکا ہے کہ یہودیت کی ابتدا ابراہیمؑ کے ایک خدا پر یقین کے ساتھ ہوتی ہے۔ وہ خدا کے ایک ایسے تصور کے قائل تھے جس میں دوئی کی گنجائش نہیں تھی۔ ان کے ایک خدا پر اٹل یقین کی وجہ سے یہودیت بھی توحید پرستانہ مذہب کے طور پر رواج پائی۔ اگرچہ وقت کے ساتھ ساتھ یہودیوں کے تصورِ خدا میں ارتقا ہوا ہے لیکن ہر دور میں غالب عنصر توحید ہی رہا۔ عبرانی بائیبل میں بیان شدہ یہودیت کی تاریخ بھی اس بات کی گواہی دیتی ہے کہ خدا کے ساتھ شرک کو بدترین گناہ تصور کیا جاتا رہا ہے۔ حتی کہ انبیا سے بھی اگر یہ عمل سرزد ہوا ہے تو اسے جرم تصور کر کے ان کی سرزنش کی گئی ہے۔ اس لحاظ سے یہودی تصورِ خدا میں سب سے پہلی اور اہم چیز توحید ہے۔ خدا کو ایک اور یکتا ماننا اور اس کا ورد کرنا یہودیوں کے نزدیک عبادت کا درجہ رکھتا ہے۔ یہودی رات کو سونے سے پہلے اور صبح اٹھتے ہی بائیبل کی اس آیت کا ورد کرتے ہیں: " سُنو! اے بنی اسرائیلیو! خداوند ہمارا خدا ہے۔ خداوند ایک ہے!"[3] ہر مذہبی یہودی کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ دمِ مرگ اس کی زبان سے یہ کلمات جاری ہوں۔ اس کلمہ کو عبرانی زبان میں

"شماع" کہا جاتا ہے جو یہودیت میں حکمِ اعظم کا درجہ رکھتا ہے۔

یہودیت میں خدا پر یقین صرف دل کے ایمان کی حد تک نہیں ہے بلکہ اس کا زیادہ تعلق عمل کے ساتھ ہے۔ یہودی خدا کی ذات پر بحث کی بجائے اس کے احکامات پر عمل کرنا زیادہ اہم سمجھتے ہیں۔ البتہ خدا کے احکامات پر آنکھیں بند کر کے عمل کرنے کی بجائے اس سے سوال و جواب کیا جانا اور لڑنا بھی روا رکھا جاتا رہا ہے، مثلاً عبرانی بائیبل سے پتہ چلتا ہے کہ جب خدا سدوم کے لوگوں کو سزا دینا چاہ رہا تھا تو ابراہیمؑ خدا کے سامنے اٹھ کر کھڑے ہو گئے اور اس سے یہ کہلوایا کہ "اگر اس شہر میں صرف دس نیک آدمیوں کو پاؤں تو میں اس کو تباہ نہ کروں گا۔"[4] اسی طرح یعقوبؑ خدا سے برکات کے حصول کے لیے لڑے اور اس پر فتح حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے۔ اس قسم کے واقعات کو یہودیوں اور خدا کے درمیان محبت کے معنوں میں بھی بیان کیا جاتا ہے۔

یہودیت میں یہ سمجھا جاتا ہے کہ انسان کے پاس خدا کا کامل علم نہیں ہے۔ خدا کی ذات کو سوائے خدا کے اور کوئی نہیں جانتا۔ عبرانی بائیبل کے مطابق جب موسیٰؑ سے خدا پہلی دفعہ ہم کلام ہوا اور انہیں کہا کہ وہ جا کر بنی اسرائیل کی مدد کریں تو انہوں نے عرض کی کہ اگر ان سے پوچھا گیا کہ خدا کون ہے تو وہ کیا جواب دیں گے؟ اس سوال کے جواب میں خدا نے ان سے کہا" میں جو ہوں سو میں ہوں"[5] لہذا مذہبی یہودی اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ خدا کی ذات کے متعلق سوچنا ان کا کام نہیں ہے۔ اگر وہ چاہیں بھی تو اس کو سمجھ نہیں سکتے۔ وہ ابد سے ہے اور ازل تک رہے گا۔ عبرانی بائیبل میں اس کی کوئی شروعات یا اختتام نہیں بتایا گیا۔ یہاں تک کہ کتابِ پیدائش کی پہلی سطر یہ کہتی ہے: "ابتدا میں خدا نے آسمان و زمین کو پیدا کیا۔"[6] یہاں بھی خدا کی ابتدا کے متعلق کسی قسم کی خبر نہیں دی گئی۔ البتہ یہ ضرور بتا دیا گیا کہ کائنات اور اس میں موجود ہر شے کا خالق خدا ہے۔ اسی لیے یہ تصور کیا جاتا ہے کہ یہودیت میں منتخب قوم ہونے کا نظریہ بعد کی پیداوار ہے۔ ابتدا میں خدا کا ایک آفاقی تصور یہودیوں میں موجود تھا۔ اسی لیے یہودیت کو کوئی بھی اختیار کر سکتا تھا کیونکہ یہوہ ہر اس شخص کا خدا تھا جو اس سے محبت کرتا اور اس کے احکامات کی پیروی کرتا۔ عصر حاضر کے یہودی فرقوں کے تصور خدا میں کافی ارتقا ہوا ہے جس کے بارے میں مختصراً ذکر اس کتاب کے ساتویں باب میں بھی موجود ہے۔

یہودی یہ سمجھتے ہیں کہ خدا ہر راز اور ہر علم کا جاننے والا ہر چیز پر قادر ہے۔ وہ خالق ہے، پاک ہے، مالکِ کل کائنات ہے، لامحدود حق ہے، نجات دہندہ اور حکمران ہے۔ عبرانی بائیبل میں اس کا جسمانی تصور موجود تو ضرور ہے جس میں اس کے ہاتھ، چہرے، انگلی یا جسم کا ذکر ہے لیکن وہ کوئی انسان نہیں ہے۔ اس حوالے سے کتاب گنتی میں آیا ہے: "خدا انسان نہیں ہے۔ وہ جھوٹ نہیں کہے گا۔ خدا انسان کا بیٹا نہیں، اگر خداوند کہتا ہے کہ وہ کچھ کرے گا تو ضرور کریگا۔"[7] اس لیے اگر عبرانی بائیبل میں خدا کو غصہ ور، رعب و جلال والا، پُر ہیبت، محبت، ہمدردی اور شفقت کرنے والا بتایا گیا ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ ان صفات میں وہ انسان کی مانند ہے۔

منتخب قوم

عبرانی بائیبل کے مطابق یہودی خدا کی منتخب قوم ہیں جن کو اس نے اپنا عہد دیا اور ایک زمین دینے کا وعدہ کیا (عہدِ خداوندی اور ارضِ موعود کا تصور بھی یہودیوں میں عقیدے کی مانند ہیں جن کے بارے میں مختصر بیان پہلے اور دوسرے باب میں گزر چکا ہے)۔ یہودی مذہب کی رو سے یہاں منتخب قوم سے یہ ہر گز مراد نہیں کہ خدا جانب دار ہے جسے صرف یہودی قوم کی پرواہ ہے۔ کتاب پیدائش کے مطابق ساری کائنات خدا کی تخلیق ہے اور اس میں موجود تمام مخلوقات کا خالق بھی وہی ہے لہذا یہودیوں کو منتخب قوم کے طور پر چننا جانب داری کی وجہ سے نہیں بلکہ خدا سے کیے گئے عہد کی وجہ سے ہے۔ یہ عہد دو طرفہ ہے جیسا کہ کتاب خروج میں ذکر ہے: "اگر تم میرا حکم مانوگے تو تم میرے خاص لوگ بنوگے۔ ساری دنیا میری ہے۔"[8] اس سے پتہ چلتا ہے کہ یہودی بھی اس وقت تک خدا کے خاص ہیں جب تک وہ خدا کے عہد کی تکمیل کرتے ہیں۔ چنانچہ ان کا یہ منتخب قوم کا عہدہ خدا کی جانب داری نہیں بلکہ ایک طرح کی رعایت ہے۔

بعض مصنفین یہ بھی خیال کرتے ہیں کہ یہ رعایت بھی اس لیے ہے کہ ان کو دوسروں کے لیے روشنی بننا ہے اور ان کے ذریعے خدا کا عہد دوسروں تک پہنچنا ہے۔ جیسا کہ بتایا گیا ہے: "میں نے تجھے لوگوں کے ساتھ ایک معاہدہ کے لئے اور قوموں کی روشنی کے لئے ایک ثالثی مقرر کیا۔"[9] لہذا مذہب سے شہادت لے کر یہ کہا جاتا ہے کہ یہ یہودیوں کے مخالفوں کا کام ہے جنہوں نے صدیوں سے اس بات کو اچھالنے کی کوشش کی ہے کہ یہودی خود کو دوسروں سے عظیم اور برتر سمجھتے ہیں۔[10] کچھ یہودی مصنفین اس بارے میں یہ بھی لکھتے ہیں کہ ربی یہ کہتے ہیں کہ

توریت ابتدا میں کائنات میں بسنے والی دیگر اقوام کو دی گئی لیکن انہوں نے اسے لینے سے انکار کر دیا کیونکہ وہ اس کے مطابق زندگی نہیں گزار سکتے تھے۔ صرف یہودی ہی ایسی قوم تھے جنہوں نے توریت کو قبول کیا۔ یہ ایک لحاظ سے ان کی مجبوری بھی تھی کیونکہ توریت کو قبول نہ کرنے کی صورت میں خدا نے ایک پہاڑ گرا کر انہیں تباہ کرنے کا ڈراوا دیا تھا۔ تاہم یہودیوں نے اسے خوشی خوشی قبول کیا جس کی وجہ سے وہ خدا کی منتخب قوم بن گئے۔[11]

اس کے برعکس ایسے نظریات بھی موجود ہیں جو عہد کے لحاظ سے قومی انتخاب کی نفی کرتے ہیں، مثلاً عبرانی بائیبل یہ بھی بتاتی ہے کہ اگر یہودی خدا کے عہد کی پاسداری نہ بھی کر رہے ہوں تو بھی وہ خدا کے منتخب شدہ لوگ رہیں گے کیونکہ خدا ان کے باپ دادا سے کیے گئے عہد کی وجہ سے ان کا ساتھ نہیں چھوڑے گا۔[12] اس نظریے کے حاملین یہ سمجھتے ہیں کہ یہودی تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ انہوں نے خود بارہا اپنے نسلی تعصب کا اظہار کیا ہے۔ یہاں تک کہ عصر حاضر میں بھی اسرائیلی شہریت حاصل کرنے کے لیے دو مختلف قوانین بنائے گئے ہیں۔ ان میں سے ایک تو "قانون واپسی" ہے جس کی رو سے دنیا بھر سے کوئی بھی فرد اسرائیل کی شہریت اس بنیاد پر حاصل کر سکتا ہے کہ وہ یہودی ہے۔ دوسرا قانون دیگر ممالک کے قوانین سے مماثل ہے جس کی رو سے ہر وہ آدمی، شہریت کا حقدار ہے جس کی اپنی یا اس کے والدین میں سے کسی کی پیدائش اسرائیل میں ہوئی ہے۔[13] اس ضمن میں یہ مدِ نظر رہنا چاہیے کہ یہ اسرائیلی قانون ہے اور لازمی نہیں کہ اسرائیلی قانون کو ہلاخا کی حمایت بھی حاصل ہو۔ منتخب قوم کے اس نظریے نے یہودیوں کو بحیثیت قوم تاریخ کے مختلف ادوار سے گزرنے کی ہمت بھی عطا کی اور انہیں سامی مخالفت کی بھینٹ بھی چڑھا دیا۔ نظریات کے اسی تضاد کی وجہ سے عصر حاضر کے یہودیوں کے کچھ فرقے تو ایسی مذہبی توجیہات پسند نہیں کرتے جن کی رو سے وہ خود کو دیگر انسانوں سے افضل سمجھیں اور کچھ فرقے ایسے ہیں جو خود کو منتخب قوم سمجھتے ہیں اور اس پر فخر کرتے ہیں۔

احکام عشرہ

احکام عشرہ/وصایا عشر سے مراد وہ دس احکام ہیں جو عبرانی بائیبل کے مطابق خدا نے یہودیوں کو دیے تاکہ وہ ایک راستباز زندگی گزار سکیں۔ آج بھی یہودیوں کی ایک بڑی تعداد ان احکامات کو بطور عقیدہ اپناتی ہے۔ احکام عشرہ مندرجہ ذیل ہیں:

1. تمھیں میرے علاوہ کسی دوسرے خدا کی عبادت نہیں کرنی چاہیے۔
2. تمھیں کوئی بھی مورتی نہیں بنانی چاہیے۔
3. تمھارے خداوند خدا کے نام کا استعمال تمھیں بے جا نہیں کرنا چاہیے۔
4. سبت کو یاد رکھو اور اسے مقدس دن کے طور پر مناؤ۔
5. اپنے ماں باپ کی عزت کرو۔
6. تمھیں کسی آدمی کو قتل نہیں کرنا چاہیے۔
7. تمھیں بدکاری کا گناہ نہیں کرنا چاہیے۔
8. تمھیں چوری نہیں کرنی چاہیے۔
9. تمھیں اپنے پڑوسیوں کے خلاف جھوٹی گواہی نہیں دینی چاہیے۔
10. تمھیں دوسرے لوگوں کی چیزوں کو لینے کی خواہش نہیں کرنی چاہیے۔[14]

ابن میمون کے تیرہ اصول

احکام عشرہ ہی کی طرح موسی ابن میمون کے مرتب کردہ تیرہ اصولِ ایمانیات بھی یہودیوں میں مشہور ہیں جو ان کے بنیادی عقائد کے متعلق معلومات فراہم کرتے ہیں۔ یہ اصول تقریباً یہودی عبادات کی ہر کتاب میں موجود ہیں اور مختلف تہواروں، خاص طور پر جمعے کے دن انہیں پڑھا جاتا ہے۔ یہ احکام مندرجہ ذیل ہیں:

1. خدا کے وجود پر اعتقاد۔
2. خدا کی وحدانیت پر اعتقاد۔
3. خدا کے ماورائے مادہ ہونے پر اعتقاد۔
4. خدا کے ازل سے موجود ہونے پر اعتقاد۔
5. صرف خدا ہی کی عبادت پر اعتقاد۔
6. نبوت پر اعتقاد۔
7. موسیؑ کی نبوت کی بالادستی پر اعتقاد۔
8. توریت کے بطور کلامِ خدا پر اعتقاد۔
9. توریت کے عدم تغیر پر اعتقاد (یہ کہ توریت میں کوئی تبدیلی نہیں ہوسکتی)۔

10. خدا کے علم غیب اور معرفِ کل پر اعتقاد (یہ کہ خدا ہر چیز جانتا ہے)۔
11. خدا کی جانب سے سزا و جزا پر اعتقاد۔
12. مسیحِ موعود پر اعتقاد۔
13. مردوں کے جی اٹھنے پر اعتقاد۔[15]

مسیح موعود

موسیٰ ابن میمون کے تیرہ اساسی اصولوں میں سے بارہواں اصول مسیحِ موعود کے متعلق بتاتا ہے جن سے مستقبل کے ایک ایسے یہودی بادشاہ مراد ہیں جو داؤدؑ کی نسل سے ہوں گے۔ وہ خاص خوشبودار تیل سے مسح کریں گے اور یہودی قوم کی سربلندی کے لیے کام کریں گے۔ ان کے دور کو مسیحا کا دور کہا جائے گا۔ یہودی روایات کے مطابق وہ جب آئیں گے تو دنیا پر تمام جنگوں کا خاتمہ ہو جائے گا۔ وہ نیک لوگوں سے رشتہ استوار کریں گے اور بروں کا خاتمہ کریں گے۔ ربی اس بات پر بھی یقین رکھتے تھے کہ ان کے آنے سے پہلے ایلیاہؑ زمین پر واپس آئیں گے اور دنیا کے تمام مسائل حل کریں گے۔[16] البتہ یہ مسیحِ موعود ہی ہوں گے جو یہودیوں کو ارضِ موعود لے جائیں گے۔ ارضِ موعود وہ جگہ ہے جس کے دینے کا خدا نے یہودیوں سے وعدہ کر رکھا ہے۔ ہیکل کی دوسری تباہی کے بعد سے یہودیوں میں اس عقیدے نے بہت رواج پایا۔ لوگ مسیحا کا بے چینی سے انتظار کرنے لگے۔ اس دوران کچھ لوگوں نے مسیحا ہونے کا دعویٰ بھی کیا لیکن یہودی عقیدے کے مطابق ان کا مسیحا ہونا ثابت نہ ہو سکا۔

مندرجہ بالا عقیدے کے مطابق یہودیوں نے دو ہزار سالہ صبر اس لیے نہیں کیا کہ وہ اس جدید اسرائیلی ریاست میں رہیں یا اسے ارضِ موعود کا درجہ دیں۔ مذہبی یہودی یہ یقین رکھتے ہیں کہ ارضِ موعود انہیں اس وقت ملے گی جب خدا خود دنیا میں اپنی نشانیاں دکھائے گا اور یہودیوں کی مدد کرے گا۔ اس لحاظ سے مسیحا کا دور یہودیوں کے لیے عہد زریں ہو گا۔ صہیونی اس عقیدے کی تشریح اپنے طور پر کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ ارض موعود کے حصول کے لیے کسی مسیحا کے انتظار کی ضرورت نہیں بلکہ ہم خود بھی اسے حاصل کر سکتے ہیں۔ اسی لیے جب اسرائیلی ریاست کا قیام عمل میں لایا جا رہا تھا اور اسے ایک مذہبی رنگ دیا جا رہا تھا تو بہت سے راسخ العقیدہ یہودی اس کے قیام کے خلاف تھے کیونکہ وہ یہ سمجھتے تھے کہ ارضِ موعود کا حصول مسیحِ موعود کی

آمد کے ساتھ مشروط ہے۔ اگر اس سے پہلے یہ کوشش کی جائے گی تو یہ خدا کے قانون کی نافرمانی ہو گی۔[17]

حیات بعد الموت

ابن میمون کے تیرہ اساسی اصولوں میں سب سے آخری اصول مرِدوں کے دوبارہ جی اٹھنے سے متعلق ہے۔ اس میں آخرت اور سزا و جزا کا تصور شامل ہے۔ عبرانی زبان اس کے لیے "اولام ہابا" کی اصطلاح استعمال کرتی ہے جس کا مطلب "اگلی دنیا" ہے۔ یہودیت میں تصورِ آخرت، حیات بعد الموت اور روح کے بقا جیسے موضوعات پر کم بات کی گئی ہے۔ عبرانی بائیبل میں بھی حیات بعد الموت کے متعلق معلومات کم ہیں۔ ابتدا میں یہودی یہ یقین رکھتے تھے کہ موت کے بعد انسان کو "شیول" منتقل کر دیا جاتا ہے جو ایک تاریک ٹھکانہ ہے۔ جیسا کہ کتاب گنتی میں ذکر ہے: " وہ زندہ ہی شیول میں چلے گئے ان کی ہر ایک چیز ان کے ساتھ زمین میں سما گئی۔ تب زمین اُن کے اوپر سے بند ہو گئی۔ وہ تباہ ہو گئے اور اپنی جماعت سے غائب ہو گئے۔"[18] اسی طرح ایلیاؑ کے متعلق ذکر ہے کہ ان کو جنت میں اٹھالیا گیا۔[19] بعد ازاں جب یہودیوں کا دیگر مذاہب کے پیروکاروں خصوصاً فارسیوں سے واسطہ پڑا تو ان میں حیات بعد الموت کے تصور میں وضاحت آنے لگی۔ رفتہ رفتہ ان میں جنت و جہنم کے تصورات ابھرے اور شیول کو پاکی کی جگہ یا انتظار گاہ سمجھا جانے لگا جہاں انسان جنت یا جہنم میں جانے سے پہلے رہتا ہے۔

بعض مصنفین کا یہ بھی خیال ہے یونانی و رومی اثرات کے تحت یہودیوں میں آخرت کے تصور نے وضاحت پائی۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ عبرانی بائیبل کو سامنے رکھتے ہوئے یہودی ربیوں نے سزا اور جزا کا عقیدہ بیان کیا۔ ربیائی یہودیت کے مطابق اولام ہابا مختلف مرحلوں میں برپا ہو گی۔ اس سے پہلے مسیحِ موعود کا دور آئے گا جس میں امن و سلامتی ہو گی۔ ہیکل کو دوبارہ تعمیر کیا جائے گا۔ اس وقت مردے جی اٹھیں گے، ان میں روحیں ڈالی جائیں گی اور آخری فیصلہ سنا دیا جائے گا۔ جو جزا کے حقدار ہوں گے جنت میں بھیج دیے جائیں گے اور جو سزا کے حقدار ہوں گے دائمی عذاب میں مبتلا ہوں گے۔[20] عصر حاضر کے یہودی آخرت کی تشریحات سائنسی اعتبار سے کرتے ہیں اور حیات بعد الموت کی بجائے روح کے بقا پر یقین رکھتے ہوئے جہنم اور جنت کے عقیدے کو مسترد کرتے ہیں۔ عمومی طور پر بھی یہودی نظریات سے یہ

اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ان کے ہاں دنیا کی زندگی خاصی اہمیت کی حامل ہے۔

نبوت

یہودیوں کی کتب مقدسہ میں سے بہت سی کتب کا نام نبیوں کے ناموں پر ہے۔ ان کتب سے پتہ چلتا ہے کہ خدا نے تاریخ کے مختلف ادوار میں نبیوں کو ہدایت سے سرفراز کر کے یہودیوں کی رہنمائی کے لیے مقرر کیا۔ ان انبیا کا کام اپنی قوم کو ایک خدا کی عبادت کی طرف لانا، شرک سے روکنا اور اخلاقی تربیت کرنا تھا۔ ابن میمون کے تیرہ اساسی اصولِ ایمانیات میں سے ساتواں اصول یہ ظاہر کرتا ہے کہ نبیوں میں زیادہ محترم موسیٰؑ تھے جو یہودیوں کے لیے توریت لے کر آئے اور عہدِ خداوندی کی تجدید کی۔ ابنِ میمون دیگر انبیا پر ایمان کا ذکر بھی کرتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ اس بات پر یقین رکھنا چاہیے کہ انبیا کے الفاظ حق ہیں۔ عبرانی بائیبل میں نبی کی کوئی خاص تعریف مہیا نہیں کی گئی۔ نبوت کو ایک ثابت شدہ عقیدے کے طور پر بیان کیا گیا ہے۔ عبرانی بائیبل سے پتہ چلتا ہے کہ نبی کہ ساتھ دو باتیں مخصوص ہوتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ اس کو خدا کی طرف سے الہام ہوتا ہے، وہ خدا سے بات کرتا ہے اور ہدایت حاصل کرتا ہے؛ جیسا کہ ابراہیمؑ یا موسیٰؑ سے خدا نے کلام کیا۔ دوم یہ کہ خدا کی طرف سے دی گئی ہدایت کو لوگوں تک پہنچانے کی ذمہ داری بھی اسے دی جاتی ہے؛ جیسے موسیٰؑ یا دیگر انبیا، مثلاً سموئیلؑ، یرمیاہؑ یا حزقی ایلؑ نے خدا کا پیغام لوگوں تک پہنچایا۔

یہودی نبیہ

سارہؓ	مریمؓ	حلدہؓ
آسترؓ	ابیجایلؓ	دبورہؓ
حنہؓ		

یہودیت میں صرف مردوں کو ہی نہیں بلکہ عورتوں کی نبوت کو بھی مانا جاتا ہے۔ تلمود کے مطابق کم از کم 48 مردوں اور 7 عورتوں کو نبوت سے سرفراز کیا گیا۔ جیسا کہ مذکور ہے: "اڑتالیس نبی اور سات نبیہ کو یہودی لوگوں کی حمایت میں نبوت دی گئی اور انہوں نے نہ تو توریت میں لکھے گئے (احکامات) میں سے کچھ کم کیا اور نہ ہی کچھ اضافہ کیا۔"[21] خدا خود بھی کسی شخص کو نبوت کے لیے چن سکتا ہے اور اپنے نیک بندوں کی دعاؤں سے بھی کسی کو نبی بنا سکتا ہے، مثلاً جب اسحاقؑ بوڑھے ہو گئے اور ان کی آنکھوں کی بینائی متاثر ہوئی تو انہوں نے اپنے بیٹے عیساؤ کے ذریعے عہدِ خداوندی کو جاری رکھنے کا سوچا۔ ان کی بیوی ربقہ جو اپنے دوسرے بیٹے سے زیادہ

محبت کرتی تھیں انہوں نے تدبیر کر کے یعقوبؑ کے حق میں دعا کروادی جس سے خدا نے انہیں خیر و برکت دی۔[22] بعد ازاں عیساؤ کے بجائے یعقوبؑ ہی نبی بنے اور انہیں کے ذریعے خدا کا عہد آگے بڑھا۔ عبرانی بائبل سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ انبیا بھی دیگر لوگوں کی طرح گناہ گار ہو سکتے ہیں، مثلاً جیسا کے دوسرے باب میں بیان ہو چکا ہے کہ تنخ کے مطابق داؤدؑ اور سلیمانؑ نے اخلاقی گراوٹ اور شرک جیسے گناہ کیے جس پر خدا نے ان کی سرزنش کی اور یہاں تک کہا کہ اب بادشاہت ان کی اولاد سے چھین لی جائے گی۔

عبادات

یہودیت میں عبادت کا مقصد توبہ استغفار کا فروغ اور خدا کی محبت کے لیے اس کا شکریہ ادا کرنا ہے۔ بیشتر یہودی سمجھتے ہیں کہ خدا سے انسان کا ایک براہ راست ذاتی تعلق ہے۔ خدا انسان کی دعائیں سنتا ہے، جواب دیتا ہے اور اسے پناہ عنایت کرتا ہے۔ عبادت کا یہ تصور ساکن نہیں متحرک ہے جس میں وقت کے ساتھ ساتھ ارتقا ہوتا آیا ہے۔ ویسے تو مذہب کی کسی بھی بات پر عمل کرنا عبادت ہے۔ توریت کی تلاوت اس ضمن میں سب سے خاص ہے۔ یہ اہمیت میں نماز سے بھی بڑھ کر ہے اور دیگر عبادتوں کا بھی اہم جزو ہے۔ اسی طرح مقدس تہوار ہیں جن میں بھی مختلف عبادات ہوتی ہیں۔ تاہم بعض عبادات ایسی ہیں جن کا خصوصیت کے ساتھ تذکرہ کیا جاتا ہے۔ زیر نظر باب میں انہیں عبادات کا مختصر تعارف کروایا گیا ہے جو عمومی طور پر یہودیوں میں مشہور ہیں اور جن کی تہواروں سے الگ ایک حیثیت ہے۔

قربانی

ابتدائی یہودیت میں عبادت کا بنیادی تصور قربانی سے جڑا ہوا تھا۔ اس لیے قربانی کو یہودیت میں خدا کی اولین عبادت بھی کہا جا سکتا ہے۔ عبرانی زبان میں قربانی کے لیے "قربان/ قوربان" کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے جس کا مطلب "قریب لے جانا ہے۔" اس سے علم ہوتا ہے کہ قربانی کا مقصد انسان کو خدا کے قریب کر دینا ہے۔ توریت میں بارہا قربانی اور قربان گاہوں کا ذکر آیا ہے۔ تلمود کا ایک مخصوص حصہ قربانی کے احکامات سے متعلق ہے۔ ابراہیمؑ نے بھی خدا کی قربان گاہیں تعمیر کیں اور اس کے حضور قربانیاں پیش کیں۔ تاریخ کے مختلف ادوار

میں یہودی مختلف قربان گاہوں میں قربانی کرتے رہے۔ جب وہ مصر سے نکلے اور کنعان کی طرف ہجرت کی تو راستے میں ان کے پاس ایک خیمہ اجتماع (عبرانی "مشکن" یعنی مسکن یا رہنے کی جگہ / او حیل موعید) ہوا کرتا تھا جو ایک قربان گاہ کی حیثیت رکھتا تھا۔ اسی کے اندر تابوت سکینہ بھی تھا اور اسی میں وہ اپنی قربانیاں پیش کرتے۔[23] ہیکل سلیمانی کی تعمیر کے بعد قربانی کا تصور اسی سے جڑ کر رہ گیا۔ یہودیت میں ہیکل سلیمانی وہ خاص جگہ بن گئی جہاں خدا کے حضور قربانیاں پیش کی جاتیں۔ ہارونؑ اور ان کی اولاد کو یہ سعادت بخشی گئی کہ قربانی کے فرائض صرف انہی کی نسل سر انجام دے سکتی تھی۔ اسی لیے عرصہ دراز تک خیمہ اجتماع و ہیکل سلیمانی کے مذہبی معاملات کی ذمہ داری بھی انہیں لوگوں کے پاس تھی۔ ان کے لیے خاص کپڑے ہوتے جنہیں پہن کر یہ قربانی اور دیگر عبادات سر انجام دیتے۔

مشہور قربانیاں

1. جلا کر کی جانے والی قربانی
2. امن/خوشی کی قربانی
3. نادانستہ گناہ سے معافی کی قربانی
4. دانستہ گناہ سے معافی کی قربانی
5. کھانے پینے کی قربانی
6. گائے کی سرخ بچھڑی کی قربانی

ہیکل میں ہونے والی عبادات مختلف نوعیت کی تھیں، مثلاً قربانی کا ایک تصور تو جانوروں کو جلا کر قربان کیا جانا تھا۔ اس قربانی میں جانور کو مکمل طور پر جلا دیا جاتا تھا اور اس کا کوئی حصہ بھی کھانے کے لیے نہیں ہوتا تھا۔ یہ قربانی خدا کی قربت کے لیے دی جاتی۔ اس میں گائے، بھینس، بکریاں اور پرندوں وغیرہ کی قربانی شامل تھی۔ اسی طرح قربانی کا دوسرا تصور یہ تھا کہ جانور کا ایک حصہ جلا دیا جاتا، ایک حصہ کاہن کو پیش کر دیا جاتا اور ایک حصہ قربانی کرنے والے کا ہوتا۔ یہ قربانی خدا کے شکریے کے طور پر یا قسم وغیرہ کے لیے دی جاتی۔ اسی طرح اگر کسی سے نادانستہ کوئی گناہ ہو جاتا تو اس کے لیے بھی قربانی مقرر تھی۔ قربانی کے جانور کا انتخاب گناہ گار کی مالی حالت اور گناہ کے ارتکاب کی نوعیت پر ہوتا۔ اس قربانی کے جانور پر صرف کاہن کا حق ہوتا۔ اسی طرح جانور کی بجائے کھانے پینے کی چیزوں کو بھی قربانی کے طور پر پیش کیا جاتا جس میں سے ایک مخصوص حصہ جلا دیا جاتا اور باقی کاہن کے لیے چھوڑ دیا جاتا۔ جانور کی قربانی میں اس بات کا دھیان رکھا جاتا تھا کہ وہ جنگلی نہیں بلکہ پالتو جانور ہو۔ کھانے کی قربانی میں پکی پکائی چیز پیش کی جاتی تھی

یعنی ایسی چیز جس پر انسان نے خود محنت کی ہو۔

قربانی کا سارا معاملہ کاہن کے ذمہ ہوتا اور وہ ہی اس عمل کے لیے بااختیار تصور کیا جاتا۔ جیسے زچگی کے عمل سے گزرنے کے بعد یہ عورتوں کے ذمہ ہوتا کہ وہ قربان گاہ میں میمنے اور کبوتر کو لے کر جائیں اور کاہن ان کو جلا کر خدا کے حضور قربانی پیش کرے۔[24] اسی طرح سبت، پشاخ یا یوم کپور کے موقع پر ہیکل میں مختلف عبادتیں اور دعائیں کروانا بھی کاہن ہی کے ذمہ ہوتا۔ ہیکل کی تباہی کے بعد اس سے جڑی تمام عبادات کا تصور بھی ختم ہو گیا اور ربیائی یہودیت کے ذریعے عبادات کے دوسرے طریقے رواج پانے لگے۔ اب یہودی یہ خیال کرتے ہیں کہ جب مسیح موعود آئیں گے اور ہیکل کی تیسری تعمیر ہو گی تو اس وقت قربانی دوبارہ رواج پائے گی۔ البتہ اس قربانی کی نوعیت اور ہیکل میں کی جانے والی عبادات کے متعلق وہ باہم اختلاف کا شکار ہیں۔ کچھ یہودی یہ سمجھتے ہیں کہ مذہبی احکامات کی تکمیل کے لیے جانوروں کی قربانی ویسے ہی جاری رہنی چاہیے جیسے عہد ابراہیمی میں کی جاتی تھی جبکہ کچھ فرقوں، مثلاً اصلاح شدہ یہودیوں یا نواشترا کی یہودیوں کا یہ خیال ہے کہ قربانی کا یہ عمل قدیم وحشتوں کی یادگار ہے۔ آج کل کے دور میں جانوروں کی قربانی کی ضرورت نہیں ہے۔

قدیم مقدس زیارتیں

بنیادی طور پر کتابِ استثنا میں یہودیوں کو تین دفعہ زیارتوں یعنی "شلوش ریگالیم" کا حکم دیا گیا تھا۔ جیسا کہ مذکور ہے: "تمہارے سب لوگ ہر سال تین بار خداوند تمہارے خدا سے ملنے کے لیے اس خاص جگہ پر ضرور آئیں جسے اس نے چنا ہے۔ تم بغیر خمیر کے روٹی کی تقریب (پیشاخ)، ہفتہ کی تقریب (سبت) اور پناہ کی تقریب (سکوت) منانے کے لئے ضرور آؤ۔"[25] اس سے یہ مراد لی جاتی ہے کہ ہیکل کی موجودگی میں یہودیوں کو یہ حکم دیا گیا تھا کہ وہ تین مختلف اوقات میں یروشلم آکر خوشی منائیں۔ اپنے ساتھ تحائف بھی لے کر آئیں۔ کاہن ان کے لائے ہوئے تحفوں کو خدا کی نذر کرے گا۔ ہیکل کی تباہی کے بعد ان مقدس زیارتوں اور تہواروں کو ادا کرنا ممکن نہیں رہا۔ البتہ کچھ یہودی ایسے بھی ہیں جو دیوارِ گریہ کی زیارت کر کے ان مقدس زیارتوں کو ادا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ سبت، پیشاخ اور سکوت کو اب الگ تہواروں کے طور پر منایا جاتا ہے۔

روزہ

روزہ یہودیوں میں ایک اہم عبادت تصور کی جاتی ہے جو ابتدا ہی سے ان میں رواج پائی۔ عبرانی زبان میں اس کے لیے "تَعَنیت" کی اصطلاح استعمال کی جاتی ہے۔ روزے میں کھانے پینے اور ازدواجی تعلقات کی مکمل ممانعت کی گئی ہے۔ اس کا بنیادی مقصد قدرتی آفات و مشکلات سے حفاظت، توبہ کا فروغ اور خدا کا شکر ادا کرنا ہے۔ یہودیت میں روزے تین طرح کے ہیں: عبرانی بائیبل سے ثابت شدہ فرض روزے، ربیوں کے بتائے ہوئے نفلی روزے اور انفرادی روزے (یہاں فرض اور نفلی روزے کی اصطلاح صرف وضاحت کے لیے استعمال کی گئی ہے)۔ ان میں سے کچھ روزے عوامی ہوتے ہیں اور کچھ انفرادی۔ کچھ روزے سورج غروب ہونے سے لے کر اگلی رات تک اور کچھ سحر سے اسی رات تک رکھے جاتے ہیں۔ جہاں تک روزے کی قبولیت اور مقصد کا تعلق ہے اس کی وضاحت کتاب یسعیاہ کے مندرجہ ذیل اقتباس سے بخوبی ہو سکتی ہے:

فرض روزے

1. یوم کپور کا روزہ
2. تاموز کی سترہویں کا روزہ
3. تیشا باؤ کا روزہ
4. یوم جدلیاہ کا روزہ
5. تیوت کی دسویں کا روزہ
6. تعنیت ایستر

> دیکھو! اپنے روزہ کے دن میں تم وہی کرتے ہو جو تمہارے لئے خوشی کا باعث ہو اور تم اپنے کام کرنے والوں پر ظلم کرتے ہو۔ جب تم روزہ رکھتے ہو تو بحث و تکرار اور لڑائی یہاں تک کہ مکہ بازی بھی کرتے ہو۔ اگر تم اپنی آواز کو آسمان میں سننا چاہتے ہو تم ایسا روزہ مت رکھو جیسا اب رکھتے ہو۔ کیا تم سوچتے ہو کہ میں تم سے کیسے روزہ رکھوانا چاہتا ہوں؟۔۔۔ میں تمہیں بتانا چاہوں گا کہ کس طرح کا روزہ میں پسند کرتا ہوں؟ ایک ایسا دن جب لوگوں کو جنہیں کہ غیر منصفانہ طور پر قید کیا گیا تھا آزاد کیا جائے۔ مجھے ایک ایسا دن چاہیے جب لوگوں کو ان کے بوجھ سے راحت ملے۔ میں ایک ایسا دن چاہتا ہوں جب ظلم سے ستائے ہوئے لوگوں کو آزاد کیا جائے۔ میں ایک ایسا دن دکھانا چاہتا ہوں جب تم ہر ایک برے جوئے کو توڑ دو۔ میں چاہتا ہوں کہ تم بھوکے لوگوں کے ساتھ اپنے کھانے کی چیزیں بانٹو۔ میں چاہتا ہوں کہ تم ایسے غریب لوگوں کو ڈھونڈو جن کے پاس گھر نہیں ہے اور میری خواہش ہے کہ انہیں اپنے گھروں میں لے آؤ۔ تم جب کسی ایسے شخص کو دیکھو، جس کے پاس کپڑے نہ ہوں تو اسے

کپڑے دو۔ان لوگوں کی مدد سے منہ مت موڑو، جو تمہارے اپنے رشتے دار ہوں۔"[26]

فرض روزے

فرض روزوں کی تعداد چھ ہے جن میں سے توریت میں صرف ایک روزے کا تذکرہ ہے۔ یہ روزہ یوم کپور پر رکھا جاتا ہے۔ کتابِ زکریا میں چار مزید فرض روزوں کا بتایا گیا ہے: "خداوند قادر مطلق فرماتا ہے، چوتھے (تاموز) اور پانچویں (آوو) اور ساتویں (تشری) اور دسویں (تیوت) مہینے کے مقررہ روزے کا دن اور غمگیں دن تقریب و جشن کا دن ہو جائے گا جو کہ شادمانی اور خوشی لائے گا۔ اس لئے سچائی اور امن وامان کو عزیز رکھو!" چھٹے روزے کا ذکر کتابِ ایستر میں ان الفاظ سے آیا ہے: "یہودی انہیں دوسری تعطیل کے دِنوں کی طرح یاد رکھیں گے۔ جب وہ لوگ روزہ رکھیں گے اور جو کچھ ہوا تھا ان پر آنسو بہا کر پچھتائیں گے۔" ان روزوں کا تعارف درج ذیل ہے:

1. یوم کپور کے روزے کا بنیادی مقصد گناہوں کا کفارہ ہے۔ یہودیوں کے نزدیک یہ سال کا سب سے اہم روزہ ہوتا ہے۔
2. تاموز کی سترہویں تاریخ کا روزہ جو یروشلم کی فصیلوں کی تباہی کی یاد میں رکھا جاتا ہے۔
3. تیشا باؤ کا روزہ جو آوو کے نویں دن ہیکل سلیمانی کی تباہی کی یاد میں رکھا جاتا ہے۔
4. یومِ جدلیاہ کا روزہ جو تِشری کی تیسری کو جدلیاہ (یہودیہ کا گورنر) اور اس کے حامیوں کے قتل کی یاد میں رکھا جاتا ہے۔
5. تیوت کی دسویں تاریخ کا روزہ جو نبوکدنضر کے یروشلم پر حملے کی یاد میں رکھا جاتا ہے۔
6. تعنیت ایستر جو آدر کی تیرہویں تاریخ کو پیوریم کے تہوار پر رکھا جاتا ہے۔

مندرجہ بالا روزوں میں یہ خیال رکھا جاتا ہے کہ اگر روزہ سبت کے دن آ گیا ہے تو اسے اتوار تک مؤخر کر دیا جائے۔ البتہ یوم کپور کا روزہ سبت کے دن بھی رکھا جاتا ہے اور ایستر کا روزہ سبت کے بجائے اگلی جمعرات کو رکھا جائے گا۔

ربیوں کے بتائے نفلی روزے

ربیوں کے رواج دیے ہوئے روزوں کا مقصد انسان میں نیکی اور راستبازی کو فروغ دینا ہے۔ یہ روزے ایک طرح سے نفلی روزے ہیں کیونکہ انہیں عبرانی بائیبل نے فرض کا درجہ نہیں دیا۔ یہ لوگوں کی مرضی پر منحصر ہے کہ وہ ان روزوں کو رکھیں یا نہ رکھیں۔ یہ ایک لحاظ سے

یہودی ثقافت کا حصہ ہیں۔ ذیل میں ان روزوں کا مختصر تعارف درج کیا جا رہا ہے:

1. تشری مہینے کے پہلے دس دن کا روزہ جس میں یہودی توبہ استغفار کرتے ہیں۔ اسی کے ساتھ ایلول کے روزے ہیں جو یہودی کیلنڈر کا چھٹا مہینہ ہے۔ ایلول کے روزوں میں دنوں کی کوئی قید نہیں ہے۔ اس مہینے یہودی جتنے روزے رکھ سکتے ہیں رکھ لیتے ہیں۔
2. سکوت کی پہلی سوموار و جمعرات کا روزہ جو گناہوں سے معافی کے لیے رکھا جاتا ہے۔
3. تاموز کے فرض روزہ سے پہلے کے روزے جو ہیکل کی یاد میں رکھے جاتے ہیں۔
4. آدر کی ساتویں تاریخ کا روزہ جو موسیٰؑ کی موت کی یاد میں رکھا جاتا ہے۔
5. یومِ کپور کی طرز کا روزہ جو ہر مہینے کے آخری دن رکھا جاتا ہے۔

مندرجہ بالا روزوں کے علاوہ بھی کئی اور روزے ہیں جو غم و حزن سے بچنے کے لیے یا شکرانے کے طور پر رکھے جاتے ہیں۔

انفرادی روزے

یہودیت میں چند انفرادی روزے بھی ہیں جو مندرجہ بالا روزوں سے ہٹ کر ہیں۔ ان کا مختصر تعارف درج ذیل ہے:

1. ماں باپ یا استاد کی موت کے دن کی یاد میں رکھے جانے والا روزہ۔
2. شادی کے دن تقریب سے پہلے تک کا روزہ جو دولھا اور دلھن رکھتے ہیں۔
3. توریت کے طومار کے ہاتھ سے گر جانے کا روزہ۔

اس کے علاوہ بھی اگر کوئی شخص کسی مصیبت میں گرفتار ہو یا اسے کسی مصیبت کا اندیشہ ہو تو وہ نبیوں کی سنت پر عمل کرتے ہوئے روزہ رکھتا ہے۔[27] صنہادرین اس دن بھی روزہ رکھتے تھے جس دن وہ کسی کو سزائے موت کا حکم سناتے۔

نماز

عبرانی زبان میں نماز کے لیے "تِفیلہ" کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ اسی نسبت سے سیناگاگ کو بیتِ تفیلہ یعنی نماز کی جگہ بھی کہا جاتا ہے۔ یہودی عقیدے کے مطابق ان پر دن میں تین نمازیں فرض ہیں جیسا کہ زبور میں داؤدؑ کے حوالے سے بیان ہے: "میں تو مدد کے لیے خدا کو پکاروں گا، اور خداوند مجھے بچائے گا۔ میں تو اپنے دُکھ کو خدا سے صبح و شام، اور دوپہر میں کہوں گا۔

وہ میری سنے گا۔" ان تین فرض نمازوں کے علاوہ سبت اور دیگر تہواروں پر بھی چند مخصوص نمازیں ادا کی جاتیں ہیں۔ فرض نمازوں کا مختصر تعارف درج ذیل ہے:

1. "شَخرِیت" یا صبح کی نماز جس کے تین حصے ہیں: پہلے توریت کی تلاوت کی جاتی ہے، پھر زبور سے دعائیں اور مناجات گائی جاتی ہیں اور آخر میں نماز کے لیے پکارا جاتا ہے جس میں "عمیدہ" ادا کی جاتی ہے۔ عمیدہ مخصوص دعائیں ہیں جو انسان انفرادی طور پر بھی مانگتا ہے اور اجتماعی طور پر بھی اونچی آواز میں پڑھتا ہے۔ اونچی آواز میں پڑھے جانی والی دعاؤں کے جواب میں "آمین" کہا جاتا ہے۔ یہودیوں کی کوئی بھی نماز عمیدہ کے بغیر نہیں ہوتی۔ عمیدہ کے علاوہ بھی بہت سی مخصوص دعائیں، مثلاً شماع، برکات اور کدیش وغیرہ ہیں جو مختلف نمازوں یا مواقع پر پڑھی جاتی ہیں۔ ان کے بارے میں معلومات سیدور میں درج ہوتی ہیں۔
2. "مِینحا" یا عصر کی نماز۔ مختلف فرقے اسے مختلف انداز میں ادا کرتے ہیں تاہم ہر فرقہ عمیدہ بھی ادا کرتا ہے اور عبرانی بائبل ہی سے بقیہ دعاؤں کا انتخاب کرتا ہے۔
3. "مَعارِو" یارات کی نماز۔ اس نماز میں عمیدہ، زبور اور توریت کی تلاوت ہوتی ہے۔

یہ نمازیں منیان یعنی جماعت کے ساتھ بھی ادا کی جاسکتی ہیں اور انفرادی طور پر بھی لیکن جماعت کے ساتھ نماز پڑھنا زیادہ افضل قرار دیا گیا ہے۔ جماعت کے لیے کم از کم دس لوگ ہونے ضروری ہیں جن کی عمریں تیرہ سال سے ایک دن اوپر ہوں۔ نماز سے پہلے خود کو پاک کرنا یا وضو کرنا ضروری ہے۔ غلیظ یا گندی جگہ پر نماز پڑھنے سے منع کیا گیا ہے۔ اسی طرح ویران عمارتوں اور بند کمروں میں بھی نماز پڑھنے سے روکا گیا ہے۔ لباس کے بارے میں بھی یہ ہدایت کی گئی ہے کہ کم از کم کمر سے نیچے تک کا جسم ڈھانپا ہو۔ سر بھی اگر ڈھانپا ہو تو زیادہ بہتر ہے۔ عورت کے لیے البتہ ضروری ہے کہ وہ سر کو ڈھانپے۔ عورت کے ننگے بالوں کو عریانی سے تشبیہ دی گئی ہے۔[28] رخ یروشلم اور خاص طور پر ہیکل کی جانب اور خاص الخاص حرام الحرم کی جانب ہو۔ اگر کوئی شرعی عذر ہے تو کسی بھی سمت نماز ادا کی جاسکتی ہے بس دل میں خدا کا خیال کرنا ضروری ہے۔ نمازوں کی عبرانی زبان میں ادائیگی کو مقدم رکھا گیا ہے۔ حتی کے بعض ربیوں نے آرامی زبان میں نماز ادا کرنے سے بھی منع کیا ہے۔ البتہ عصر حاضر کے بعض یہودی فرقوں، مثلاً اصلاح شدہ یہودیوں میں عبرانی کی بجائے دیگر زبانوں میں نماز ادا کرنے کا رواج عام ہے۔

کتابِ استثنا کے مطابق نماز کا بنیادی مقصد خدا کی محبت کا اقرار کرنا اور اپنے دل کو اس کے ساتھ جوڑنا ہے۔[29] لہذا اس میں خاص اس بات کا خیال رکھا جاتا ہے کہ نماز صرف و صرف خدا کے لیے پڑھی جائے اور اس میں دھیان سوائے خدا کے کسی اور طرف نہ جائے۔ بنیادی طور پر نماز خدا کا شکر ادا کرنے کے لیے، اس کی تمجید بیان کرنے کے لیے اور اس سے التجا کے لیے کی جاتی ہے۔ نمازوں میں خدا سے مانگنے میں کسی قسم کی شرم یا جھجک کا مظاہرہ نہیں کیا جاتا کیونکہ مدراش کے مطابق خدا سے جتنا زیادہ مانگا جاتا ہے وہ اتنا ہی خوش ہوتا ہے اور اپنے بندوں کو نوازتا ہے۔[30] ربی اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ نماز کے لیے علیحدہ جگہ/عمارت ضرور ہونی چاہیے۔ اس لیے یہودیوں میں سیناگاگ بہت اہمیت کی حامل ہے۔ ایک طرف تو یہ ان کی نماز کی جگہ ہے اور دوسری طرف یہودی ثقافت کا ایک اہم جزو ہے۔ روایتی طور پر سیناگاگ کی عمارت کو شہر کی دیگر عمارتوں سے بلند بنایا جاتا تھا کیونکہ ربیوں کا خیال تھا کہ جس شہر کی عمارتیں سیناگاگ سے اونچی ہوں اس شہر میں تباہی نازل ہوتی ہے۔ ایک نقطہ نظر یہ بھی ہے کہ نماز نیچی جگہ پڑھی چاہیے تاکہ خشوع پیدا ہو سکے۔ سیناگاگ میں عبادت کے متعلق تلمود میں اس قدر زور دیا گیا ہے کہ ربی یہ کہتے ہیں کہ نماز صرف سیناگاگ ہی میں قبول ہوتی ہے۔ جو شخص جس روز سیناگاگ نہیں جاتا خدا اس سے باز پرس کرتا ہے۔ جو شخص اس دنیا کی سیناگاگ میں داخل نہیں ہوتا وہ اگلی دنیا کی سیناگاگ میں بھی داخل نہیں ہو سکتا۔[31] سیناگاگ میں مرد و عورت کی اکٹھی عبادت کے متعلق مختلف روایات ہیں۔ عموماً یہ خیال کیا جاتا ہے ابتدا میں مرد و عورت ہیکل میں اکٹھے قربانی کے لیے جاتے رہے ہیں۔ بعد میں ربیائی یہودیت میں مرد عورت کو نماز میں علیحدہ علیحدہ کرنے کو رواج دیا گیا۔ عصر حاضر میں مختلف فرقے اس ضمن میں مختلف تشریحات پیش کرتے ہیں۔

صدقات

عبرانی زبان میں صدقہ کا لفظ "نیکی" یا "عدل" کے لیے استعمال ہوا ہے۔ یہودی اسی لفظ کو خیرات اور سخاوت کے لیے بھی استعمال کرتے ہیں۔ خیرات صرف ایک فیاضانہ عمل ہی نہیں ہے بلکہ اس کا ادا کرنا ہر یہودی پر فرض ہے۔ خیرات کی مختلف صورتیں ہیں۔ عبرانی بائیبل میں اس کا متعدد جگہ ذکر ہے، مثلاً کتاب استثنا کے مطابق "تمہیں اس غریب شخص کے لئے اپنے دِل کو سخت نہیں کرنا چاہیے۔ اپنی مٹھی کو کسنا نہیں چاہیے۔ اس کے بجائے اپنے ہاتھوں کو کھولو اور

اس آدمی کو جن چیزوں کی بھی ضرورت ہو تو قرض دو۔"[32] کتابِ احبار میں ذکر ہے "ممکن ہے تمہارے ملک کا کوئی شخص اتنا زیادہ غریب ہو جائے کہ اپنے آپ کی مدد نہ کر سکے تو تم اس کی مدد کرنا۔"[33] اسی طرح مزید بیان ہوا ہے: "جب تم اپنے کھیتوں کی فصل کاٹو تو تمہیں کھیت کے کونوں تک فصل کو نہیں کاٹنا چاہیے۔ اور جو اناج زمین میں گرے اُسے مت اٹھاؤ۔ اسے تم غریب لوگوں اور اپنے ملک میں رہنے والے غیر ملکیوں کے لئے چھوڑ دو۔"[34]

یہودیوں کا ماننا ہے کہ توریت میں کل 613 متسواہ یا وصیتیں ہیں جن پر عمل پیرا ہو کر اچھا یہودی بنا جا سکتا ہے۔ صدقہ ایک ایسی نیکی ہے جو باقی تمام متسواہ کے برابر ہے۔ یہ تمام قربانیوں سے بہتر ہے، خدا اور انسان کے درمیان امن اور فہم کو فروغ دیتی ہے، نجات کی طرف لے جاتی ہے، گناہوں سے چھٹکارا دلاتی ہے، موت سے بچاتی ہے اور اس بات کو یقینی بناتی ہے کہ صدقہ کرنے والے کی اولاد عقلمند، دولتمند اور سمجھدار ہو۔ یہ اس کی زندگی لمبی کرتی ہے، اگلے جہان میں جزا کا سبب ہے اور اس کے روزے کی قبولیت کا ذریعہ ہے۔ غرض کہ صدقہ دینے والا دنیا کو رحمدلی اور محبت سے بھر دیتا ہے۔ اس کے برعکس جو صدقہ نہیں دیتا وہ ایسے ہے جیسے بتوں کی عبادت کرے کیونکہ وہ ایک طرح سے پیسے کی عبادت کر رہا ہوتا ہے۔ ربی یہاں تک کہتے ہیں کہ بارشیں نہ برسنے کا سبب لوگوں کا صدقہ سے ہاتھ کھینچ لینا ہے۔[35]

عصر حاضر کے یہودی اپنے گھروں میں ایک نیلے اور سفید رنگ کا ڈبہ رکھتے ہیں جس میں صدقے کی رقم ڈالی جاتی ہے۔ ایسا کرنے کا مقصد بچوں کو صدقہ کرنے کی تربیت دینا ہوتا ہے۔ انہیں اس بات کا احساس دلانا ہوتا ہے کہ اپنے مال سے اپنے غریب یہودی بھائیوں کی مدد کریں۔ عموماً عبادات کے بعد سینا گاگ میں اس ڈبے کو ہر فرد کے سامنے لے جایا جاتا ہے جو اس بات کا احساس دلاتا ہے کہ صدقہ اور عبادت ایک ساتھ چلتے ہیں۔ جب سائرس اعظم نے یہودیوں کو طویل اسیری کے بعد ہیکل کی تعمیر کی اجازت دی تھی تو عزراؑ کے ذمہ یہ لگایا گیا تھے کہ وہ لوگوں کو صدقہ پر ابھاریں تاکہ خانہ خدا کی تعمیر کے لیے رقم اکٹھی ہو سکے۔ اس وقت وہ یہودی جو خود مدد کے لیے نہیں آ سکتے تھے انہوں نے دل کھول کر اپنے مال میں سے صدقہ دیا۔ اسی طرح ربیائی یہودیت کے تحت رواج پانے والے مدارس بھی صدقات سے چلتے تھے۔ ربیوں نے اس ضمن میں کچھ ہدایات مہیا کی ہیں جو صدقہ دینے اور لینے والے کے متعلق رہنمائی کرتی ہیں۔ ان

احکامات کے مطابق ہر شخص پر صدقہ دینا فرض ہے۔ حتی کہ اس شخص کو بھی اپنے سے کمتر لوگوں کو صدقہ دینا چاہیے جو خود صدقہ لے کر گزارا کرتا ہے۔ یہودی اور غیر یہودیوں میں پہلے یہودی کو صدقہ دیا جائے۔ صدقہ دیتے وقت پہلا حق صدقہ دینے والے کے اپنے خاندان کے غریب لوگوں کا ہے۔ اسی طرح صدقہ لینے کے حقدار صدقہ دینے والے کے اپنے شہر کے لوگ پہلے ہیں۔ غیر یہودیوں سے تعلقات بہتر رکھنے کے لیے ان کو بھی صدقہ دیا جا سکتا ہے۔ البتہ خود یہودیوں کو غیر یہودیوں سے معاشی مدد نہیں لینی چاہیے۔ اگر کوئی شخص معاشی مدد طلب کرے تو پہلے یہ دیکھنا چاہیے کہ کیا وہ واقعی محتاج ہے؟ تاہم اگر کوئی شخص کھانا مانگے تو اس کو فورا کھانا دینا چاہیے نہ کہ یہ دیکھیں کہ کیا وہ واقعی صدقہ کا حقدار ہے یا نہیں؟[36] صدقہ دینے کے متعلق عبرانی بائیبل نے بعض مخصوص ہدایات دی ہیں، مثلاً یہ کہ صدقہ رحمدلی سے دیا جائے۔[37] دل کو سخت نہ کیا جائے، "غریب لوگوں کو بنا کسی ہچکچاہٹ کے دو اور اسے دینے کا بُرا نہ مانو۔۔۔"[38]

اس ضمن میں موسی ابن میمون کے فراہم کردہ اصول یہودیوں میں خاصے مقبول ہیں جو صدقے کے مختلف درجات کی وضاحت کرتے ہیں۔ ان درجات کا خلاصہ درج ذیل ہے:

1. آٹھواں درجہ یہ ہے کہ دل برا کر کے دینا۔
2. ساتواں درجہ یہ ہے کہ خوشی سے دینا مگر کم دینا۔
3. چھٹا درجہ یہ ہے کہ مناسب دینا مگر مانگنے کے بعد دینا۔
4. پانچواں درجہ یہ ہے کہ مانگنے سے پہلے دے دینا۔
5. چوتھا درجہ یہ ہے کہ ایسے دینا کہ لینے والے کو تو علم ہو لیکن دینے والے کو نہیں۔
6. تیسرا درجہ یہ ہے کہ ایسے دینا کہ دینے والے کو تو علم ہو لیکن لینے والے کو نہیں۔
7. دوسرا درجہ یہ ہے کہ ایسے دینا کہ نہ دینے والے کو پتہ ہو اور نہ لینے والے کو۔
8. سب سے اعلی اور پہلا درجہ یہ ہے کہ عزت کے ساتھ تحفے کے طور پر دینا یا اچھے انداز میں قرض دینا یا کسی کو کام دینا تا کہ وہ خود کما سکے۔[39]

یہودیوں کو عام حالات میں منع کیا گیا ہے کہ وہ صدقہ لینے سے گریز کریں۔ ادنی ترین کام کر لیں لیکن صدقے نہ لیں (لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ امیر لوگ غریبوں کو ان ہدایات کا طعنہ دیں)۔ جب کوئی واقعی ضرورت مند ہوں تو صدقہ لے تب ایسا کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

مشقی سوالات

مختصر سوالات

1. یہود میں عقائد پر اتفاق کیوں نہیں ہے؟
2. یہود میں خدا پر عقیدہ کی کیا اہمیت ہے؟
3. یہودی خدا کو کن ناموں سے پکارتے ہیں؟
4. غیر یہودی خدا کا نام کیوں نہیں لے سکتا؟
5. شماع کسے کہتے ہیں؟
6. یہودی منتخب قوم کسے کہتے ہیں؟
7. یہودی منتخب قوم کیوں ہیں؟
8. قانون واپسی کیا ہے؟
9. احکام عشرہ کسے کہتے ہیں؟
10. تیرہ اصول ایمانیات کس نے دیے؟
11. مسیح موعود سے کیا مراد ہے؟
12. ارضِ موعود سے کیا مراد ہے؟
13. راسخ العقیدہ اسرائیل مخالف کیوں ہیں؟
14. یہود میں جنت و جہنم کا تصور کیسے آیا؟
15. شیول کسے کہتے ہیں؟
16. اولام ہابا سے کیا مراد ہے؟
17. یہودیت میں نبی کون ہو سکتا ہے؟
18. مشہور نبیہ کے نام لکھیں۔
19. یہودیت میں قربانی کسے کہتے ہیں؟
20. یہود میں مقدس زیارتیں کونسی ہیں؟
21. قربان کا لفظی مطلب کیا ہے؟
22. خیمہ اجتماع سے کیا مراد ہے؟
23. قربانی کا عمل کس کی ذمہ داری تھا؟
24. دوبارہ قربانی کب رائج ہو گی؟
25. یہودیت میں روزہ کسے کہتے ہیں؟
26. یہودیت میں فرض روزے کتنے ہیں؟
27. یہودیت میں روزہ کیوں رکھا جاتا ہے؟
28. یہودیت میں فرض نمازیں کتنی ہیں؟
29. عبرانی میں نماز کو کیا کہتے ہیں؟
30. شخریت سے کیا مراد ہے؟
31. مینحا سے کیا مراد ہے؟
32. معاروسے کیا مراد ہے؟
33. یہودیت میں نماز کی کیا شرائط ہیں؟
34. یہودیت میں نماز کیسے پڑھی جاتی ہے؟
35. کتابِ استثنا نماز کا کیا مقصد بتاتی ہے؟
36. یہودیت میں صدقہ سے کیا مراد ہے؟
37. سیناگاگ کسے کہتے ہیں؟
38. متسواہ کسے کہتے ہیں؟
39. صدقہ کے کیا فوائد ہیں؟
40. صدقہ نہ دینے کا کیا نقصان ہے؟
41. صدقہ دینا کس پر فرض ہے؟
42. صدقہ کس کو دیا جانا چاہیے؟
43. صدقہ دینے کے کیا اصول ہیں؟

تفصیلی سوالات

1. یہودیت میں عقائد سے کیا مراد ہے؟
2. یہودی تصور خدا پر نوٹ لکھیں۔
3. یہود میں منتخب قوم کا نظریہ بیان کریں۔
4. ابن میمون کے تیرہ اصول بیان کریں۔
5. یہودی عقیدہ نبوت پر نوٹ لکھیں۔
6. یہودی عقیدہ آخرت پر نوٹ لکھیں۔
7. یہودیت میں قربانی پر نوٹ لکھیں۔
8. یہودیت میں روزہ پر نوٹ لکھیں۔
9. یہودیت میں نماز پر نوٹ لکھیں۔
10. یہودیت میں صدقہ پر نوٹ لکھیں۔

حوالہ جات

[1]Steinberg, *Basic Judaism*, 32.

[2]خروج 7:20

[3]استثنا 4:6

[4]پیدائش 31:18

[5]خروج 14:3

[6]پیدائش 1:1

[7]گنتی 19:23

[8]خروج 5:19

[9]یسعیاہ 6:42

[10]Dosick, *Living Judaism: The Complete Guide to Jewish Belief, Tradition, and Practice*, 19.

[11]Cohn-Sherbok, *Judaism: History, Belief and Practice*, 427.

[12]احبار 45:26

[13]https://www.mfa.gov.il/mfa/aboutisrael/state/pages/acquisition%20of%20israeli%20nationality.aspx, accessed on 28-4-2021.

[14]خروج 20

[15]Halbertal, *Maimonides: Life and Thought*, 135-36.

[16]Cohn-Sherbok, *Judaism: History, Belief and Practice*, 450.
[17]Dana Evan Kaplan, *American Reform Judaism: An Introduction* (London: Rutgers University Press, 2003), 16.

[18]گنتی 33:16

[19]دوم سلاطین 11:2

[20]Cohn-Sherbok, *Judaism: History, Belief and Practice*, 458-59.
[21]Megillah 14a

[22]پیدائش 27

[23]گنتی 4

[24]احبار 12

[25]استثنا 16:16

[26]یسعیاہ 58

[27]دوم سموئیل 22:12

[28]Ronald L. Eisenberg, *What the Rabbis Said* (California: Praeger, 2010), 240.

[29]استثنا: 13:11

[30]Tehillim 4: 3
[31]Eisenberg, *What the Rabbis Said*, 227.

[32]استثنا 7:15

[33]احبار 35:25

[34]احبار 22:23

[35]Eisenberg, *What the Rabbis Said*, 69.
[36]Ibid., 69-70.

[37]زبور 26:27

[38]استثنا 10:15

[39] Hayim Galevy Donin, *To Be a Jew: A Guide to Jewish Observance in Contemporary Life* (New York: Basic Books Inc, 1972), 50.

چھٹا باب: تہذیب و ثقافت

بنیادی رسوم رواج

ایک مذہبی یہودی کی ساری زندگی مختلف رسومات میں منقسم ہے جو اس کی پیدائش سے لے کر اس کے مرنے کے بعد تک جاری رہتی ہیں۔ مشنا نے اس زندگی کا خلاصہ درج ذیل لفظوں میں بیان کیا ہے:

پانچ سال کی عمر میں مقدس کتب کی پڑھائی، دس سال کی عمر میں مشنا کی پڑھائی، تیرہ سال کی عمر میں وصیتوں کی پیروی، پندرہ سال میں تلمود کی پڑھائی، اٹھارہ سال میں شادی، بیس سال میں ملازمت، تیس سال میں قوت کا عروج، چالیس سال میں دانائی، پچاس میں صلاح دینے کے قابل، ساٹھ میں بڑھاپا، ستر میں سالوں سے بھرپور، اسّی میں "ہمت" کی انتہا، نوے میں خم رسیدہ، سو سال میں مردے کی مانند اور اس دنیا سے کوچ۔[1]

باب ششم کے اہم نکات

1. یہودی ثقافت کا تعارف۔
2. بنیادی یہودی رسومات کا تعارف۔
3. یہودیت میں شادی مرگ کی تقریبات کا تعارف۔
4. یہودی کیلنڈر کا تعارف۔
5. یہودی تہواروں کا تعارف۔
6. اسرائیلی تقریبات کا تعارف۔

ابتدائی یہودیت میں کچھ رسومات مردوں تک محدود تھیں۔ عورت کو بعض عبادات میں شامل نہیں کیا گیا۔ مرد ہی کو گھر کا سربراہ مانا گیا۔ اکثر ربیوں کی دعاؤں میں بھی بیٹوں کا ذکر ہوتا ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ قدیم یہودیوں میں مردوں کو خصوصی اہمیت حاصل تھی۔ اس سے یہ بھی نہیں سمجھنا چاہیے کہ عورت کو کوئی وقعت نہیں دی گئی۔ یہودیت کا ابتدائی دور بزرگوں کا دور کہلاتا ہے۔ عمومی طور پر بزرگوں میں مردوں کو شامل کیا جاتا ہے لیکن مختلف روایات سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ بزرگوں کے اس دور میں عورت کا کردار بھی اہم اور مقتدر تھا، مثلاً اس ضمن میں سارہؓ کا کردار خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔ انہیں کے کہنے پر ہی ابراہیمؑ نے اپنے بیٹے اسماعیلؑ اور اپنی لونڈی ہاجرہؓ کو لق ودق صحرا میں اکیلا چھوڑ دیا۔ وہ خود ایسا کرنے کو راضی نہیں تھے لیکن یہ سارہؓ ہی تھیں جن کے کہنے پر انہیں یہ قدم اٹھانا پڑا۔

یہودیت کا شمار ان مذاہب میں ہوتا ہے جن میں عورتوں کو نبیہ ہونے کا درجہ بھی حاصل

ہے۔یہودی یہ سمجھتے ہیں کہ بعض رسومات یاعبادات سے عورت کو مستثنی کرنا ان کی مذہبی قدر کم کرنا نہیں ہے بلکہ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ خاندان کی دیکھ بھال، گھریلو ذمہ داریاں اور بچے کی پرورش جیسے مشکل کام انہیں کی مرہون منت چلتے ہیں۔اس لیے انہیں بعض جگہوں پر استثنی حاصل ہے۔ عصرِ حاضر میں اصلاح شدہ اور رجعت پسند یہودیوں نے اب ایسی رسومات متعارف کروادی ہیں جو خصوصیت کے ساتھ عورت سے متعلق ہیں۔ چنانچہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس ضمن میں یہودیت میں وقت کے ساتھ ساتھ ارتقا ہوتا آیا ہے۔

یہودی تہذیب و ثقافت کی تعریف کرنا بھی ایک مشکل مرحلہ ہے۔اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ یہودیوں نے اپنی چار ہزار سالہ تاریخ میں بہت کم خود مختار زندگی گزاری ہے۔ یہ جس قوم یا مذہب کے تحت رہے وہاں کی تہذیب و ثقافت سے متاثر ہوتے رہے۔اس لیے یہودیوں کی تہذیب کو تاریخ سے تلاش کرنا ایک دشوار عمل ہے جس میں غلطیوں کی گنجائش بدرجہ اولی موجود ہے۔یہودی مصنفین نے اپنی تہذیب و ثقافت پر جو کتب تحریر کی ہیں وہ بھی زیادہ تر ان کی تاریخ ہی کو تہذیب کی چادر میں لپیٹ کر بیان کرتی ہیں۔ ان کتب سے یہودی تہذیب کی پیچیدگیوں اور موضوع کی وسعت کا علم تو ہوتا ہے تاہم اس عمل کی فلسفیانہ موشگافیوں میں تہذیب و ثقافت کا عملی بیان ثانوی حیثیت اختیار کر جاتا ہے۔اس وجہ سے زیر نظر باب میں یہودی تہذیب و ثقافت کے عملی پہلوؤں یعنی ان کے عمومی رسم و رواج، کیلنڈر اور تہواروں کو مختصراً بیان کیا گیا ہے۔

ختنہ

ختنہ یہودیوں میں ایک مقدس عبادت، عہد اور تہوار کے طور پر منائی جانے والی تقریب ہے۔ عبرانی زبان میں اس کے لیے "بریت میلا" کی اصطلاح استعمال کی جاتی ہے۔ یہ کسی بھی یہودی بچے کی زندگی کا پہلا مرحلہ ہوتا ہے۔اس عمل کی تاریخ ابراہیمؑ کے خدا کے ساتھ کیے گئے عہد سے جاملتی ہے جس کا مختصر بیان پہلے باب میں گزر چکا ہے۔ اسے یہودیوں کو دی گئی پہلی وصیت بھی کہتے ہیں۔ آج تک یہودی اس عہد کی پاسداری کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور ہر نئے بچے کی پیدائش پر آٹھویں روز اس کا ختنہ کیا جاتا ہے۔البتہ تلمود صحت کی خرابی یا کسی جسمانی نقص کی وجہ سے اس عمل کو مؤخر کر دینے کی اجازت دیتی ہے۔اسی طرح اگر کسی عورت کے دو

بیٹے ختنہ کے بعد فوت ہو جائیں تو تیسرے کا ختنہ نہیں کیا جاتا۔[2] بعد میں جب وہ بچہ بڑا ہو جائے اور اسے بیماری کا خطرہ بھی نہ ہو تب وہ اس عمل سے گزر سکتا ہے۔

یہ ایک مذہبی عمل ہے جس کی ادائیگی کے وقت بعض مخصوص دعائیں پڑھی جاتی ہیں۔ گھر میں خوشی کی ایک تقریب منعقد ہوتی ہے۔ کسی بڑے بوڑھے کو "سندک" یعنی روحانی/رضائی باپ مقرر کیا جاتا ہے جو کہ بڑے اعزاز کی بات سمجھی جاتی ہے۔ روحانی باپ کی طرح روحانی ماں بھی مقرر کی جاتی ہے جو بچے کو ختنہ کے کمرے میں لے کر آتی ہے۔ سندک بچے کو کپڑوں میں لپیٹ کر پکڑتا ہے اور "موہیل" بچے کا ختنہ کرتا ہے۔ موہیل ختنہ کرنے والے کو کہا جاتا ہے جو اس کام کے لیے باقاعدہ تربیت یافتہ ہوتا ہے۔ سرکاری طور ایسے لوگ بھی مقرر ہوتے ہیں جو اس عمل کی نگرانی کرتے ہیں تاکہ ختنہ کا یہ قومی اور مذہبی عمل درست طریقے سے ادا ہوتا رہے۔[3] ختنہ کے بعد کھانے کی میز سجتی ہے جس میں ایک کرسی خالی چھوڑ دی جاتی ہے۔ یہ ایلیاہؑ کی نشست سمجھی جاتی ہے جو یہودی عقیدہ کے مطابق مسیحِ موعود سے پہلے دنیا میں دوبارہ آئیں گے۔ چونکہ ایلیاہؑ نے ختنہ کی روایت پر بہت زور دیا تھا لہذا یہودی یہ سمجھتے ہیں کہ ہر ختنہ کے وقت وہ خود موجود ہوتے ہیں۔[4] ختنہ سے پہلے تک اسی نشست پر بچے کو لٹایا جاتا ہے۔ خاندان کے لوگ ایلیاہؑ نبی کی یاد میں گیت گاتے ہیں اور دعائیں مانگتے ہیں۔ اسی تقریب میں بچے کا نام رکھا جاتا ہے۔ بیٹیوں کے نام عموماً سیناگاگ میں رکھے جاتے ہیں جہاں ربی مخصوص دعائیں پڑھ کر نام تجویز کرتے ہیں۔ نسوانیت کی تحریکوں کے زیر اثر بیٹیوں کو بھی اس عمل سے گزارنے کے لیے مختلف رسومات متعارف کروائی جاتی رہی ہیں تاہم یہودیوں کے درمیان اس حوالے سے کوئی نئی رسم مقبول نہیں ہو سکی۔ چنانچہ آج بھی یہودیوں میں بیٹی کی نسبت بیٹے کی پیدائش ایک بڑا واقعہ سمجھا جاتا ہے اور اگر بچہ پہلوٹھا بھی ہو تو اس عمل کی وقعت مزید بڑھ جاتی ہے۔[5]

ختنہ کیے جانے کی ضرورت کے بارے میں یہودیوں میں ایک واقعہ مشہور ہے کہ ایک دفعہ ایک رومی گورنر نے عقیبہ بن یوسف سے پوچھا کہ ختنہ کیوں کیا جاتا ہے؟ اگر ختنہ اتنا ہی ضروری ہوتا تو خدا بچے کو مختون ہی پیدا کرتا۔ اس سوال کے جواب میں ابن یوسف نے کہا کہ "خدا نے دنیا کو ناقص اور غیر مکمل تخلیق کیا ہے اور یہ انسان کے ذمہ ہے کہ اس بے عیب اور مکمل کرے۔"[6] اس لیے ختنہ صرف ایک مذہبی ضرورت ہی نہیں ہے بلکہ کسی یہودی کی زندگی میں

ایک نئے طرزِ فکر کی شروعات بھی ہے۔ اس میں بچپن سے کائنات کے مطالعے اور اسے بہتر بنانے کا شوق پروان چڑھتا ہے۔ اگر کوئی شخص یہودیت کو بطور مذہب بھی اختیار کرے تو اسے بھی ختنہ کے عمل سے گزارا جاتا ہے۔ اگر وہ پہلے ہی مختون ہو تب بھی اس کے عضو تناسل سے خون بہانا ضروری سمجھا جاتا ہے تاکہ خدا سے کیے گئے جسمانی عہد کی پاسداری ہو سکے اور اس شخص کی حیثیت بھی پیدائشی یہودی کے برابر سمجھی جائے۔[7] عصر حاضر میں بھی تقریباً تمام یہودی گروہ اس رسم پر عمل پیرا ہیں۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہوتا ہے کہ تقریب کو گھر میں منعقد کرنے یا مذہبی رنگ دینے کی بجائے ہسپتال میں کسی ماہر سرجن کے ذریعے ختنہ کروالیا جاتا ہے۔

تقریب کفارہ

اگر کسی خاندان میں پہلے بیٹا پیدا ہو تو وہ بچہ پہلوٹھا کہلاتا ہے جس کا کفارہ دیا جانا ضروری ہے۔ کتابِ پیدائش میں ذکر ہے "تمہیں اسرائیلیوں میں سے ہر پہلوٹھے مرد کو مجھے دینا چاہیے۔ ہر ایک عورت کا پہلا نر بچہ اور ہر جانور کا پہلا نر بچہ میرا ہو گا۔"[8] لہذا تاریخی طور پر ہر عورت کا پہلا بیٹا خدا کی نذر ہوتا تھا جس کی قربانی دی جاتی تھی۔ جیسا کہ ابراہیمؑ کو حکم دیا گیا تھا کہ وہ اسحاقؑ کی قربانی دیں۔ یہ قربانی جسمانی طور پر وقوع پذیر نہیں ہوئی تھی اور صرف ایک آزمائش تھی جس پر آپؑ پورے اترے۔ اس لیے پہلوٹھے کو قربان کرنے کی بجائے اس کا کفارہ ادا کیا جاتا ہے جس کا حکم کتابِ گنتی میں ہے: "جب وہ ایک مہینے کا ہو جائے تب تمہیں ان کے لئے کفّارہ لے لینا چاہیے۔ اُس کی قیمت پانچ مثقال چاندی ہو گی۔"[9] یہ کفارہ اس صورت میں ادا کرنا ہو گا جب پہلا بچہ بیٹی نہ ہو بلکہ بیٹا ہو۔ اگر پہلے بیٹی پیدا ہو چکی ہے یا حمل گر چکا ہے تو کفارہ نہیں دیا جاتا۔ اسی طرح اگر بچہ کسی کاہن کے گھر پیدا ہو تب بھی کفارہ کی رسم ادا نہیں کی جاتی۔

کتابِ گنتی کے احکامات پر عمل کرنے کے لیے راسخ العقیدہ یہودی پیدائش کے ایک ماہ بعد بچے کو سیناگاگ لے جاتے ہیں جہاں اس کا والد کاہن کو بتاتا ہے کہ یہ اس کا پہلوٹھا بیٹا ہے۔ وہ بچہ اور پانچ مثقال (تقریباً 96 گرام) چاندی کاہن کو دیتا ہے۔ کاہن بچے کے والد سے پوچھتا ہے کہ اسے بیٹا چاہیے یا چاندی؟ والد کے اثبات کے بعد بچے کو دعاؤں کے ساتھ باپ کے حوالے کر دیا جاتا ہے جس سے کفارے کی رسم طے پا جاتی ہے۔ یہ رسم مذہبی عورتوں کے دل میں تمنا پیدا کرتی ہے کہ ان کی پہلی اولاد بیٹا ہو تا کہ ان کے شوہر "پیدیون ہابین" یعنی کفارے کی رسم ادا کر

سکیں۔ راسخ العقیدہ یہودیوں کے برعکس اصلاح شدہ یہودی اس تقریب کو پسند نہیں کرتے کیونکہ ان کا خیال ہے کہ یہ ایک پرانی رسم ہے جو کاہنوں کے لیے تھی۔ اس سے بیٹیوں کا استحصال ہوتا ہے۔

بار/بات متسواہ

یہودیت میں تیرہ سال بچے کی بلوغت کی عمر سمجھی جاتی ہے۔ ایسے بچے کے لیے "بار متسواہ" کی اصطلاح استعمال کی جاتی ہے جس کا لفظی مطلب "وصیت کا بیٹا" ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ بچہ اب اس قابل ہے کہ وہ توریت کی وصیتوں پر عمل کر سکے۔ اسی لیے یہودی جب با جماعت نماز کی تیاری کرتے ہیں تو پہلی شرط یہ ہوتی ہے کہ نماز میں کم از کم دس ایسے افراد شامل ہوں جن کی عمر تیرہ برس سے اوپر ہو۔ اسی طرح تیرہ سال کی عمر میں بچہ روزہ رکھنے کا مکلف بھی ہو جاتا ہے۔ قدیم یہودیت میں اس تقریب کے انعقاد کا پتہ نہیں چلتا۔ یہ ذکر ضرور ہے کہ تیرہ سال کی عمر میں بچہ توریت کی وصیتوں پر عمل کے قابل ہو جاتا ہے۔ عصرِ حاضر کے یہودی اس تقریب کو باقاعدہ مناتے ہیں۔ بعض مصنفین کے مطابق اس رسم کے تانے بانے قرون وسطی سے جا ملتے ہیں۔[10]

یہ تقریب زیادہ تر اُسی سبت منعقد کی جاتی ہے جس ہفتے بچے کی عمر تیرہ برس ہوتی ہے لیکن یہ لازمی نہیں ہے۔ عصر حاضر کے یہودی اس بات کا زیادہ خیال کرتے ہیں کہ تقریب ایسے دن منعقد ہو جب سیناگاگ میں کوئی اور تقریب نہ ہو رہی ہو۔ بچے سے یہ توقع رکھی جاتی ہے کہ اس وقت تک وہ خود توریت کی تلاوت کے قابل ہو چکا ہو کیونکہ اس تقریب میں اس نے یہ کام کرنا ہوتا ہے۔ اسی لیے اسے "تلیت" پہننے کے قابل بھی سمجھا جانے لگتا ہے۔ تلیت جھالروں والی اُس دھاری دار روایتی چادر کو کہتے ہیں جو یہودی مذہبی تقریبات کے دوران اوڑھتے ہیں۔ کپّا یعنی سر پر پہننے والی ٹوپی اور تلیت ان چند بچی کھچی روایات میں سے ہیں جنہیں یورپی یہودی بھی اپنائے ہوئے ہیں۔ ورنہ اپنے لباس اور رہن سہن میں زیادہ تر یورپی یہودی خصوصاً خواتین نے پرانی روایات کو نظر انداز کر دیا ہے۔ سیناگاگ میں عورتوں کے لیے پردے کا الگ انتظام ہوا کرتا تھا جبکہ عصر حاضر کے اصلاح شدہ یہودی اس پر بھی کاربند نہیں رہے۔

بار متسواہ کی تقریب زیادہ تر سیناگاگ ہی میں منعقد ہوتی ہے۔ بچہ جب توریت کے

مخصوص حصوں کی تلاوت کر لیتا ہے تو اسے تحائف دیے جاتے ہیں جو زیادہ تر رقم کی صورت میں ہوتے ہیں۔ یہاں عجیب شور و غل اور ہنگامے کی کیفیت ہوتی ہے۔اِدھر بچے نے تلاوت مکمل کی اُدھر اس کے ہم جولیوں نے اس پر پیسوں کی برسات کر دی۔ سکوں کی صورت میں انہیں دور سے پھینکا جاتا ہے جن سے چوٹ لگنے کا اندیشہ بھی ہوتا ہے۔ والدین بچے کو ترغیب دیتے ہیں کہ اس رقم کا دس فیصد صدقہ کرے اور بقیہ سنبھال کر رکھ دے۔جب وہ اٹھارہ برس کا ہو جائے تب اسے استعمال کرے۔ عموماً تقریب کا یہ پہلا حصہ سیناگاگ میں منعقد ہوتا ہے اور اس کے بعد کھانے پینے یا رقص کے لیے کسی دوسری جگہ کا انتخاب کیا جاتا ہے۔

بچیوں کی اسی رسم کو "بات متسواہ" کہا جاتا ہے جس کا مطلب "وصیت کی بیٹی" ہے۔ان کی یہ رسم تیرہ کی بجائے بارہ برس کی عمر میں ادا کی جاتی ہے۔ لڑکوں کی نسبت لڑکیوں کے لیے یہ رسم زیادہ اہمیت رکھتی ہے کیونکہ لڑکے تو پیدائش کے ساتھ ہی ختنہ کی رسم سے گزر جاتے ہیں جو ایک طرح سے ان کی یہودی شناخت کا ثبوت ہوتا ہے۔اس کے برعکس لڑکیوں کے لیے بالغ ہونے تک کوئی رسم موجود نہیں ہوتی۔ راسخ العقیدہ یہودیوں کے ہاں اس رسم میں لڑکیاں توریت کی تلاوت نہیں کرتیں جبکہ اصلاح شدہ یہودی یا رجعت پسند یہودیوں کے ہاں لڑکیوں کی تقریب بھی لڑکوں کی تقریب ہی کی طرح منائی جاتی ہے۔[11] اس رسم کا بنیادی مقصد بچے کو یہ احساس دلانا ہوتا ہے کہ اب وہ اپنے اعمال کا خود ذمہ دار ہے۔اسے اپنے مذہبی فرائض ذمہ داری سے سرانجام دینے ہوں گے۔ یہ بھی ضروری نہیں کہ اس رسم کو جب باقاعدہ ادا کیا جائے گا تو ہی وہ مکلف ہو گا۔ چاہے کوئی رسم ادا ہو یا نہ ہو تیرہ برس کی عمر میں پہنچنے کے بعد وہ مکلف ہو جاتا ہے۔

سبت

سبت کسی بھی یہودی کی زندگی کا سب سے اہم حصہ ہے جو جمعہ غروب آفتاب سے شروع ہو کر ہفتہ غروب آفتاب تک جاری رہتا ہے۔ عبرانی بائیبل کے مطابق خدا نے چھ دن میں دنیا تخلیق کی اور ساتویں دن آرام کیا۔اس نے "ساتویں دن کو برکت دی اور اُس کو مقدس دن قرار دیا۔"[12] عبرانی زبان میں سبت کا مطلب ہی "آرام کا دن" ہے۔ احکام عشرہ میں خدا نے خاص طور پر تاکید کی کہ سبت کو یاد رکھا جائے اور مقدس دن کے طور پر منایا جائے۔ چنانچہ سبت ایک ایسا تہوار ہے جو یہودی عقیدے کے مطابق خدا اور انسان دونوں مناتے ہیں۔ جو یہودی سبت کو

مکمل آرام کرتا ہے اسے مکمل یہودی سمجھا جاتا ہے۔یہودیوں میں ایک قول مشہور ہے کہ " جتنا اسرائیل سبت کی حفاظت کرتی ہے اس سے زیادہ سبت اسرائیل کی حفاظت کرتا ہے۔"[13] ابن میمون کے مطابق یہ دن "انسان کی زندگی میں جو آرام لاتا ہے وہ معلوم ہے؛ ہر انسان کی زندگی کا ساتواں حصہ، چاہے چھوٹا ہو یا بڑا، تشفی، میں گزرتا ہے اور اسے دشواری اور مشقت سے آرام دلاتا ہے۔"[14] یہودی مقدس کتب میں اس تہوار کی شرائط پر بہت بحثیں کی گئی ہیں کہ اس دن کیا کر سکتے ہیں اور کیا نہیں۔

ہفتے کے دن

شَبت	ہفتہ
رِیشون	اتوار
شِینی	سوموار
شلیشی	منگل
رِیویعی	بدھ
حمیشی	جمعرات
شیشی	جمعہ

عموماً سبت کے دن ہر قسم کا کام منع کیا گیا ہے۔ چنانچہ یہودی اس دن کوئی کاروبار، تجارت، گھریلو کام وغیرہ نہیں کرتے۔ کچھ یہودی تو اس دن بجلی کی مصنوعات، یہاں تک کے موبائل فون کا استعمال بھی نہیں کرتے۔ یہودی تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ انہوں نے سبت کے احترام کا ہر دور میں خیال رکھا ہے۔ وہ چاہے سلیمانؑ کے دورِ حکومت کی سربلندیوں پر تھے، بابل میں جلاوطن کر دیے گئے تھے، یونانی دور کی تباہ کاریاں دیکھ رہے تھے، مسیحیوں کے مظالم سہہ رہے تھے، مسلمانوں کے ساتھ علمی کاموں میں مشغول تھے یا یورپ میں سامی مخالفت کی بھینٹ چڑھائے جا رہے تھے، انہوں نے سبت کے تہوار کو اہتمام سے منایا ہے۔ تلمود کے مطابق جب وہ ایسا کرنے سے قاصر رہے ان پر تباہی و بربادی نازل ہوئی۔[15] عصر حاضر میں زیادہ تر اصلاح شدہ اور رجعت پسند یہودی سبت کی بیشتر پابندیوں کا خیال نہیں رکھتے۔ البتہ یہ ضرور سمجھتے ہیں کہ اس دن مکمل آرام کیا جائے اور خدا، خاندان اور دوستوں کے ساتھ ایک خوشگوار وقت گزارا جائے۔

روایتی طور پر سبت سے قبل تمام گھریلو کام مکمل کر لیے جاتے ہیں۔ عبرانی بائبل کے مطابق سب سے پہلا کام جو خدا نے تخلیق کے دوران کیا تھا وہ روشنی کرنے کا تھا[16] اس وجہ سے یہودی شمعیں جلا کر سبت کا باقاعدہ آغاز کرتے ہیں اور خالق اور تخلیق کو یاد کرتے ہیں۔ سبت کی

شروعات دعاؤں سے ہوتی ہے جو زیادہ تر زبور سے لی جاتی ہیں۔ باقاعدہ عبادت کا اہتمام سیناگاگ میں کیا جاتا ہے جس میں اجتماعی دعائیں پڑھی جاتی ہیں اور سبت کی مبارک باد دی جاتی ہے جسے "شبت شلوم" کہتے ہیں۔ عبرانی زبان کا لفظ شلوم عربی لفظ سلام ہی کی طرح ہے جس کا مطلب "امن" ہے۔ اصلاح شدہ یہودی یہ عبادات رات کو تاخیر سے شروع کرتے ہیں تاکہ ملازمت پیشہ لوگ بھی بآسانی اس تہوار میں شرکت کر سکیں۔ تاخیر سے شروع کی جانے والی یہ عبادات اپنی نوعیت میں زیادہ رسمی ہوتی ہیں جن میں ربی کا وعظ بھی ہوتا ہے، موسیقی بھی اور کھانے کا اہتمام بھی۔ عبادات کے بعد لوگ دوستوں کے ساتھ وقت گزارتے ہیں، ایک دوسرے کو اس تہوار کی مبارک باد دیتے ہیں اور طنز و مزاح کی محفل سجاتے ہیں۔[17]

جمعہ کا اہم ترین حصہ عشائیہ ہے جس میں عمدہ کھانوں سے مزین میز سجائی جاتی ہے۔ قدیش پڑھنے کے ساتھ کھانا شروع کیا جاتا ہے۔ یہودیت میں شراب نوشی کو خوشی اور تسکین کی علامت سمجھا جاتا ہے لہذا کھانے کی میز پر اس کا ہونا ضروری ہے۔ بیشتر عبادات اور تہواروں میں اس کا استعمال ضرور کیا جاتا ہے۔ گھر کا بڑا شراب کا جام ہاتھ میں پکڑ کر گیت گاتا ہے۔ خاوند، عبرانی بائیبل سے کچھ آیات لے کر اپنی بیوی کی تعریف کرتا ہے اور بچوں کو پیار کرتا ہے۔ ایک مخصوص سفید روٹی توڑ کر کھانے کا آغاز کیا جاتا ہے۔ دن کا اختتام مذہبی دعائیں، مناجات اور گانے گا کر خوشی خوشی کیا جاتا ہے۔

ہفتے کے دن کا سب سے اہم کام توریت کا ہفتہ وارانہ سبق ہوتا ہے جو تمام یہودیوں کے لیے پڑھا جانا ضروری سمجھا جاتا ہے۔ بہتر یہ ہے کہ اس دن کا ایک حصہ عبادات میں اور ایک حصہ مطالعے میں صرف کیا جائے۔ تاہم دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد کا وقت لوگ اپنی مرضی سے گزارتے ہیں۔ کتابیں پڑھنا، گھومنا پھرنا، آرام کرنا یا دوستوں سے ملنا یہ ان کی مرضی ہوتی ہے۔ تقریبا عصر کے وقت توریت کی مختصر تلاوت کی جاتی ہے اور ہلکے پھلکے کھانے کا اہتمام ہوتا ہے۔ یہ کھانے جمعہ کے دن ہی تیار کر لیے جاتے ہیں کیونکہ یہودی سبت کے دن شرعی طور پر آگ نہیں جلا سکتے۔ ہفتے کی شام جب آسمان پر تین ستارے دکھائی دینے لگتے ہیں تو سبت کا اختتام ہو جاتا ہے اور ایک سے زائد شعلوں والی شمع روشن کی جاتی ہے جو اس بات کی نشانی ہوتی ہے کہ اب گھر میں آگ جلائی جا سکتی ہے۔ سبت کا اختتام بھی دعاؤں کے ساتھ کیا جاتا ہے۔

شادی

یہودیت میں انسان کے مجرد رہنے کو پسند نہیں کیا جاتا ہے۔ عبرانی بائیبل کے مطابق آدمؑ وحواؑ کو یہ حکم دیا گیا تھا کہ وہ اپنی نسل کو بڑھائیں۔ اسی لیے یہودیوں کی یہ مذہبی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنی نسل کی حفاظت کریں اور خاندان کو بڑھائیں۔ جب وہ بابل میں غلام بنا کر لے جائے گئے تھے تو یرمیاہؑ نے انہیں یہ نصیحت بھی کی تھی کہ اپنی نسل کو بڑھائیں تاکہ ان کی تعداد کم ہونے کی بجائے بڑھے۔ روایتی طور پر شادی کے لیے لڑکی کی تلاش لڑکے کا باپ اپنے کسی ملازم کے ذریعے کرتا ہے۔ جیسا کہ ابراہیمؑ کی روایت ہے کہ انہوں نے اسحاقؑ کی شادی کے لیے اپنے ملازم کو بھیجا جو ربقہ کو تلاش کر کے لائے۔ اس سلسلے میں تلمود نے یہودی معاشرہ میں ایک اہم کردار ادا کیا ہے۔ اس نے عورت کی توقیر اس کے حسن کی بجائے اس کے ماں بننے کی صلاحیت میں رکھی۔ یہودیوں کو بتایا کہ جس کی بیوی نہیں ہے اس کے پاس نہ تو خوشی ہے نہ برکت اور نہ کوئی اچھائی یا "جس کے پاس بیوی نہیں اس کے پاس توریت نہیں۔"[18] اگر کسی کی بیوی خدا سے ڈرتی ہے اور وہ اس کے پاس نہیں جاتا، اس سے مباشرت نہیں کرتا تو وہ گناہ گار ہے۔ اس سے پہلے تک یہودی اپنی بیوی کو اس وجہ سے بھی طلاق دے دیا کرتے تھے کہ انہیں کوئی دوسری خوبصورت عورت میسر آجاتی۔ لیکن ربیائی ادب نے انہیں یہ باور کروادیا کہ بیوی کے انتخاب میں ایک زینہ نیچے اترو؛ یعنی اگر عورت کمتر حیثیت کی بھی ہو تب بھی اس سے شادی کی جائے۔ لہذا یہودیت میں شادی ایک شرعی عمل کی حیثیت رکھتی ہے۔

یہودیوں میں شادی کی رسومات میں تغیر پایا جاتا ہے جو زیادہ تر علاقائی ثقافت کی وجہ سے ہے۔ کچھ رسومات ایسی ہیں جو تقریباً تمام یہودیوں میں مشترک ہیں۔ شادی کی رسومات کو دو حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ پہلے حصے کو "اوئفروف" کہا جاتا ہے جس کا مطلب "بلانا" ہے۔ اس حصے میں شادی کی تقریب سے پہلے والے سبت میں لڑکے کو "آلیہ" یعنی توریت کے ایک مخصوص حصے کی تلاوت کے لیے بلایا جاتا ہے۔ بعد میں ربی شادی کی تقریب کے خیر وعافیت سے وقوع پذیر ہونے کے لیے دعاؤں اور نیک تمناؤں کا اظہار کرتا ہے۔ راسخ العقیدہ یہودیوں میں صرف لڑکا ہی اس رسم کو ادا کرتا ہے جبکہ اصلاح شدہ اور رجعت پسند یہودیوں میں لڑکی بھی اس رسم کو ادا کرتی ہے۔ بعض یہودیوں کے ہاں اس رسم کی ادائیگی کے بعد لڑکا اور لڑکی پر میٹھی

چیزوں جیسے ٹافیوں کی برسات بھی کی جاتی ہے جس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ انہیں میٹھی اور پر سکون زندگی نصیب ہو۔

شادی کے دوسرے حصے کو "کدوشین" کہتے ہیں جس کا مطلب "تقدس" ہے۔ کدوشین دو حصوں پر مبنی ہے۔ پہلے حصے میں منگنی اور دوسرے حصے میں شادی۔ یہودیت میں پہلے یہ رواج رہا ہے کہ شادی سے کچھ عرصہ پہلے منگنی کی رسم ادا کر دی جاتی اور شادی عموماً سال بعد کی جاتی۔ اب ان دونوں رسموں کو باہم ملا بھی دیا جاتا ہے۔ منگنی کی رسم کی شروعات "کتوبا" پڑھے جانے سے ہوتی ہے۔ کتوبا ایک قانونی دستاویز ہے جس کے بغیر شادی ممکن نہیں۔ کتوبا پر دولھا کی موت یا طلاق کی صورت میں دلہن کو ملنے والی جائیداد یا رقم کے متعلق لکھا جاتا ہے۔ کتوبا کا صرف ایک نسخہ ہوتا ہے جو دلہن کی ملکیت میں رہتا ہے۔ کتوبا کی تاریخ اس بات کی عکاس ہے کہ یہودیت نے تقریباً دو ہزار سال پہلے اس دستاویز کو رواج دے کر عورت کا ایک آئینی اور قانونی حق متعارف کروایا۔ اس سے پہلے کی عورت کو اپنے خاوند کی وفات یا طلاق کے بعد جائیداد میں سے حصہ نہیں ملتا تھا۔ خاوند کی جائیداد اس کے بھائیوں اور بیٹوں میں تقسیم ہو جاتی تھی۔

کتوبا کے پڑھے جانے کے بعد دو گواہ اس پر دستخط کرتے ہیں۔ پھر دولھا، دلہن کو کوئی قیمتی چیز تحفے میں دیتا ہے۔ قیمتی تحفہ دینا بھی شادی کی ایک قانونی ضرورت ہے۔ عصر حاضر میں دولھا اپنی دلہن کے سیدھے ہاتھ کی پہلی انگلی میں سونے کی انگوٹھی پہناتا ہے اور کہتا ہے کہ "تم موسی اور اسرائیل کے قانون کے مطابق میرے لیے محترم ہو۔" شرعی ضرورت یہ ہے مرد عورت کو کوئی قیمتی چیز دے تاہم عصر حاضر کی شادیوں میں دلہن بھی دولھے کو انگوٹھی پہنا کر درج بالا جملہ دوہراتی ہے۔[19] دلہن کے انگوٹھی پہنانے کا رواج زیادہ تر اصلاح شدہ اور رجعت پسند یہودیوں میں ہے۔ اس کے بعد شراب کے ایک کپ پر دعائیں پڑھی جاتی ہیں جسے پہلے دولھا اور پھر دلہن پیتی ہے۔ شادی کے لیے ایک عارضی چھپر بنایا جاتا ہے جسے "خوپا/حوپا" کہتے ہیں۔ علامتی طور پر خوپا نئے گھر کا اظہار ہے جس میں دولھا اور دلہن کو رہنا ہوتا ہے۔ شادی کے بعد سب لوگ خوپا کے نیچے کھڑے ہو جاتے ہیں جو ایک گھر کی تکمیل کی علامت سمجھا جاتا ہے۔

وفات اور ماتم

یہودیت میں کسی بھی شخص کی وفات کے بعد اس پر عائد مذہبی ذمہ داریاں ختم ہو جاتی

ہیں۔اس شخص کی تجہیز و تکفین کی ذمہ داری اہل علاقہ پر ہوتی ہے جس کے لیے انہوں نے ایک انجمن قائم کی ہوتی ہے جسے "خَیورہ کدیشا" یعنی "مقدس انجمن" کہا جاتا ہے۔ عصرِ حاضر میں تجہیز و تکفین کے لیے پیشہ ور لوگ بھی موجود ہوتے ہیں جبکہ پرانے وقتوں سے خیورہ کدیشا ہی یہ ذمہ داری ادا کرتی آئی ہے۔ آج بھی بعض علاقوں میں خیورہ کدیشا ہی آخری رسومات ادا کرتی ہے۔یہودی یہ سمجھتے ہیں کہ مرنے والے کی روح فوری طور پر خدا کے حضور پیش ہو جاتی ہے لہذا ضروری ہے کہ جلد از جلد اس کے جسم کو بھی سپردِ خاک کر دیا جائے۔ عام حالات میں یہ عمل چوبیس گھنٹوں کے اندر مکمل کر دیا جاتا ہے جبکہ خصوصی حالات، مثلاًا گر مرنے والے کے کسی قریبی عزیز نے آنا ہو یا کوئی قانونی دشواری ہو تو اس میں تاخیر بھی کی جاسکتی ہے۔ خیورہ کدیشا کے اراکین میت کو اٹھا کر نہلاتے ہیں اور پھر اسے سفید رنگ کے کپڑے کا کفن پہنا کر لکڑی کے بنے ایک تابوت میں رکھ دیتے ہیں۔ کفن سر کو ڈھکنے کے ایک کپڑے، شلوار، قمیص اور ایک بڑی شال پر مبنی ہوتا ہے جس کے اوپر تلیت بھی ڈال دی جاتی ہے۔ عبرانی بائیبل سے کچھ دعائیں خاص طور پر توریت کی تلاوت کی جاتی ہے اور مردے کو دفنا دیا جاتا ہے۔راسخ العقیدہ یہودی لاش کو قبر میں دفنانا ضروری سمجھتے ہیں کیونکہ ان کا خیال ہے کہ انسان کا جسم خاک سے بنایا گیا ہے[20] اس لیے اسے خاک ہی کے سپرد کرنا چاہیے۔ البتہ عصرِ حاضر میں کچھ یہودی فرقے خصوصاً اصلاح شدہ یہودی لاش کے جلانے کو بھی جائز سمجھنے لگے ہیں۔[21]

چونکہ عزیز کی وفات لواحقین کے لیے رنج و حزن لے کر آتی ہے اس لیے مرنے والے کے ورثا درج بالا رسومات کی ادائیگی سے مستثنیٰ سمجھے جاتے ہیں۔ مرنے والا یا والی کسی کی ماں، باپ، بہن، بھائی، بیٹی، بیٹا، بیوی یا خاوند ہو تو اسے قریبی عزیز ہونے کی وجہ سے نوحہ گر کہا جاتا ہے۔ نوحہ گر کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ جب وہ وفات کی خبر سنے تو اپنے کپڑے پھاڑ ڈالے جو ایک طرح سے ماتم کا عملی اظہار ہے۔ماتم میں "قدیش" پڑھی جاتی ہے جو خدا کی حمد ہوتی ہے۔ اس کے پڑھنے کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ دکھ اور الم کی اس گھڑی میں بھی خدا کو یاد کیا جائے۔[22] ہمسایوں سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ لواحقین کے لیے کھانا بنائیں۔ سات دن تک لواحقین سوائے سبت کے گھر سے نہیں نکلتے اور ماتم پرسی کے لیے آنے والوں سے ملتے ہیں۔ عبرانی زبان میں

سات دن کے اس عرصے کو "شیوآ/شِیفا" کہتے ہیں۔ شیوآ میں لواحقین اپنے بال اور ناخن نہیں تراشتے، غسل نہیں کرتے اور نہ ہی آرام دہ کپڑوں کا استعمال کرتے ہیں۔ گھر میں مرنے والے کی یاد میں ایک شمع جلائی جاتی ہے جسے علامتی طور پر مرنے والے کی روح سمجھا جاتا ہے۔

شیوآ سے اگلے تئیس دن بھی ماتم جاری رہتا ہے جس میں روزمرہ کے کام تو جاری رہتے ہیں لیکن شادی بیاہ کی تقریبات اور خوشی کے تہواروں میں شرکت نہیں کی جاتی۔ ماں باپ کی وفات پر ایک سال تک خوشی کے تہواروں میں شمولیت نہیں کی جاتی۔ ایک سال پورا ہونے کے بعد مرنے والے کی یاد میں ایک دن منایا جاتا ہے جسے "نیرَ نَیشَما" کہتے ہیں۔ اس دن بھی ایک شمع روشن کی جاتی ہے۔ کوشش کی جاتی ہے کہ اس دن مرنے والے کی قبر پر بھی حاضری دی جائے۔ پہلا سال ختم ہونے کے ساتھ ہی نوحہ گر کے ماتم کی مدت بھی ختم ہو جاتی ہے۔ لازمی نہیں ہے کہ مرنے والے کے لیے دعا درج بالا دنوں ہی میں کی جائے۔ یہودیت میں بعض دیگر تہواروں، مثلاً یوم کپور، شووس، سکوت اور پیشاخ کے موقعوں پر بھی مرنے والوں کے لیے اجتماعی دعائیں کی جاتی ہیں۔

یہودی کیلنڈر

نمبر	مہینہ	دن
.1	نسان (مارچ/اپریل)	30
.2	ایار (اپریل/مئی)	29
.3	سیوان (مئی/جون)	30
.4	تاموز (جون/جولائی)	29
.5	آوو (جولائی/اگست)	30
.6	ایلول (اگست/ستمبر)	29
.7	تشري (ستمبر/اکتوبر)	30
.8	چشوان (اکتوبر/نومبر)	30/29
.9	کسلیو (نومبر/دسمبر)	30/29
.10	تیوت (دسمبر/جنوری)	29
.11	شیوت (جنوری/فروری)	30
.12	اداراول (فروری/مارچ)	30
.13	ادار ثانی	29

تہوار

اگرچہ درج بالا تقاریب یعنی بریت میلا، بار متسواہ یا شادی تہواروں ہی کے ضمن میں آتے ہیں لیکن یہ انفرادی ہوتے ہیں۔ ان کا تعلق ایک خاندان یا ایک مخصوص علاقے کے لوگوں

سے ہوتا ہے۔ یہودیت میں ان کے علاوہ بہت سے ایسے مذہبی تہوار بھی ہیں جو اجتماعی طور پر تمام یہودی مناتے ہیں۔ تہوار کو عبرانی زبان میں "خگ/حگ" کہا جاتا ہے۔ ان تہواروں کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ اہم ترین تہواروں کے لیے "یوم طوو" یعنی "اچھا دن" کی اصطلاح استعمال کی جاتی ہے جن میں سبت، پشاخ، شووس، سکوت، روش ہشانہ اور یوم کپور وغیرہ شامل ہیں۔ اس کے علاوہ بہت سے دیگر تہوار جن میں ہنوخا/ہنوکا، سماخ توراۃ اور پیوریم وغیرہ شامل ہیں جو یوم طوو سے کم اہمیت رکھتے ہیں۔ چونکہ ان تہواروں کو منانے کے خاص ایام ہیں جو یہودی کیلنڈر سے منسلک ہیں لہذا تہواروں کے بیان سے قبل یہودی کیلنڈر کا تعارف ضروری ہے تاکہ تہواروں کی تواریخ کو سمجھنے میں دشواری نہ ہو۔

یہودی کیلنڈر

ابتدا میں یہودی واقعات کے حساب سے دنوں کو یاد رکھتے تھے، مثلاً ابراہیمؑ کی عمر کے 175 سال، 40 سالہ صحرا گردی، بادشاہ ساؤل کا 20 سالہ دور حکومت وغیرہ۔ لیکن جب مسیحیوں نے اپنا ایک کیلنڈر ترتیب دینا شروع کیا تو یہودیوں نے بھی خود حساب کر کے دنیا کی تخلیق کے دن کا اندازہ لگایا اور کیلنڈر ترتیب دے لیا۔[23] یہ کیلنڈر شمسی نظام کی بجائے قمری نظام کے حساب سے ترتیب دیا گیا ہے۔ سال میں 12 یا 13 مہینے ہوتے ہیں۔ ہر مہینہ 29 یا 30 دنوں کا ہوتا ہے۔ ہر دن چاند کے طلوع ہونے سے شروع ہوتا ہے اور اگلے دن کے چاند کے نظر آنے تک جاری رہتا ہے۔ یہ ترتیب کتابِ پیدائش سے لی گئی ہے جس کے مطابق "شام ہوئی پھر صبح ہوئی، یہ پہلا دن تھا۔"[24] اس طرح ہر برس کل 354، 353 یا 356 دنوں کا ہوتا ہے۔ قمری سال کا یہ نظام صنہادرین کے دور سے چلا آرہا ہے جنہوں نے متعدد اشخاص کی گواہیوں کے بعد اس کو رائج کیا۔[25] بعد ازاں، یہی کیلنڈر یہودیوں میں رائج ہو گیا جس میں چند ایک تبدیلیاں ہی کی گئیں۔

شمسی اور قمری کیلنڈر میں ایک بڑا فرق یہ ہے کہ ایک شمسی سال میں قمری سال کے 12.4 مہینے آتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر قمری سال شمسی سال سے تقریباً 11 دن چھوٹا ہوتا ہے۔ چونکہ یہودی کیلنڈر قمری ہے لہذا یہ لازمی نہیں ہے کہ ان کے تہوار بھی ہر سال ایک ہی موسم میں آئیں۔ جیسے مسلمانوں کی عیدیں سردی، گرمی، بہار یا خزاں میں کبھی بھی آسکتی ہیں

اسی طرح یہودیوں کے تہوار بھی کسی بھی موسم میں آ سکتے تھے۔ البتہ مسلمانوں کے بر عکس یہ یہودیوں کے لیے ایک مسئلہ ہے کیونکہ ان کے بعض تہوار موسموں سے منسلک ہیں اور موسم شمسی سال کے حساب سے وقوع پذیر ہوتے ہیں۔ اس مشکل سے بچنے کے لیے یہودی اپنے کیلنڈر میں ہر 19 سال میں 7 اضافی مہینے شامل کرتے ہیں جو ادار کے مہینے میں ہر تیسرے، چھٹے، آٹھویں، گیارہویں، چودہویں، سترہویں اور انیسویں سال شامل ہوتے ہیں۔ اس اضافی مہینے کو لیپ کا مہینہ کہتے ہیں اور جس سال یہ اضافی مہینہ شامل کیا جائے اسے لیپ کا سال کہتے ہیں۔ یہ سال 384، 383 یا 385 دن کا ہوتا ہے۔ کیلنڈر میں اس مہینے کو ادار ثانی کا نام دیا گیا ہے جس کے 29 دن ہوتے ہیں۔ اس کیلنڈر کے مطابق 2021 عیسوی میں کائنات کو تخلیق کیے کم از کم 5781 برس گزر چکے تھے۔ اس حساب سے یہ کتاب یہودی کیلنڈر کے مطابق 5781 میں اور عیسوی کیلنڈر کے حساب سے 2021 میں لکھی گئی ہے۔ عصر حاضر کے یہودی یہ مانتے ہیں کہ کائنات کی تخلیق کئی ملین سال پرانی ہے تاہم ان کا یہ بھی خیال ہے کہ درج شدہ انسانی تاریخ یعنی وہ وقت جب انسان کو اس کائنات میں موجودگی کا ادراک ہوا، کو گزرے 5781 برس ہی ہوئے ہیں۔

یہودی جب جلا وطنی کی زندگی گزار رہے تھے یا مختلف علاقوں میں مقیم تھے تو ان کے تہواروں کے ایام میں فرق آ جاتا تھا۔ کبھی کبھی بعض علاقوں تک اطلاع وقت پر نہیں پہنچتی تھی یا بادل وغیرہ ہونے سے نئے مہینے کا ادراک نہیں ہوتا تھا لہذا وہ ہر تہوار دو دو دن مناتے تھے تاکہ ایک ہی وقت میں تمام یہودی وہ تہوار منا رہے ہوں۔ عبرانی بائبل میں ایسی کوئی روایت نہیں ہے جس سے یہ پتہ چلتا ہو کہ تہوار دو دن منائے جا سکتے ہیں جبکہ راسخ العقیدہ یہودی تہواروں کو دو دن منانا ہی پسند کرتے ہیں۔ البتہ اصلاح شدہ یہودی، تہوار ایک دن ہی مناتے ہیں۔[26] اسی طرح جدید اسرائیل میں بھی تہوار ایک دن ہی منائے جاتے ہیں۔ مشہور یہودی تہواروں کا مختصر تعارف ذیل میں درج کیا جا رہا ہے۔

روش ہشانہ

روش ہشانہ نئے یہودی سال کا تہوار ہے جو تشری/تسری کے پہلے اور دوسرے دن منایا جاتا ہے۔ تشری قدیم یہودی کیلنڈر کا پہلا مہینہ ہے جبکہ موسموں کے مطابق نسان پہلا مہینہ

ہے۔ دس دن جاری رہنے والا یہ تہوار یہودیوں کے لیے غور و فکر اور معافی کا موقع ہوتا ہے جس وجہ سے ان دنوں کو "یامیم نَورائیم "یعنی" ہیبت کے ایام" بھی کہا جاتا ہے۔ یہودی گزرے سال پر غور کرتے ہیں کہ وہ کیسے گزارا، ان سے کیا گناہ سرزد ہوئے اور کیسے ان گناہوں کی تلافی ممکن ہے۔ روش ہشانہ کی تیاری اس سے پہلے والے ہفتے ہی شروع کر دی جاتی ہے اور آدھی رات کو اٹھ کر خدا سے معافی مانگی جاتی ہے۔ ایسا کرنے کا مقصد یہ ظاہر کرنا ہوتا ہے کہ معافی مانگنے اور بخشے جانے کے لیے یہودی کس قدر مشتاق ہیں۔

برکت کے لیے سیناگاگ میں توریت کے طومار اور اس سے متعلقہ چیزوں کو سفید کپڑے میں لپٹا یا جاتا ہے۔ یہودیوں کا عقیدہ ہے کہ سال کے پہلے دن تمام انسان خدا کے سامنے پیش ہوتے ہیں جن میں سے کچھ کو اچھا اور کچھ کو برا نامزد کر دیا جاتا ہے۔ ایک بڑی تعداد ان لوگوں کی ہوتی ہے جو اچھے اور برے کے درمیان ہوتے ہیں۔ ان لوگوں کے لیے ضروری ہے کہ وہ جس قدر ہو سکتا ہے خدا سے معافی مانگیں تاکہ یوم کپور آنے سے پہلے پہلے خدا کی خوشنودی حاصل ہو سکے۔[27] اس دن یہودی ایک دوسرے کو نئے دن کی مبارک اور دعا دیتے ہیں کہ نیا سال ان کے لیے اچھا ہو۔ روش ہشانہ اور یوم کپور کے درمیان آنے والے سبت کو بھی تاسف کا سبت سمجھا جاتا ہے۔ اس سبت کی عمومی عبادات میں توبہ و استغفار سے متعلق دعاؤں کا اضافہ کیا جاتا ہے۔

اضافی نئے یہودی سال

1. نسان: بادشاہوں کا نیا سال۔
2. ایلول: جانوروں کا نیا سال۔
3. شیوت: درختوں کا نیا سال۔

روش ہشانہ کی شام کے کھانے سے پہلے یا بعد سیناگاگ میں ایک عبادت منعقد کی جاتی ہے۔ اگلے دن تقریب کا آغاز ناشتے سے ہوتا ہے۔ شمعیں روشن کی جاتی ہیں اور شراب پر قدیش کا ورد ہوتا ہے۔ پھر یہ دعا پڑھی جاتی ہے کہ "خدا کرے یہ تمہاری مرضی ہو، اے خداوند خدا ہمارے خدا کہ ایک نئے اور میٹھے سال کے لیے ہمارا احیا ہو" اور سیب کو شہد میں ڈبو کر کھایا جاتا ہے۔ دو دن تک سیناگاگ میں ایک طویل عبادت منعقد کی جاتی ہے (لبرل یہودی صرف ایک دن عبادت کرتے ہیں)۔ اس دن لوگوں کو متوجہ کرنے کے لیے بھیڑ کا سینگ جسے شوفر کہتے ہیں پھونکا جاتا ہے۔ شوفر کی وجہ سے لوگ روش ہشانہ کو "شوفر پھونکنے کا دن" بھی کہتے ہیں۔[28] اس کے علاوہ ا

اس دن کو "یوم الدین" یعنی "فیصلہ کا دن" بھی کہا جاتا ہے۔ عبادت کا آخری حصہ تین بنیادی اجزاپر مبنی ہوتا ہے:

1. یہ ماننا کہ خدا ہی کائنات کا بادشاہ ہے۔
2. یہ ماننا کہ خدا لوگوں کے اعمال یاد رکھتا ہے اور اچھوں کو جزا اور بروں کو سزا دیتا ہے۔
3. یہ ماننا کہ شوفر کی آواز کے ذریعے خدا نے اپنی مرضی کوہِ سینا پر نازل کی اور وہ مسیحِ موعود کے دور میں دنیا کو مکمل کرنے کے لیے خود کو دوبارہ نازل کرے گا۔

راسخ العقیدہ یہودیوں کے دن کا اختتام عموماً دریا یا ندی کنارے کھڑے ہو کر آب رواں میں روٹی کے ٹکڑے پھینک کر ہوتا ہے جو یہ ظاہر کرتا ہے بہنے والے ٹکڑوں کی طرح گناہ بھی دھل گئے ہیں۔ اسے صرف ایک علامتی رسم کے طور پر لیا جاتا ہے حقیقتاً یہ نہیں سمجھا جاتا کہ اس عمل سے انسان کے گناہ ختم ہو جاتے ہیں۔

یوم کپور

روش ہشانہ سے دسویں دن یعنی تشری کی دس تاریخ کو منایا جانے والا یہ تہوار کفارے کا دن کہلاتا ہے۔ اسے سال کا مقدس ترین دن سمجھا جاتا ہے۔ کتابِ گنتی میں آیا ہے: "ساتویں مہینے کے اول روز ایک خاص اجلاس ہو گا۔ اس دن تم روزہ رکھو گے اور کوئی کام نہیں کرو گے۔"[29] یہ روزہ پچیس گھنٹے کا ہوتا ہے۔ چنانچہ یوم کپور سے پہلے والی شام روزہ رکھا جاتا ہے جو اگلے دن کی شام تک جاری رہتا۔ بچوں اور بیماروں کے علاوہ تمام لوگوں پر یہ روزہ فرض ہے۔ یوم کپور عبادت میں گزارنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ ازدواجی تعلقات سے مکمل گریز کیا جاتا ہے۔ آرام دہ کپڑوں، زیورات یا میک اپ وغیرہ کا استعمال بھی نہیں کیا جاتا۔ چونکہ اس دن کوئی بھی کام کرنے کی اجازت نہیں ہوتی اس لیے یوم کپور کو "سبت کا سبت" بھی کہا جاتا ہے۔ یہودی خدا سے معافی مانگتے ہیں، اس کی حمد گاتے ہیں اور اپنی ذات میں غور و فکر کرتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ اس دن خدا حساب و کتاب کرتا ہے اور اچھے بروں کے متعلق لکھ دیا جاتا ہے۔ اس وجہ سے اس دن جب وہ ایک دوسرے سے ملتے ہیں تو دعا دیتے ہیں کہ ان کا حساب اچھا لکھا جائے۔

کتاب احبار میں ذکر ہے: "دھیان رکھو کہ ساتویں مہینے کا دسواں دن کفارے کا دن ہے، تمہارے لئے ایک مقدس اجتماع ہے۔ اس دن تمہیں خاکسار ہونا ہے اور خداوند کو تحفہ پیش کرنا

ہے۔"[30] اس لیے یہودی اس دن اپنے نفس کو مٹانے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ یوم کپور میں کی جانے والی عبادات صرف خدا اور بندے کے درمیان معافی کے رشتہ کو استوار کرتی ہیں۔ ان عبادات میں خدا کے حقوق تو معاف ہو سکتے ہیں لیکن بندوں کے حقوق نہیں۔ اگر کوئی اپنے بھائی کا گناہ گار ہے تو اسے اپنے بھائی سے معافی مانگنی ہو گی۔ جب اس نے اپنے بھائی کا دل دکھایا تھا تو اس نے نہ صرف بھائی کے حقوق غصب کیے بلکہ خدا کا قانون بھی توڑا تھا۔ اب بھائی سے معافی مانگنے اور اسے منانے کے بعد اسے خدا سے معافی مانگنی ہے۔ اس لیے یہودی صبح کی عبادت کے بعد سیناگاگ میں ایک دوسرے سے معافی طلب کرتے ہیں۔ دوپہر کی عبادت میں مرنے والوں کے لیے دعا کی جاتی ہے۔ اس میں خصوصی طور پر ہیکل کی تباہی میں مرنے والے یہودیوں کو یاد رکھا جاتا ہے۔ دوپہر کی عبادات کا خاص حصہ کتاب یوناہ کی تلاوت ہے جس میں معافی پر خصوصی زور دیا گیا ہے۔ جب سورج غروب ہونے لگتا ہے تو ایک خصوصی دعا "نعیلا" پڑھی جاتی ہے۔ تاریکی پھیلنے پر شوفر سات دفعہ دہرا کر شوفر پھونکا جاتا ہے اور مل کر کہا جاتا ہے کہ "اگلے سال یروشلم میں" جو کہ یروشلم حاصل کرنے کے یہودی عزم کا اعادہ ہے۔ راسخ العقیدہ یہودی اس دن کسی پرندے کو ذبح کر کے اسے بیچتے ہیں اور حاصل ہونے والی رقم کو صدقہ کر دیتے ہیں۔ اصلاح شدہ یہودیوں میں اس رسم پر مکمل پابندی ہے۔ وہ پرندہ ذبح کرنے کی بجائے رقم صدقہ کرتے ہیں۔[31] اس دن کے اختتام پر روزہ کھولا جاتا ہے۔ عزیز و اقارب اور دوست ایک جگہ اکٹھے ہو کر افطار کرتے ہیں۔

سکوت

یوم کپور کے چار دن بعد تشری کی 15 تاریخ کو خیموں کا ایک تہوار منایا جاتا ہے جسے سکوت (خیمے) کہتے ہیں۔ اسے خزاں کی کٹائی کا تہوار بھی سمجھا جاتا ہے۔ آٹھ یا نو دن جاری رہنے والے اس تہوار کو بنی اسرائیل کے ان لوگوں کی یاد میں منایا جاتا ہے جنہوں نے مصریوں کی غلامی سے آزادی کے بعد صحرائے سینا میں خیمہ وغیرہ لگا کر اپنے کٹھن دن گزارے تھے۔ اس تہوار کا پہلا اور آخری دن سب سے اہم ہوتا ہے جن کو یوم طوو یعنی اہم تہوار کے طور پر منایا جاتا ہے۔ جو لوگ اسرائیل سے باہر رہے ہیں وہ نو دن کا تہوار مناتے ہیں جس کے ابتدائی اور آخری دو دو دن، ایام طوو ہوتے ہیں۔ یہودی آج بھی ان دنوں میں گھروں سے باہر خیمے لگا کر رہتے ہیں۔ یہ ایک

طرح سے بنی اسرائیلیوں سے اظہار یک جہتی ہوتا ہے۔ان خیموں کی چھتوں کو درختوں کے پتوں اور چھالوں سے بنایا جاتا ہے تاکہ دن کو سورج کی روشنی اور رات میں تاروں کی چمک دکھائی دیتی رہے۔ان دنوں یہ خیمے ہی مسکن ہوتے ہیں۔ موسمی پھلوں پر مبنی کھانے، مہمانوں کی تواضع اور شب باشی کا انتظام بھی یہیں ہوتا ہے۔

اس تہوار کے دو اہم جزو ہیں۔ چکوترے کی فراہمی اور کھجور کی شاخ پر مہندی اور برگِ بید لگا کر ایک چھڑی سی تیار کرنا۔ عبادات کے دوران ان دونوں چیزوں کو اکٹھے ہر طرف لہرایا جاتا ہے جو اس بات کا اظہار ہوتا ہے کہ خدا نے انہیں ہر چیز سے نوازا ہے۔ کتابِ احبار میں خصوصیت سے ذکر آیا ہے کہ : "یوم اول میں تم خود کے لئے درختوں سے تازہ پھل لاؤ گے۔اور تم کھجور کے درخت، برگ آور درخت اور بید کے درخت کی شاخیں بھی لاؤ گے۔ تم اپنے خداوند خدا کے سامنے سات دن تک جشن مناؤ گے۔"[32] اگلے سب ایام میں بھی مختلف عبادات جاری رہتی ہیں جن میں سبت زیادہ خصوصیت کا حامل ہوتا ہے کیونکہ اس دن کتاب واعظ کی تلاوت کی جاتی ہے۔

ہوشانارَبّہ

سکوت کے ساتویں دن کو ایک الگ تہوار بھی کہا جا سکتا ہے۔ یہ دن جسے "ہوشانارَبّہ" کہتے ہیں تشری کا اکیسواں دن ہے۔اس دن سات گھیرے بنا کر عبادت کی جاتی ہے۔یہودی کہتے ہیں کہ یوم الدین کو لوگوں کا حساب مکمل ہوتا ہے اور ہوشانار بہ کو اسے آگے بڑھایا جاتا ہے آخر میں اپنی چھڑیاں زمین پر ماری جاتی ہیں۔

شمینی اتسیریت

اس تہوار کا آٹھواں دن بھی ایک الگ تہوار ہے جسے "شمینی اتسیریت" کہتے ہیں۔ کتابِ احبار کے مطابق: "تم سات دنوں تک خداوند کو تحفہ پیش کرو گے۔ آٹھویں دن تم دوسرا مقدس اجتماع منعقد کرو گے۔ تم خداوند کو تحفہ پیش کرو گے۔ یہ تقریب کا دن ہے۔ تمہیں کوئی کام نہیں کرنا ہے۔"[33] چنانچہ اس دن کو یوم طوو کے طور پر منایا جاتا ہے۔اس دن خصوصی طور پر بارش کے لیے دعا کی جاتی ہے۔ چونکہ آگے موسم سرما ہے تو بارش کی امید اچھی فصل کی نوید بن جاتی ہے۔اشکنازی یہودی اس دن فوت شدگان کے لیے دعائے مغفرت بھی کرتے ہیں۔

سیمحاط توراۃ

یہ توریت کی تلاوت کی تکمیل کا دن بھی ہے لہذا اسی دن ایک ذیلی تہوار بھی منایا جاتا ہے (اسرائیل سے باہر رہنے والے یہودی اس تہوار کو نویں دن پر لے جاتے ہیں)۔ صبح اور شام خصوصی عبادات منعقد ہوتی ہیں۔ توریت کو صندوق سے نکال کر پڑھا جاتا ہے جو کہ بہت خوشی کا لمحہ ہوتا ہے۔ اس کا اظہار جھوم جھوم کر کیا جاتا ہے۔ اسی نسبت سے اس دن کو "سیمحاط توراۃ" یعنی "توریت کی خوشی منانے کا دن" کہا جاتا ہے۔ اس دن کتاب استثنا کا آخری حصہ اور کتاب پیدائش کا پہلا حصہ پڑھا جاتا ہے جو ایک طرح سے توریت کی تکمیل کا عملی اظہار ہے۔ عصر حاضر کے جدت پسند یہودی اس تہوار کو زیادہ جوش و خروش سے نہیں مناتے۔ ایک طرح سے یہ ان میں ایک دم توڑتی روایت ہے۔ البتہ راسخ العقیدہ یہودی آج بھی اس تہوار کی قدر کرتے نظر آتے ہیں۔[34]

پیشاخ

پیشاخ/پیساخ سات یا آٹھ دن جاری رہنے والا ایک تہوار ہے جو نسان کی 15 تاریخ سے شروع ہوتا ہے۔ یہ تہوار مصریوں کی غلامی سے آزادی کی خوشی میں منایا جاتا ہے۔ بہار میں منعقد ہونے کی وجہ سے اسے "جشن بہاراں" اور بنی اسرائیل کے دریائے نیل پار کرنے کی نسبت سے اسے "عبوری دریا" کا تہوار بھی کہا جاتا ہے۔ پہلوٹھے پیشاخ سے پہلے والے دن روزہ رکھتے ہیں۔ وہ خدا کا شکر ادا کرتے ہیں کہ جب اس نے مصریوں پر وبائیں نازل کیں اور ان کے پہلوٹھوں کو مارا تو بنی اسرائیل کے پہلوٹھوں کی حفاظت کی۔ یہودی اس دن صدقہ کرتے ہیں اور یہ اطمینان کرتے ہیں کہ کوئی بھی گھرانہ ایسا نہ ہو جس کے ہاں ضروریات زندگی کی چیزیں پیشاخ کے لیے موجود نہ ہوں۔

یہودی اس دن بے خمیری روٹیاں استعمال کرتے ہیں جنہیں "مصا" کہا جاتا ہے۔ مصا کو صرف گندم، جو، گیہوں، رئی یا ارا روٹ سے ہی بنایا جا سکتا ہے۔ یہ برصغیر میں بننے والی چپاتیوں جیسی ہوتی ہے جو نان کی نسبت قدرے سخت ہوتی ہیں کیونکہ انہیں خمیر اٹھائے بغیر تیار کیا جاتا ہے۔ مصا کھانے کا بنیادی مقصد مصر سے نکلنے والے یہودی بھائیوں کے ساتھ اظہار یک جہتی ہے کہ جب وہ لوگ موسیٰؑ کے ساتھ گھروں سے نکلے تھے تو افراتفری کا عالم تھا۔ ان لوگوں نے پیٹ

کا جہنم پر کرنے کے لیے جیسا کھانا میسر آیا کھایا۔ چنانچہ مصا ان مہاجرین کی یاد تازہ کرنے کے لیے کھائی جاتی ہے۔ تلمود تفصیلاً بیان کرتی ہے کہ اس دن کیا کھایا جائے اور کیا نہیں۔ منع کی جانے والی چیزوں کو بحیثیت مجموعی "حَمِض" کہا جاتا ہے۔ راسخ العقیدہ یہودی دودھ سے بنی اشیا اور گوشت کو اکٹھا کرنا پسند نہیں کرتے۔ اس میں وہ اتنی احتیاط برتتے ہیں کہ دودھ اور گوشت کے برتن بھی کچن میں علیحدہ علیحدہ ہوتے ہیں۔ ایک ہی فریج میں دودھ اور گوشت اکٹھا نہیں کیا جاتا (اس معاملے میں اصلاح شدہ یہودی زیادہ احتیاط نہیں برتتے)۔ پیشاخ کے موقع پر بننے والے کھانوں میں خصوصیت سے اس بات کا خیال رکھا جاتا ہے۔ ایک برس قبل ہی ان اشیا کو الگ کر کے ڈبوں میں علیحدہ علیحدہ محفوظ کر لیا جاتا ہے۔ گھر کو اچھی طرح دھویا جاتا ہے۔ روٹی یا بسکٹ وغیرہ کے ٹکڑوں کو صاف کیا جاتا ہے۔ کوشش کی جاتی ہے کہ فریج، اوون، برتن اور چولھے وغیرہ کو بھی اچھی طرح دھو کر صاف کر دیا جائے۔

مذہبی یہودی اس معاملے میں اس قدر حساس ہیں کہ بند ڈبوں میں پڑی حمض کی ملکیت سے بھی انکار کرتے ہیں۔ گھر میں یا دوکان وغیرہ پر کھانے کی بہت سی ایسی چیزیں ہو سکتی ہیں جو پیشاخ کے اصولوں کے تحت رکھنے کی اجازت نہیں۔ اگر ان کو ضائع کر دیا جائے یا اصولی طور پر جلا دیا جائے تو اس سے معاشی نقصان کا اندیشہ ہے۔ لہذا اس کے لیے انہوں نے ایک حل یہ نکالا ہے کہ ربی ایک قانونی دستاویز بنا کر ایسی تمام چیزوں کو کسی غیر یہودی کو بیچ دیتا ہے۔ پیشاخ گزرنے کے بعد اس بیع کو منسوخ کر دیا جاتا ہے اور چیزیں دوبارہ اس یہودی کی ملکیت میں آجاتی ہیں۔[35] اس کے علاوہ بعض یہودی اپنے گھر کے علاوہ کسی غیر یہودی کے ہوٹل وغیرہ میں جا کر حمض کھا لیتے ہیں۔ پشاخ کی پہلی شب (اور بعض کے ہاں دوسری شب بھی) نہایت اہم ہوتی ہے۔ اس رات سیدر کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ سیدر اس کھانے کو کہتے جو بے خمیری روٹی سے تیار کیا جاتا ہے۔ کھانے پر خوشی منائی جاتی ہے، رقص اور گانے کا اہتمام ہوتا ہے اور کسی بڑے بوڑھے سے خروج کی ساری داستان سنی جاتی ہے۔ سیدر کے لیے سجنے والی میز پر مصا کے علاوہ ایک سیدر پلیٹ ہوتی ہے جس میں پانچ طرح کی کھانے کی چیزیں ہوتی ہیں۔ ان چیزوں میں سے ہر ایک درج ذیل مخصوص علامتی حیثیت رکھتی ہے۔

1. بھنا ہوا انڈا ہیکل میں کی جانے والی قربانی کی علامت ہے۔

2. سبزی بہار کی علامت ہے۔
3. میمنے یا مرغی کی ہڈی قربانی کی علامت ہے۔
4. تلخ جڑی بوٹی مصریوں کی غلامی کی علامت ہے۔
5. سیب، خشک میوے اور شراب کا آمیزہ عبرانی غلاموں کی محنت کی علامت ہے۔

کھانا کھانے کا بھی ایک خاص عمل ہے جو ہاتھ دھونے سے شروع ہوتا ہے اور عبوری دریا پر پڑھے جانے والے گانوں سے ختم ہوتا ہے۔ بنیادی طور پر پیشاخ کے پہلے اور آخری دو روز زیادہ اہم ہیں جن میں سیناگاگ میں مختلف عبادات سرانجام دی جاتی ہیں۔ کوئی کام نہیں کیا جاتا اور چھٹی کے دن آرام کر کے گزارے جاتے ہیں۔ البتہ اصلاح شدہ یہودی ان میں سے ایک ایک دن مناتے ہیں۔ اسرائیل میں بھی ایک دن ہی کا رواج ہے۔

شووس

شووس/ شعوعوت ایک یا دو دن جاری رہنا والا "ہفتوں" کا تہوار ہے جو سیوان کی 6 اور 7 تاریخ کو منایا جاتا ہے۔ تہوار کی نسبت موسیٰؑ کو کوہِ سینا پر توریت دیے جانے کی طرف کی جاتی ہے۔ راسخ العقیدہ اور رجعت پسند یہودی اسے دو دن جبکہ اصلاح شدہ یہودی اسے ایک دن مناتے ہیں۔ اسرائیل میں بھی یہ ایک دن ہی منایا جاتا ہے۔ اسے ہفتوں کا تہوار اس لیے کہتے ہیں کہ عبوری دریا کے بعد 7 ہفتے اس کا انتظار کیا جاتا ہے۔ راسخ العقیدہ یہودیوں میں ان ہفتوں میں فضا سوگوار ہوتی ہے کیونکہ انہیں دنوں میں عقیبہ بن یوسف کے شاگرد ایک وبا کا شکار ہوئے تھے۔ لہذا وہ ان دنوں میں شادی بیاہ کا انعقاد نہیں کرتے۔[36]

یہ تہوار فصل کی کٹائی کا تہوار بھی ہے۔ کتابِ استثنا میں آیا ہے: "جب تم فصل کاٹنا شروع کرو تب سے تمہیں سات ہفتے گننے ہیں۔ تب خداوند اپنے خدا کے لیے ہفتوں کی تقریب مناؤ اُسے ایک رضا کا نذرانہ پیش کرو۔ تمہیں کتنا دینا ہے اس کا فیصلہ یہ سوچ کر کرو کہ خداوند تمہارے خدا نے تمہیں کتنی برکت دی ہے۔"[37] اس دن سیناگاگ میں عبادات کی جاتی ہیں، زبور پڑھی جاتی ہے اور توریت کے احکام عشرہ دوہرائے جاتے ہیں۔ جو لوگ دوسرے دن کا تہوار مناتے ہیں وہ کتاب روت کی تلاوت کرتے ہیں۔ روت ایک ایسی غیر یہودی عورت تھیں جنہوں نے اپنی ساس کو کہا تھا کہ "مجھے اپنے ساتھ جانے کی اجازت دو۔ تم جہاں کہیں بھی جاؤ گی

میں وہیں جاؤں گی، جہاں بھی تم سوؤ گی میں بھی وہی سوؤں گی۔ تمہارے لوگ میرے لوگ ہوں گے تمہارا خدا میرا خدا ہو گا۔"[38] چونکہ روت نے تمام مذہبی احکامات ماننے کا عہد کیا تھا لہذا ایک طرح سے وہ توریت اور خدا دونوں پر ایمان لائیں تھیں۔ یہ تہوار بھی توریت کے متعلق ہے اس لیے کتاب روت کی تلاوت کر کے یہودی اس دن اپنا ایمان تازہ کرتے ہیں۔

یہودیوں کی مشہور روحانی تحریک قبالہ کے پیروکار اس پوری رات جاگ کر توریت کی تلاوت کرتے ہیں۔ سیناگاگ کو پھولوں اور سبز چیزوں سے سجایا جاتا ہے۔ کھانے میں پھلوں اور دودھ کو ترجیح دی جاتی ہے۔ پھل اس لیے استعمال کیے جاتے ہیں کہ یہ فصل کی کٹائی کا تہوار ہے اور دودھ اس لیے استعمال کیا جاتا ہے کہ توریت جن لوگوں کو دی گئی تھی مذہب کے اعتبار سے وہ بچے تھے۔ بچوں کی سب سے اہم غذا دودھ ہے جس وجہ سے اس دن دودھ سے بنی چیزوں کو فوقیت دی جاتی ہے۔ بعض یہودی مصنفین شکایت کرتے ہیں عصر حاضر کے یہودی اس تہوار کو اہمیت نہیں دیتے جس کی وجہ سے یہ ایک غیر اہم تہوار بن کر رہ گیا ہے۔[39] عصرِ حاضر میں اس تہوار کی ایک نئی نسبت سامنے آئی ہے۔ شمعون باریوحائی جنہوں نے تلمود کی تکمیل میں انتہائی اہم کردار ادا کیا تھا، کی وفات بھی انہیں دنوں ہوئی تھی۔ اس لیے عصر حاضر کے یہودی اسے استاد کی تعظیم کے دن کے طور پر منانے لگے ہیں۔ اسی نسبت سے سکولوں میں نتیجے کا اعلان بھی اسی موسم میں ہوتا ہے جو توریت کے احکام عشرہ کو ماننے کی علامت بھی سمجھا جانے لگا ہے۔

تیشا باؤ

آو کی نو کو منایا جانے والا یہ تہوار ہیکل کی پہلی اور دوسری تباہی کی یاد میں منعقد ہوتا ہے۔ یہودی تاریخ میں یہ رنج والم کا دن رہا ہے۔ اس دن وہ رو رو کر خدا سے دعائیں کرتے تھے اور چوبیس گھنٹے کا روزہ رکھتے تھے۔ راسخ العقیدہ یہودی تین ہفتے پہلے ہی اس دن کو یاد کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ شادیوں میں شرکت نہیں کی جاتی، بال نہیں تراشے جاتے، آرام دہ لباس نہیں پہنا جاتا اور اچھے کھانے نہیں کھائے جاتے۔ لوگ زمین پر بیٹھنا پسند کرتے ہیں اور روشنیاں کم کر دی جاتی ہیں۔ اس دن کی بنیادی عبادت کتاب نوحہ کی تلاوت ہوتی ہے تاکہ دل میں رقت پیدا ہو۔

ہنوخا

روشنیوں کی تقریب کہلایا جانے والا یہ آٹھ روزہ تہوار کسلیو کی 25 تاریخ کو شروع ہوتا

ہے۔ کرسمس کے نزدیک ہونے کی وجہ سے عصر حاضر میں یہ تہوار زیادہ اہمیت اختیار کر گیا ہے۔ یہ تہوار مکابیوں کی فتح یروشلم کی خوشی میں منایا جاتا ہے جس کا بیان تفصیلاً دوسرے باب میں گزر چکا ہے۔ اس تہوار کی نسبت سے ایک روایت مشہور ہے کہ جب مکابیوں نے یروشلم پر دوبارہ قبضہ کیا تو وہاں شمعیں روشن کرنے کے لیے تیل کا صرف ایک کنستر تھا۔ یہ کنستر ایک رات میں ختم ہونا تھا لیکن اسی تیل سے آٹھ دن تک شمعیں روشن رہیں۔ اسی یاد میں یہودی روشنیاں جلاتے ہیں۔ ایک دوسرے کو تحائف دینا، موسیقی سننا اور کھیل کھیلنا اس دن کی یادگار ہیں۔

پیوریم

ادار ثانی کی 14 تاریخ کو منایا جانے والا یہ تہوار ایستر اور مردکائی کی یہودیوں کے لیے کی جانی والی صلہ رحمی کی یاد میں منایا جاتا ہے۔ عبرانی بائیبل میں کتابِ ایستر میں اس قصے کو تفصیلاً بتایا گیا ہے جس کہ مطابق اخسویرس (465-518 ق۔م) جب فارس کا بادشاہ تھا تو اس نے ایک یہودی عورت ایستر سے شادی کی۔ ایستر مردکائی کے ہاں پلی بڑھی تھی۔ اخسویرس کا ایک وزیر، ہامان یہودیوں کا دشمن بن گیا اور اس خیال میں تھا کہ ریاست میں موجود تمام یہودیوں کو قتل کر دیا جائے۔ مردکائی کے ہمت دلانے پر ایستر نے بادشاہ سے التجا کی کہ یہودیوں کی جان بخشی کی جائے۔ بادشاہ نے ایستر کی درخواست منظور کی جس سے یہودیوں کو امن نصیب ہوا۔ ہامان کو پھانسی دے کر مار ڈالا گیا۔ راسخ العقیدہ یہودی اس دن روزہ رکھتے ہیں اور کتاب ایستر کی تلاوت کرتے ہیں۔ یہ عجب انداز کا تہوار ہے جس میں تلاوت کے دوران جب ہامان کا نام آتا ہے تو لوگ نفرت کا اظہار کرتے ہوئے لعنت ملامت کرتے ہیں اور مردکائی کے نام پر نعرے لگاتے ہیں۔ اس دن یہودیوں کو اس قدر مدہوش ہو جانے کی اجازت ہے کہ وہ مردکائی اور ہامان کے نام میں فرق نہ کر سکیں۔ اسے خوشی کا تہوار بھی کہا جاتا ہے۔ بچے مختلف رنگ برنگے لباسوں میں ہوتے ہیں اور کوشش ہوتی ہے کہ غریب لوگوں کی مدد کی جائے تاکہ وہ بھی اس تہوار کا حصہ بن سکیں۔

اسرائیلی تہوار

ایار کی 5 تاریخ کو جدید اسرائیل کا جشنِ آزادی منایا جاتا ہے جسے "یوم ہعتسماؤوت" یعنی "آزادی کا دن" کہا جاتا ہے۔ اسے آزادی کا دن کہے جانے کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ جس دن اسرائیل کی ریاست یہودیوں کو دی گئی اسی دن عربوں نے ان کے ساتھ جنگ کا اعلان کر دیا جس

وجہ سے یہودیوں کو جنگ آزادی لڑنا پڑی۔ چنانچہ یہ آزادی کا دن کہلایا۔اسی طرح اسرائیل میں یوم ہعتسماؤوت سے ایک دن پہلے عرب اسرائیل جنگوں میں کام آنے والے یہودی فوجیوں و شہریوں کی یاد میں "یوم ذکر" بھی منایا جاتا ہے جس میں ایک منٹ کی خاموشی اختیار کی جاتی ہے بیشتر اسرائیلی تہواروں میں کسی اضافی عبادت یا دعا کا انعقاد نہیں کیا جاتا۔

ابتدا میں یروشلم پر یہودی قبضہ مکمل نہ ہو سکا تھا تو 1967 میں اسرائیل نے عربوں کے علاقے پر قبضہ کے لیے چھ روزہ جنگ کی۔اس جنگ میں انہوں نے یروشلم سمیت کئی علاقوں پر مکمل قبضہ حاصل کر لیا۔ یہ قبضہ بین الاقوامی قانون کے مطابق درست نہیں تاہم اسرائیلی اپنی سالمیت اور تاریخی لگاؤ کی وجہ سے ان علاقوں کو اپنے قبضے میں رکھنا چاہتے ہیں۔ چونکہ یہودی کیلنڈر کے مطابق ایار کی 28 تاریخ کو یہ فتح مکمل ہوئی تھی اس لیے اس دن کو "یوم یروشلم" کے طور پر منایا جاتا ہے۔ بعض یہودی مصنفین یہ دعوی بھی کرتے ہیں کہ یروشلم کو مختلف مذاہب کی مقدس جگہ ہونے کی وجہ سے ایک آزاد شہر کے طور پر کھلا رکھنا اسرائیلیوں کا خواب تھا جو عربوں کی وجہ سے شرمندہ تعبیر نہ ہو سکا تھا۔ اس فتح سے یہ خواب بھی پورا ہوا اور اب ماضی کے 19 سالہ عرب قبضے کے برعکس متحدہ یروشلم کے دروازے تمام مذاہب کے پیروکاروں کو کھلے ملنے لگے ہیں۔[40] یہ بات اس حد تک درست ہے کہ مسلمان یروشلم میں واقع مسجد الاقصی میں عبادت کے لیے آ سکتے ہیں۔ البتہ یہاں پرسکون عبادت کرنا کٹھن ہے۔اسرائیلی پولیس اکثر اس مقدس مقام پر آنے والے زائرین کو تشدد کا نشانہ بناتی رہتی ہے۔ لہذا یہ سمجھنا بعید از قیاس ہے کہ یہودیوں کے اس علاقے کو اپنے قبضے میں لینے سے یہاں امن قائم ہو گیا ہے۔

جن دنوں یہ کتاب لکھی جارہی تھی ان دنوں بھی اسرائیلی پولیس نے زائرین کو رمضان المبارک کے آخری عشرے کی عبادات کے دوران زدوکوب کیا جس میں ابتدائی اطلاعات کے مطابق 200 سے زائد مسلمان زخمی ہوئے۔[41] بعد ازاں تشدد کے واقعات میں اضافہ ہوا اور یہ تعداد ہزاروں تک پہنچ گئی۔ چونکہ یروشلم اور خصوصاً مسجد الاقصی کے اندر بہت سے غیر ملکی صحافی بھی موجود تھے اس لیے ایسی سینکڑوں وڈیوز منظر عام پر آئیں جن میں اسرائیلی سیکورٹی فورسز کو مسجد الاقصی کے دروازے توڑتے، مقدس مقامات کی بے حرمتی کرتے، اور اسلحے کے زور پر مسلمانوں پر تشدد کرتے دیکھا جا سکتا ہے۔اس کے جواب میں مسلمان، پولیس اہلکاروں پر

بو تلوں اور پتھروں سے حملہ کرتے نظر آتے ہیں۔ان حملوں سے 12 کے قریب اسرائیلی اہلکار زخمی ہوئے۔ بعدازاں اسرائیلیوں نے اس عمارت کو تباہ کر دیا جہاں مختلف صحافتی نمائندوں کے دفاتر تھے۔ یوم یروشلم کا تہوار بھی انہیں دنوں منایا جانا تھا۔ اسرائیلی حکومت نے بنیاد پرست یہودیوں کو مسلم اکثریت کے علاقوں میں اس تہوار کو منانے کی اجازت دی جس سے معاملات بگڑتے چلے گئے۔ فلسطینی عسکریت پسند تنظیم حماس کی جانب سے اسرائیلی علاقوں میں 1000 راکٹ داغے گئے جن میں 19 کے قریب اسرائیلی شہری زخمی ہوئے اور دس کے قریب ہلاکتیں ہوئیں جن میں ایک بچہ بھی شامل تھا۔ اس کے جواب میں اسرائیلی سیکورٹی فورسز نے غزہ میں بمباری کر کے 150 سے زائد فلسطینیوں کو شہید اور ہزاروں کو زخمی کر دیا۔ دنیا بھر میں اسرائیل کے خلاف فلسطینیوں کے حامیوں نے مظاہرے کیے۔ مظاہرین کا خیال تھا کہ اسرائیلی فلسطینیوں کی منظم نسل کشی کر رہے ہیں۔ ان پر تشدد واقعات پر جہاں دنیا بھر کے مسلم ممالک میں غم و غصہ کی لہر پھیلی وہیں بین الاقوامی برداری نے حماس کی مذمت کرتے ہوئے دونوں فریقین پر زور دیا کہ وہ معاملات کا پرامن حل تجویز کریں۔

دیگر یہودی تہوار

مندرجہ بالا تہواروں کے علاوہ یہودی کئی دیگر تہوار ہیں جن کا تعارف درج ذیل ہے:

1. روش خودیش نئے چاند کا تہوار ہے جو ہر ماہ منایا جاتا ہے۔
2. یوم ہشواہ، نسان کی 27 تاریخ کو مرگ انبوہ کے دوران مرنے والوں کی یاد میں منایا جاتا ہے۔
3. لاگ بعومر/لاگ باومر، ایار کی 18 تاریخ کو منایا جانے والا ایک مذہبی تہوار ہے۔ ہر سال لاکھوں راسخ العقیدہ یہودی اس تہوار کو مناتے ہیں۔ جن دنوں یہ کتاب لکھی جارہی تھی ان دنوں اسرائیل میں اس تہوار کی تقریب جاری تھی جس میں بھگدڑ مچنے کی وجہ سے 45 یہودیوں کی ہلاکت ہوئی۔[42]
4. توبآو، آو کی 15 تاریخ کو منایا جاتا ہے جسے محبت کا تہوار بھی کہا جاتا ہے۔ یہ یہودی کنواریوں کا دن تھا جو پورے چاند کی رات منایا جاتا تھا۔ اس دن کنواریاں سفید لباس میں رقص کرتیں اور اسرائیلیوں کو "ایک ہونے کی" اجازت ہوتی۔[43] عصرِ حاضر کے اسرائیل میں یہ تہوار ویلنٹائن کے دن کی طرح منایا جانے لگا ہے تاہم اس کی کوئی سرکاری حیثیت نہیں ہے۔

5. تیوت کی دسویں کا تہوار جو اہلِ بابل کے یروشلم پر حملے کی یاد میں منایا جاتا ہے۔ راسخ العقیدہ یہودی اس دن صبح سے شام تک کا روزہ رکھتے ہیں۔

6. شیوت کی پندرھویں کا تہوار جو درختوں کے نئے سال کے طور پر منایا جاتا ہے۔ اس دن پھلوں پر مبنی ایک خاص کھانا ہوتا ہے۔ یہودی اس دن شجر کاری کی مہم بھی ترتیب دیتے ہیں۔

مشقی سوالات

مختصر سوالات

1. مشنا زندگی کے بارے کیا کہتی ہے؟
2. یہودی ثقافت کا بیان کیوں مشکل ہے؟
3. بریت میلا کسے کہتے ہیں؟
4. موہیل کسے کہتے ہیں؟
5. سندک کسے کہتے ہیں؟
6. نشستِ ایلیاہؑ سے کیا مراد ہے؟
7. پہلوٹھا کسے کہتے ہیں؟
8. تقریب کفارہ کیا ہے؟
9. بار متسواہ کسے کہتے ہیں؟
10. بات متسواہ کسے کہتے ہیں؟
11. تالیت کسے کہتے ہیں؟
12. اوفروف کسے کہتے ہیں؟
13. آلیہ کسے کہتے ہیں؟
14. کدوشین کسے کہتے ہیں؟
15. کتوبا کیا ہے؟
16. خوبا کسے کہتے ہیں؟
17. خیورہ کدیشا کسے کہتے ہیں؟
18. یہودی کفن کیسے دیتے ہیں؟
19. یہودی نوحہ گر کسے کہتے ہیں؟
20. شیوآ کسے کہتے ہیں؟
21. قدیش کسے کہتے ہیں؟
22. نیرَ نیشَما کسے کہتے ہیں؟
23. یوم طوو کسے کہتے ہیں؟
24. یہودی کیلنڈر میں کتنے مہینے ہیں؟
25. یہودی کیلنڈر میں سال کتنے دن کا ہے؟
26. شمسی و قمری کیلنڈر میں کتنا فرق ہے؟
27. یہودی اپنے کیلنڈر کو شمسی کیلنڈر کے مطابق کس طرح ڈھالتے ہیں؟
28. یہودی دو دو دن تہوار کیوں مناتے تھے؟
29. یہودی لیپ کا سال کتنے دن کا ہے؟
30. زیارتوں کے تہوار کون سے ہیں؟
31. سبت سے کیا مراد ہے؟
32. ابن میمون سبت کا کیا مقصد بتاتا ہے؟
33. روش ہشانہ سے کیا مراد ہے؟
34. نورائم سے کیا مراد ہے؟

35. یہودی نئے سال کون کون سے ہیں؟
36. یوم کپور سے کیا مراد ہے؟
37. سبت کا سبت کسے کہتے ہیں؟
38. سکوت سے کیا مراد ہے؟
39. شمینی اتزرت سے کیا مراد ہے؟
40. سیمحاظ توراۃ کسے کہتے ہیں؟
41. پیشاخ سے کیا مراد ہے؟
42. مصا کسے کہتے ہیں؟
43. حمض کسے کہتے ہیں؟
44. سیدر کسے کہتے ہیں؟
45. سیدر کی پلیٹ میں کیا ہوتا ہے؟
46. شووس سے کیا مراد ہے؟
47. عبوری دریا سے کیا مراد ہے؟
48. روت کون تھیں؟
49. شووس میں دودھ کا کیا کردار ہے؟
50. تیشا باؤ سے کیا مراد ہے؟
51. ہنوخا سے کیا مراد ہے؟
52. پیوریم سے کیا مراد ہے؟
53. یوم ہعتسماؤوت سے کیا مراد ہے؟
54. یوم ذکر سے کیا مراد ہے؟
55. یوم یروشلم سے کیا مراد ہے؟
56. روش خودیش سے کیا مراد ہے؟
57. یوم ہشواہ سے کیا مراد ہے؟
58. توبآو سے کیا مراد ہے؟

تفصیلی سوالات

1. یہودی رسوم ورواج کا تعارف لکھیں۔
2. بار/بات متسواہ پر نوٹ لکھیں۔
3. یہودیت میں ختنہ پر نوٹ لکھیں۔
4. یہودیت میں شادی پر نوٹ لکھیں۔
5. یہودی وفات وماتم پر نوٹ لکھیں۔
6. یہودی کیلنڈر پر نوٹ لکھیں۔
7. سبت پر نوٹ لکھیں۔
8. روش ہشانہ پر نوٹ لکھیں۔
9. یوم کپور پر نوٹ لکھیں۔
10. سکوت پر نوٹ لکھیں۔
11. پیشاخ پر نوٹ لکھیں۔
12. شووس پر نوٹ لکھیں۔

حوالہ جات

[1]Pirkei Avot 5
[2] Yevamot 64b

[3]E. Goldberg Harvey, *Jewish Passages: Cycles of Jewish Life*, 1 ed. (London: University of California Press, 2003), 31.

[4]Atkinson, *Judaism*, 95.

[5] Lavinia Cohn-Sherbok and Dan Cohn-Sherbok, *A Short Introduction to Judaism* (Oxford: Oneworld, 1997), 96-97.

[6]Cohn-Sherbok and Cohn-Sherbok, *A Short History of Judaism*, 95.

[7]Rubin Nissan, *Time and Life Cycle in Talmud and Midrash: Socio-Anthropological Perspectives*, First Edition ed. (Boston: Academic Studies Press, 2008), 51.

[8]پیدائش 2:13

[9]گنتی 16:18

[10]Dosick, *Living Judaism: The Complete Guide to Jewish Belief, Tradition, and Practice*, 293.

[11] Cohn-Sherbok and Cohn-Sherbok, *A Short Introduction to Judaism*, 74.

[12]پیدائش 2:2

[13] Joseph Kalir, *Introduction to Judaism* (Washington, D.C: University Press of America, 1980), 7.

[14]Moses Maimonides, *The Guide for the Perplexed*, trans. Michael Friedländer (Skokie: Varda Books, 1904), 315.

[15]Shabbat, 119b

[16]پیدائش 3:1

[17]Dosick, *Living Judaism: The Complete Guide to Jewish Belief, Tradition, and Practice*, 128.

[18]B. Yevamot 62b

[19]Dosick, *Living Judaism: The Complete Guide to Jewish Belief, Tradition, and Practice*, 298.

[20]پیدائش 7:2

[21]Atkinson, *Judaism*, 77.

[22]Dosick, *Living Judaism: The Complete Guide to Jewish Belief, Tradition, and Practice*, 307.

[23]Ibid., 119.

[24]پیدائش 5:1

[25]Kalir, *Introduction to Judaism*, 3.

[26]Atkinson, *Judaism*, 92.

[27]Ibid., 94.

[28]Dosick, *Living Judaism: The Complete Guide to Jewish Belief, Tradition, and Practice*, 133.

[29]گنتی 7:29

[30]احبار 23

[31] Cohn-Sherbok and Cohn-Sherbok, *A Short Introduction to Judaism*, 88.

[32]احبار 40:23

[33]احبار 36:23

[34]Dosick, *Living Judaism: The Complete Guide to Jewish Belief, Tradition, and Practice*, 150.

[35]Ibid., 166.

[36]Kalir, *Introduction to Judaism*, 25.

[37]استثنا 10-9:16

[38]روت 1: 16

[39]Dosick, *Living Judaism: The Complete Guide to Jewish Belief, Tradition, and Practice*, 179.

[40]Ibid., 196.

[41] https: //www.bbc.com/urdu/world-57035487, accessed on 5-9-2021.

[42] https: //www.haaretz.com/israel-news/dozens-injured-after-grandstand-collapse-in-northern-israel-1.9760719, accessed on 5-9-2021.

[43]Taanit 30b

ساتواں باب: فرقے

قدیم فرقے

یہودیت میں تاریخ کو بنیادی حیثیت حاصل ہے تاہم جس بے کسی کی زندگی یہودیوں کا مقدر رہی ہے اس سے ان کی تاریخ کا ہر گوشہ متاثر ہوا ہے۔ یہودی فرقوں کی تاریخ کو بھی اس ضمن میں استثنا حاصل نہیں ہے۔ نیز فرقوں کی تقسیم کے بیان کرنے میں بھی یہودی مؤرخین منفرد مزاج کے حامل ہیں، مثلاً پرانے وقتوں میں بارہ یہودی قبائل شمالی اور جنوبی ریاستوں میں بٹ گئے تھے۔ شمالی ریاست میں بتوں کی عبادت کو رواج دیا جانے لگا تھا۔ اول سلاطین میں اس حوالے سے آیا ہے:

---یُربعام نے سونے کے دو بچھڑے بنوائے۔ بادشاہ یربعام نے لوگوں سے کہا، 'تمہیں یروشلم کو عبادت کے لئے نہیں جانا چاہیے اے اسرائیلیو! یہی سب دیوتا ہیں جو تمہیں مصر سے باہر لائے۔ بادشاہ یُربعام نے ایک سونے کا بچھڑا بیت ایل میں رکھا۔ اس نے دوسرا سونے کا بچھڑا شہر دان میں رکھا لیکن یہ گناہ عظیم تھا۔ بنی اسرائیلیوں نے بیت ایل اور دان کے شہروں میں بچھڑوں کی پرستش کرنے کے لئے سفر کیے لیکن یہ بہت بڑا گناہ تھا۔[1]

باب ہفتم کے اہم نکات

1. یہودی فرقوں کا تعارف وابتدا۔
2. یہودی فرقوں کے عقائد۔
3. یہودی فرقوں کی کتب مقدسہ۔
4. یہودی فرقوں کا تقابل۔
5. یہودی فرقوں کا نظریہ اسرائیل۔
6. یہودی اداروں کا تعارف۔
7. عصر حاضر میں یہودیت کا ارتقا۔

شمالی ریاست نے نہ صرف ایک خدا پر یقین کے عقیدے کو بدل ڈالا اور دو بچھڑوں کو معبود بنالیا۔ ان واقعات کو ایک نئے فرقے کی شروعات کے طور پر دیکھا جا سکتا ہے اس کے برعکس یہودی محققین نہ صرف ان عوامل کو بلکہ موسیٰؑ، داؤدؑ اور سلیمانؑ وغیرہ کے دور میں ہونے والی بت پرستی کو بھی فرقہ واریت میں شمار نہیں کرتے۔ وہ ان واقعات سے صرفِ نظر برتتے ہوئے بابل کی جلاوطنی کے بعد فرقوں کی نشاندہی کرتے ہیں۔ لہٰذا زیر نظر باب میں صرف انہیں فرقوں کا مختصر ذکر کیا گیا ہے جنہیں خود یہودی مصنفین نے بیان کیا ہے۔ ان فرقوں کا بیان یہودیت کے مذہبی ارتقا کا بیان ہے جس سے یہ معلوم کرنے میں آسانی ہوتی ہے کہ یہودیت، ربیائی یہودیت اور عصر حاضر کی یہودیت میں کیا فرق ہے۔

سامری

سامری یعنی "سامریہ کے رہائشی" خود کو اسرائیلی سمجھتے ہوئے اپنا سلسلہ نسب یوسفؑ اور لاوی سے شروع کرتے ہیں۔ ان کے بنیادی عقائد میں توحید، ختنہ، سبت کی پیروی اور زیارتوں کے تہوار منانا شامل ہے۔ صدوقیوں ہی کی طرح یہ لوگ بھی مرنے کے بعد دوبارہ جی اٹھنے کے عقیدے کے قائل نہیں۔ یہودیوں اور سامریوں کے درمیان زیادہ تر عداوت ہی نے رواج پایا اور دونوں گروہ ایک دوسرے کو "سچا اسرائیلی" ماننے میں تامل برتتے رہے۔[2] عبرانی بائیبل نے انہیں غیر یہودی قرار نہیں دیا۔ البتہ ربی انہیں نہ صرف بنی اسرائیل میں شمار کرنے سے گریزاں ہیں بلکہ ان کو بت پرست ٹھہراتے ہوئے بطور نو یہودی بھی تسلیم نہیں کرتے۔[3] زمانہ قدیم میں ان لوگوں کی خاصی بڑی آبادیاں موجود تھیں جو بعد میں ختم ہوتی چلی گئیں لیکن یہ مکمل طور پر ناپید نہیں ہوئے۔ مشہور برطانوی خبر رساں ایجنسی، بی بی سی کے مطابق 2018 میں 800 سے زائد سامری تل ابیب کے قریب آباد تھے۔[4]

راسخ العقیدہ یہودی اس گروہ کی تاریخ کو بابل کی جلاوطنی کے زمانے سے جوڑتے ہیں۔ اس حوالے سے دوم سلاطین میں روایت ہے کہ سامری غیر ملکی تھے جنہیں اشوریوں نے سامریہ کے علاقے میں بسا دیا تھا۔ سامریہ میں بسنے والے اسرائیلی ان دنوں بابل میں جلاوطنی کی زندگی گزار رہے تھے۔ یہ لوگ یہاں مختلف آفات کا شکار ہونے کی وجہ سے پریشان حال تھے۔ ایک اسرائیلی کاہن نے انہیں بتایا کہ یہاں صرف وہی قوم خوش و خرم رہ سکتی ہے جو اسرائیلی شریعت پر عمل کرے۔ سامریوں نے اس کاہن کی تجویز پر عمل کرتے ہوئے توریت کی پیروی شروع کر دی "لیکن انہوں نے اپنے خداؤں کی بھی خدمت کی۔ ان لوگوں نے اپنے خداؤں کی ویسی ہی خدمت کی جیسا کہ انہوں نے اپنے ملک میں کی تھی جہاں سے وہ لائے گئے تھے۔"[5]

کتابِ عزرا بھی سامری مخالفت پر زور دیتی ہے۔ اس میں ذکر ہے کہ جب ہیکل کی تعمیرِ نو کا کام شروع ہوا تو سامریوں نے کہا کہ چونکہ وہ بھی خداوند ہی کی عبادت کرتے ہیں اس لیے انہیں بھی ہیکل کی تعمیر میں شامل کیا جائے لیکن عزرا نے ان کی پیشکش ٹھکرا دی جس پر غصے میں آ کر انہوں نے ہیکل کی تعمیر میں روڑے اٹکانے شروع کر دیے۔[6]

سامری درج بالا روایت کو جھٹلاتے ہیں اور خود کو شمالی ریاست کے بچے کھچے قبائل کے

طور پر بیان کرتے ہیں جو شروع سے ہی سامریہ میں رہائش پذیر تھے اور اشوریوں کی تباہی سے بچ نکلے تھے۔ یہ لوگ صرف توریت کی پانچ کتابوں پر یقین رکھتے ہیں۔ انہوں نے مکابیوں کے دور سے ہی توریت کا الگ نسخہ مرتب کر لیا تھا جو قدیم عبرانی زبان میں لکھا گیا تھا۔ اس نسخے کے مطابق یہ احکام عشرہ کا حصہ ہے کہ تمام قربانیاں جبل جرزیم پر ادا کرنی ہیں۔ یہ لوگ جبل جرزیم ہی کو ہیکل کی تعمیر کی جگہ بھی سمجھتے ہیں کیونکہ ان کے خیال میں ابراہیمؑ اسی جگہ اسحاقؑ کو قربانی کے لیے لائے تھے۔ وہ یہ بھی سمجھتے ہیں کہ یشوعؑ نے اسرائیلیوں کو سکم کے مقام پر اکٹھا کر کے عہد خداوندی کی تجدید کی لیکن بعد میں کاہن اعظم عیلی نے دیگر لوگوں کے ساتھ مل کر عبادت گاہ کو سکم سے سیلا منتقل کر دیا جہاں سے یہ عہد داؤدی میں یروشلم منتقل ہو گئی۔[7]

حسیدی

حسیدی یعنی "نیک" بھی یہودیت کے قدیم گروہوں میں شمار کیے جاتے ہیں جو مکابیوں کے دور میں سامنے آئے اور ان کے شانہ بشانہ لڑ کر ہیکل کو یونانیوں کے قبضے سے آزاد کروایا۔ اول مکابیین کے مطابق حسیدی اسرائیل کے شہ زور تھے جنہوں نے شریعت کے لیے خود کو پیش کر دیا۔[8] بحر میت کے مخطوطات میں بھی ان کا ذکر موجود ہے۔ یہودیت میں حسیدی ایک روحانی جماعت بھی ہے تاہم اس جماعت کا اس قدیم یہودی گروہ سے کوئی تعلق نہیں۔ جس قوت سے مکابیوں کی حمایت میں یہ گروہ سامنے آیا اس سے پتہ چلتا ہے کہ اس دور میں ان کو مستحکم ہوئے کچھ عرصہ بیت چکا تھا۔ اس دور کے حسیدی شریعت پر یقین رکھنے والے تھے اور اس ضمن میں کوئی بھی نئی تشریح قبول کرنے کے روادار نہیں تھے۔ اس لیے جب مکابیوں نے سبت کے دن لڑنا جائز کیا تو ان لوگوں نے اس وقت بھی سبت کی پاسداری جاری رکھی اور جنگی معاملات خدا پر چھوڑ دیے۔ اسی لیے ربی انہیں "عمل کے بندے" بھی کہا کرتے تھے۔[9] بعض مصنفین نے یہ بھی بیان کیا ہے کہ فریسی اور اسینی بھی حسیدیوں ہی کی شاخیں ہیں۔ البتہ اس دعوے کے ثبوت تقریباً ناپید ہیں کیونکہ حسیدیوں کے متعلق معلومات بہت کم یاب ہیں۔

فریسی

فریسی یعنی "علیحدگی پسند" یہودیوں کا سب سے بڑا گروہ تھا جو شریعت کے عالموں اور توریت نویسوں پر مبنی تھا۔ ہیکل کی تعمیر نو سے اس کی دوسری تباہی تک کے عرصے میں مختلف

یہودی گروہ سامنے آتے رہے۔ بابلی اور فارسی دور نے یہودیوں میں نئی مذہبی تبدیلیاں پیدا کر دی تھیں جن کے نتیجے میں مختلف یہودی گروہوں نے مختلف ردعمل کا اظہار کیا۔ رفتہ رفتہ اسی اظہار نے فرقوں کی شکل اختیار کر لی۔ فریسی بھی اسی دور میں سامنے آنے لگے تھے تاہم ان کی الگ پہچان دوسری صدی عیسوی کے وسط میں قائم ہوئی۔[10] ان کو ایک مذہبی گروہ کے علاوہ سیاسی جماعت بھی سمجھا جاسکتا ہے کیونکہ صدوقیوں کو بیان کیے بغیر انہیں بیان کرنا مشکل ہے۔ اس معاملے کو ایسے سمجھا جاسکتا ہے کہ ایک فریسی اس وقت فریسی کہلاتا تھا جب اسے صدوقی کے ردعمل میں بیان کیا جائے اور یہی معاملہ صدوقیوں کے ساتھ تھا۔ اکثر معاملات جیسے صنہادرین کے اراکین کے چناؤ، ہیلینت کی قبولیت اور ہیکل کے معاملات وغیرہ میں دونوں گروہوں کو ایک دوسرے کی مخالفت کرتے بھی دیکھا جاسکتا تھا۔

بیشتر مصنفین ابتدائی یہودی فرقوں کی معلومات کے لیے فلاویس یوسیفس (37-100) جو ایک مشہور یہودی مؤرخ گزرا ہے کی آرا کو فوقیت دیتے ہیں۔ یوسفیس کہتا ہے:

> فریسی جو کہ شریعت کے سب سے مستند شارح سمجھے جاتے ہیں اور قائدین کے گروہ کی مسند پر براجمان ہیں، ہر چیز کو خدا اور قسمت سے منسوب کرتے ہیں؛ وہ یہ یقین رکھتے ہیں کہ انسان کے اچھا یا اس کے برعکس عمل کرنے کا اختیار اس کے پاس ہے لیکن اس کے ہر عمل میں قسمت ساتھ چلتی ہے۔ ہر روح، وہ سمجھتے ہیں کہ دائمی ہے لیکن اچھوں کی روح ہی دوسرے جسم تک پہنچتی ہے جبکہ بروں کی روح ابدی عذاب میں مبتلا ہوتی ہے۔[11]

یوسفیس مزید بتاتا ہے کہ فریسی اپنے بڑوں کی تمام آرا سے متفق نہیں تھے لیکن وہ ان کی عزت کیا کرتے تھے۔ اپنی سادگی اور علم دوستی کی بدولت یہ لوگ عام یہودیوں میں بہت مقبول تھے۔ یہ زیادہ تر درمیانے اور نچلے طبقے کے کسان اور دستکار تھے جو مختلف دیہاتوں اور قصبوں سے تعلق رکھتے تھے۔ اپنے دورِ عروج میں یہ ان لوگوں میں بھی اپنی مذہبی تشریحات کو رواج دینے میں کامیاب رہے جو ان کی برتری کے قائل نہیں تھے۔

یہود ہر قانوس کے دور میں ان کو اتنی اہمیت حاصل تھی کہ یہ حکمرانوں پر تنقید تک کر سکتے تھے۔ ان کی عوامی مقبولیت کی وجہ سے اس تنقید کا اثر حکمران بھی محسوس کرتے تھے اسی لیے سکندر جانوس نے آخری وقت میں اپنی بیوی سکندریہ کو مشورہ دیا کہ وہ فریسیوں سے اتحاد

قائم کرے۔ جب رومی دور شروع ہوا تو صدوقیوں کے برعکس فریسیوں نے پومپے کا ساتھ دیا اور یروشلم کے دروازے اس کے لیے کھول دیے۔ وہ غیر ملکیوں کی حکومت کو اس وقت تک برا نہیں سمجھتے تھے جب تک کہ ان کے مذہبی معاملات میں مداخلت نہ ہونے لگے۔ ان کا خیال تھا چونکہ صدوقی ہیکل کی عبادات کو درست طور پر سرانجام نہیں دے رہے اس لیے رومیوں کا تسلط ایک خدائی امر ہے۔ شروع میں انہیں سیاست سے خاص غرض نہیں تھی لیکن جیسے جیسے رومی دباؤ بڑھتا گیا ان میں بھی علیحدہ یہودی ریاست کے قیام کا مطالبہ زور پکڑنے لگا۔[12]

کاہنِ اعظم اور اس کے نمائندوں کے کاموں کو یہ رسمی اعمال سمجھتے تھے۔ خود ان کی جائے منصب سیناگاگ تھیں جو پہلی صدی عیسوی تک تقریباً ہر بڑے چھوٹے گاؤں میں بن چکی تھیں۔ سیناگاگ میں یہ عام لوگوں کو وعظ کہتے اور ان کو توریت کی تعلیم دیتے۔ مذہبی اعتبار سے یہ ربیائی یہودیت کے بڑے کہلائے جاسکتے ہیں کیونکہ یہ لکھی ہوئی توریت کے علاوہ زبانی قانون پر بھی یقین رکھتے تھے۔ اس کے علاوہ قسمت، حیات بعد الموت، قیامت، مسیح موعود اور فرشتوں پر اعتقاد بھی فریسیوں میں عام تھا۔ انہوں نے زبانی قانون کی ترقی کے لیے دلجمعی سے کام کیا کیونکہ وہ خود کو موسیٰؑ کے سچے جانشین سمجھتے تھے۔ انہیں اس بات کا یقین تھا کہ کوئی بھی جگہ خدا کے وجود سے خالی نہیں ہے۔ کسی جگہ بھی اسے پکارا جاسکتا ہے۔ اسی لیے یہ قربانی کے علاوہ دعا اور توریت کے مطالعہ کو بھی رسمی عبادت کا درجہ دیتے تھے۔

صدوقی

ہیکل کے مذہبی معاملات کے ذمہ دار ٹھہرائے جانے کی وجہ سے صدوقی اگرچہ عہد داؤدی سے موجود تھے تاہم بطور فرقہ ان کی شناخت بھی فریسیوں ہی کے زمانے میں سامنے آئی۔ کہا جاتا ہے کہ صدوقی لفظ کی شروعات شاید "ضدوق" سے ہوئی جو داؤدؑ کے زمانہ سے کاہنِ اعظم تھے اور ہیکل کے امور کے ذمہ دار تھے۔ صدوقیوں کی اپنی لکھی ہوئی کوئی تحریر ہم تک نہیں پہنچ سکی اس لیے زیادہ تر انہیں فریسیوں کے مخالف فرقے کے طور پر بیان کیا جاتا ہے۔ یہ ایک لحاظ سے رجعت پسند یہودیوں کا گروہ تھا جو ہیکل کی قربانیوں اور عبادات میں کسی قسم کی تبدیلی کے روادار نہیں تھے۔ چونکہ ان میں سے بیشتر نسلی کاہن یا ان کے رشتہ دار تھے لہذا جو بھی حکومت آتی یہ اس کی حمایت کی کوشش کرتے تاکہ ہیکل میں ان کا اثر و رسوخ بنا رہے۔ اس

وجہ سے فریسیوں کے برعکس انہیں دنیاوی لوگ سمجھا جاتا تھا۔ یہ زبانی قانون کو نہیں مانتے تھے اور توریت کی عقلی تشریحات کو رواج دیتے رہے۔ اسی لیے ہیلینت نے انہیں زیادہ متاثر کیا۔ عقل پسند ہونے کی وجہ سے ان کے ہاں حیات بعد الموت، قیامت اور فرشتوں جیسے عقائد نے بھی رواج نہیں پایا۔ سامریوں ہی کی طرح یہ لوگ بھی صرف توریت کی پانچ کتابوں ہی پر یقین رکھتے تھے۔ صدوقیوں کو اشرافیہ میں پذیرائی حاصل تھی جبکہ عام عوام میں فریسی مقبول ہوئے۔ یہ لوگ قسمت پر یقین نہیں رکھتے تھے اور سمجھتے تھے کہ انسان کو اچھے اور برے پر اختیار حاصل ہے۔ یہ اس کی مرضی ہے کہ دونوں میں سے جسے بھی منتخب کر لے۔ یوسیفیس کے بیان کے متعلق بعض مصنفین نے شک کا اظہار بھی کیا ہے[13] کیونکہ یہ مانا جاتا ہے کہ وہ خود فریسی تھا لہذا ہو سکتا ہے کہ دیگر فرقوں کے متعلق اس کی معلومات یک طرفہ ہوں۔

اونچے طبقوں تک ان کی رسائی ہونے کی وجہ سے یہ لوگ بیشتر مذہبی معاملات کے ذمہ دار تھے۔ بعض مصنفین کے مطابق صنہادرین میں ابو الدین کا عہدہ بھی زیادہ تر انہیں ملتا رہا۔[14] اس کے برعکس فریسیوں کو تعداد کی وجہ سے ان پر فوقیت حاصل رہی ہے۔ عصر حاضر کا کوئی بھی یہودی گروہ اپنی نسبت صدوقیوں کی طرف نہیں جوڑتا۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ صدوقیوں کا اثر ورسوخ ہیکل سے منسلک تھا۔ جب 70 عیسوی میں ہیکل کو رومیوں نے تباہ کر دیا تو اس کے ساتھ ہی کاہنوں کے مذہبی کردار کا بھی خاتمہ ہو گیا۔ فریسیوں کی طرح انہوں نے نہ ہی سیناگاگ سے تعلق جوڑا اور نہ ہی عوامی مقبولیت حاصل کر سکے جس کی وجہ سے رفتہ رفتہ اس فرقے کے نام لیوا ختم ہوتے چلے گئے۔ بحر میت کے مخطوطات نے ان کے حوالے سے نئے تضادات کو جنم دیا ہے کیونکہ ان مخطوطات سے لگتا ہے کہ صدوقی بھی قمران کے رہائشی تھے یا کم از کم قمرانیوں کے اجداد کے ان کے سے ساتھ مراسم تھے۔ ان مخطوطات میں بیان کردہ بعض مذہبی رسمیں ربیائی ادب میں موجود صدوقیوں کی عبادات سے مطابقت رکھتی ہیں۔[15]

اسینی

اسینی راہبوں پر مبنی ایک یہودی گروہ تھا جسے بعض مصنفین صدوقیوں ہی کی ایک شاخ کے طور پر بیان کرتے ہیں۔ تاہم اپنے مذہبی معاملات میں یہ صدوقیوں سے مختلف تھے۔ یہ تعداد میں بھی فریسیوں اور صدوقیوں سے کم تھے۔ انکے متعلق معلومات نہ صرف یوسیفیس بلکہ فیلو

اور ایک رومی مورخ پلینیوس (23-79) کی تصنیفات سے بھی ملتی ہیں۔ فیلو کے مطابق فلسطین اور شام میں 4000 سے زائد اسینی رہائش پذیر تھے۔ بحر میت کے مخطوطات کی دریافت سے زیادہ تر محققین یہ سمجھنے پر مجبور ہو گئے ہیں کہ قمران کے رہائشی اور ان مخطوطات کے مصنفین اسینی ہی تھے۔ اگرچہ ان مخطوطات میں کہیں بھی اسینیوں کا نام نہیں لیا گیا لیکن ان میں درج شدہ معلومات اور یوسفیس، پلینیوس اور فیلو کی آرا میں بہت مماثلت ہے۔ ان کی ابتدا کے متعلق کہا جاتا ہے کہ یہ گروہ ہیر وڈ کے دور میں موجود تھا اور مختلف علاقوں میں پھیلا ہوا تھا۔

دیگر فرقوں کی طرح اسینی بھی یہی سمجھتے تھے کہ صرف وہی موسیٰؑ کے جانشین ہیں۔ مذہبی معاملات میں یہ لوگ خصوصی طور پر صدوقیوں اور کاہنوں کے طرزِ عمل کی مخالفت کیا کرتے تھے۔[16] ان کے حلقوں میں عورتیں بہت کم پائی جاتی تھیں۔ بعض مصنفین کے مطابق یوسیفس نے اسینیوں کے صرف ایک ایسے گروہ کی نشاندہی کی ہے جس میں عورتیں بھی شامل تھیں[17] جبکہ پلینیوس کے مطابق ان میں عورتوں کا ہونا ثابت نہیں ہوتا۔[18] یوسیفس خیال کرتا ہے ان کے گروہ کے کچھ لوگ تین سالہ تربیت کے بعد شادی کی اجازت دے دیتے تھے۔ مجموعی طور پر یہ مجرد زندگی گزارنا پسند کرتے اور عام لوگوں کو جلدی اپنے گروہ میں شامل نہیں کرتے تھے۔ ان کی کچھ خاص شرائط تھیں جن پر عمل پیرا ہونے کے بعد لوگ اس گروہ کی رکنیت حاصل کر سکتے تھے، مثلاً ان کے گروہ میں شامل ہونے کے لیے ضروری تھا کہ متعلقہ فرد اپنی تمام جائیداد سے انفرادی ملکیت کا حق اٹھا کر اسے ان کے مشترکہ خزانے میں جمع کروا دے۔[19] زیادہ تر یہ لوگ زراعت اور دستکاری کے شعبوں سے منسلک تھے۔ غلام رکھنے کی بجائے ایک دوسرے کی مدد کرنے کو فوقیت دیتے تھے۔ صدوقیوں کے خلاف ہونے اور الگ تھلگ زندگی گزارنے کے باوجود یہ ہیکل میں قربانیوں کی ادائیگی کو ضروری سمجھتے تھے۔ جانوروں کی قربانی کی ان کے ہاں ممانعت تھی اس لیے یہ ہیکل میں قربانی کے لیے زیادہ تر آٹا اور تیل وغیرہ ہی لے کر جاتے تھے۔

ان کے ہاں مشترکہ کھانے کو خصوصی اہمیت حاصل تھی جس میں اسینیوں کے علاوہ کسی اور گروہ کو شریک نہ کیا جاتا۔ یہ حسب مراتبت کا بھی خصوصی خیال رکھتے۔ بڑوں کے اختیارات پر سوالات کا حق چھوٹوں کو حاصل نہ تھا۔ اگر کوئی ایسا معاملہ ہوتا تو ایسے فرد کو اپنے کھانوں میں

اس وقت تک شامل نہ کرتے جب تک وہ اپنی فرمانبرداری ثابت نہ کر دیتا۔ رسمی طہارت میں یہ فریسیوں پر بھی سبقت لے گئے تھے۔ دن میں دو دو مرتبہ مک وے یعنی مقدس غسل کرنا ضروری سمجھتے۔ اسی طرح کھانے سے پہلے بھی طہارت ان میں لازمی امر تھا۔ مذہبی معاملات میں ان کے ہاں عبادت اور تلاوت نے زیادہ رواج پایا۔ قربانی کی بجائے ذاتی عبادت پر زیادہ توجہ دیتے تھے لیکن ساتھ ساتھ ایسے نئے زمانے کے لیے بھی دعا کرتے تھے جہاں کاہنوں کا بہتر نظام رائج ہوتا کہ عبادات بہتر طور پر ادا ہوتی رہیں۔ یہ حیات ابدی کے قائل ضرور تھے لیکن جسمانی طور پر مردوں کے دوبارہ جی اٹھنے کے عقیدے کو نہیں مانتے تھے۔ یہ سمجھتے تھے کہ دنیا میں جو کچھ ہو رہا ہے اس پر کوئی قابو نہیں پا سکتا۔ قسمت انسان کے معاملات طے کرتی ہے۔ فرشتوں پر یقین رکھتے، خیرات دیتے اور غصے پر قابو رکھنے کو بالخصوص اہمیت دیتے تھے۔ یہ اس بات کو بھی مانتے تھے کہ معاملات میں ثنویت پائی جاتی ہے؛ جیسے برائی کے ساتھ اچھائی، روح کے ساتھ جسم یا دنیا میں روشنی اور اندھیرے کی قوتوں کا موجود اور آپس میں صف آرا ہونا۔

زیلوٹ

زیلوٹ یہودیوں کا ایک متشدد فرقہ تھا جو ہیروڈ کے دور سے سر گرم تھا۔ اس کا بنیادی مقصد رومیوں کے تسلط سے آزادی حاصل کرنا تھا۔ چنانچہ یہ اپنی نوعیت میں مذہبی کم اور سیاسی زیادہ تھا۔ یوسیفس نے انہیں چوتھے گروہ کے طور پر بیان کیا ہے۔ ان کا نعرہ تھا کہ خدا کے سوا کوئی حاکم نہیں۔ ان لوگوں نے تشدد کی راہ اپنائی اور رومیوں کے خلاف دوسروں کو بھی بغاوت پر قائل کیا۔ اس بغاوت کے لیے یہ لوگ ہر قسم کا حربہ اختیار کرنا جائز سمجھتے تھے، مثلاً بعض روایتوں سے پتہ چلتا ہے کہ انہوں نے ایک دفعہ شہر کی رسد گاہ کو اس لیے تباہ کر دیا تاکہ لوگ بھوک سے بے حال ہو کر رومیوں کے خلاف ان کا ساتھ دیں۔ انہیں کا ایک ذیلی گروہ سیکاری بھی تھا جو تشدد کے حوالے سے مشہور ہوا۔ یہ لوگ اپنے لمبے لمبے چوغوں میں سیکار یعنی چھوٹی سی تلوار چھپا لیتے اور لوگوں کی بھیڑ میں شامل ہو جاتے۔ جہاں کہیں انہیں کوئی رومی یا رومیوں کا حامی چاہے وہ یہودی ہی کیوں نہ ہو مل جاتا یہ اس کو قتل کر کے خود رفو چکر ہو جاتے۔[20] سیکاری اغوا برائے تاوان کی وارداتیں بھی کرنے سے نہ چوکتے تھے۔ ان کی مہارت کی پیش نظر کاہنِ اعظم اور رومی حکمران بھی انہیں اپنے مقاصد کے لیے استعمال کرتے رہتے تھے۔

جیساکے دوسرے باب میں بیان ہو چکاہے کہ زیلوٹ کی بغاوتوں نے رومیوں کو مشتعل کر دیا جس کا نتیجہ ہیکل کی تباہی کی صورت میں نکلا جو یہودی تاریخ کا سب سے بڑا المیہ ہے۔ زیلوٹ نے اس تباہی کے بعد بھی اپنی جدوجہد جاری رکھی اور یہودیہ کے ایک صوبہ مسعدہ میں اکٹھے ہو کر رومیوں کے خلاف کاروائیاں کرنے لگے۔ 73عیسوی کے قریب رومیوں نے مسعدہ کا محاصرہ کر لیا۔ جب رومی قلعے کی فصیلیں توڑ کر اندر داخل ہوئے تو دیکھا کہ ان کے ہاتھوں مرنے سے بچنے کے لیے شہر کے باسیوں نے خودکشی کر لی تھی۔[21] اس واقعے کی صداقت کے متعلق شبہات ہو سکتے ہیں تاہم یہودی تاریخ میں یہ واقعہ بہادری کی علامت سمجھا جاتا ہے۔ بعد ازاں بھی زیلوٹ فرقے کے حامی چھوٹے موٹے تشدد کے واقعات میں ملوث پائے جاتے رہے لیکن رومیوں کے لیے یہ کوئی خاص مسائل نہ پیدا کر سکے۔ آخر کار برکوخبابغاوت یعنی تیسری اور آخری بغاوت کے بعد رومیوں نے اس فرقے کا مکمل طور پر خاتمہ کر دیا۔

قدیم یہودی فرقے

سامری	حسیدی
فریسی	صدوقی
اسینی	زیلوٹ
زیلوٹ	تھراپیٹی

تھراپیٹی

تھراپیٹی یعنی "شفابخش" یا "عبادت پسند" یہودیوں کا ایک فلسفی فرقہ تھا جس کے حامی پہلی صدی عیسوی میں زیادہ تر اسکندریہ میں پائے جاتے تھے۔ یہ لوگ اپنا زیادہ تر وقت تلاوت اور غور و فکر میں گزارتے۔ ان کے متعلق معلومات کا ماخذ زیادہ تر فیلو ہے۔ ان کو اسینیوں کا ہی ایک گروہ بھی سمجھا جاتا ہے کیونکہ انہیں کی طرح ان میں بھی کھانے کو خصوصی اہمیت حاصل تھی، مجرد رہنے کو ترجیح دی جاتی، غلام رکھنے کی ممانعت ہوتی، خود کام کرنے کو اچھا سمجھا جاتا اور گروہ میں شامل ہونے کے لیے جائیداد سے دستبرداری کا اعلان بھی کرنا ہوتا لیکن اسینیوں کے برعکس ان کے ہاں مشترکہ جائیداد کا کوئی رواج نہ تھا۔ یہ اپنی جائیداد اپنے خاندان کے کسی فرد یا دوست کے نام کر دینا پسند کرتے تھے۔

اپنی علمی روایت میں یہ لوگ دیگر یہودی گروہوں سے منفرد تھے۔ عام طور پر ایک

دوسرے سے بھی الگ تھلگ رہتے اور کھانوں اور نمازوں کے دوران ہی اکٹھے ہوتے۔ کھانے کی میز پر کتب مقدسہ سے کوئی نقطہ اٹھایا جاتا اور اس کی علامتی وضاحت کرنے کی کوشش کی جاتی۔[22] اسینیوں کے برعکس اس فرقے میں عورتیں بھی شامل تھیں۔ ان کے درمیان بھی بڑے کی بات کو بہت قدرو منزلت حاصل تھی۔ بڑے کا چناؤ اس بات پر ہوتا کہ گروہ میں شمولیت کیے اسے کتنا عرصہ گزر چکا ہے۔ سبت کی عبادت پر خصوصی توجہ دی جاتی اور رہنما بھی کسی بڑے کو ہی مقرر کیا جاتا۔[23]

ان کے عام دنوں کا بیشتر حصہ بھی عبادت میں گزرتا جو سورج طلوع ہونے سے شروع ہو جاتیں اور سورج غروب ہونے تک جاری رہتیں۔ توریت کے مطالعے کو خصوصی اہمیت دی جاتی اور سارا دن غورو فکر کے ذریعے عبارتوں کے علامتی معنی تلاش کیے جاتے۔ علامتی معنی کی تلاش کا ایک خاص علم ان میں رواج پایا جو ان تک ان کے بڑوں کے ذریعے پہنچا۔[24] سادہ کھانے کو ترجیح دی جاتی اور اتنا ہی کھایا جاتا جتنا زندہ رہنے کے لیے ضروری ہوتا۔ ان کے کھانوں میں گوشت اور شراب سے مکمل اجتناب برتا جاتا۔ دن میں صرف ایک کھانا سورج غروب ہونے کے بعد کھایا جاتا۔ روزے کو خصوصی اہمیت دی جاتی اور کبھی کبھی تو تین یا چھ دن لمبا روزہ رکھا جاتا۔ سال گزارنے کے لیے ان کے پاس کپڑوں کے دو جوڑے ہوتے۔ ایک گرمیوں کا اور ایک سردیوں کا۔ عصر حاضر کے بعض مصنفین نے یہ بھی تجویز کیا ہے کہ یہ یہودی نہیں بلکہ بدھ مت کے پیروکار تھے۔ ہو سکتا ہے لفظ تھراپیٹی بدھ مت کے مشہور فرقے تھیراوادا ہی کی کوئی شکل ہو۔

قرائٹ

قرائٹ یعنی "پڑھنے والے" یہودیوں کا ایک ایسا فرقہ ہے جو سامریوں اور صدوقیوں کی طرح صرف لکھی ہوئی توریت پر ہی یقین کرتا ہے۔ ربیائی یہودیت جس کا تفصیلاً ذکر دوسرے اور تیسرے باب میں گزر چکا ہے، میں یہ تصور کیا جاتا ہے کہ موسیٰؑ نے یہودیوں کو زبانی قانون بھی دیا تھا جو سینہ بہ سینہ ان کی نسلوں میں منتقل ہوتا رہا۔ قرائٹ ربیائی یہودیت کے اس فلسفے کو تسلیم نہیں کرتے۔ چونکہ زبانی قانون کا تصور یہودیوں میں دوسری صدی قبل مسیح میں مستحکم ہونا شروع ہوا تھا لہذا بعض مصنفین یہ خیال کرتے ہیں کہ قرائٹ فرقے کی شروعات بھی اسی دور

میں ہو چکی تھی۔ یہ بھی سمجھا جاتا ہے کہ قرائٹ کی شروعات دو عناصر کی مرہون منت ہے جن میں سے ایک شاخ تو راس جالوت میں سے ہے اور دوسری شاخ مسلم دور میں متحرک تھی۔[25] اول الذکر کے لحاظ سے مشہور یہودی عالم عنان ابن داؤد کو قرائٹ فرقے کا بانی سمجھا جاتا ہے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ ابن داؤد کے پیروکاروں اور قرائٹ فرقے کے ماننے والوں کی تعلیمات میں خاصی مماثلت تھی جس نے آٹھویں صدی میں دونوں گروہوں کو متحد کر دیا۔اسی لیے اس کے دور کو قرائٹ کے عروج کا آغاز کہا جاتا ہے۔

دسویں صدی کے مشرق وسطی میں قرائٹ کی کافی آبادیاں تھیں۔ خاص طور پر مصر اور فلسطین میں انہوں نے ربیوں کے مقابلے میں اپنی سیناگاگ تعمیر کر لی تھیں۔ صلیبی جنگوں کے دوران ان میں سے زیادہ تر بازنطینی علاقوں میں چلے گئے اور کچھ اس سے آگے پالینڈ اور لیتھونیا میں رہائش پذیر ہوئے۔ بازنطینی علاقوں میں توبیاس بن موسی کو ان کا امیر سمجھا جاتا تھا جس نے قرائٹ فرقے کی کتب کا عربی سے عبرانی میں ترجمہ کیا۔[26] چونکہ مسلمانوں کے دور میں قرائٹ اچھی خاصی تعداد میں موجود تھے تو انہوں نے ربیائی یہودیت کے خلاف کافی کچھ تحریر کیا جس کے جواب میں ربیوں میں بھی تلمود کے دفاع کی نئی تشریحات نے فروغ پایا۔

قرائٹ کا خیال ہے کہ زندگی گزارنے کے تمام عناصر توریت نے فراہم کر دیے ہیں۔ اس کے معنی پر غور و فکر کر کے کسی بھی دور کے مسائل کا حل تلاش کیا جا سکتا ہے۔ ربیوں کے برعکس انہوں نے توریت کی لفظی تشریح کو رواج دیا، مثلاً کتابِ خروج میں ذکر ہے: "بکری کے بچہ کو اس کی ماں کے دودھ میں نہ ابالو۔"[27] ربیائی یہودیت میں اس سے یہ مراد لی جاتی ہے کہ کسی بھی قسم کے دودھ اور گوشت کو اکٹھا نہیں کرنا چاہیے۔ قرائٹ کے ہاں ربیوں کا نقطہ نظر قابل قبول نہیں۔ وہ دودھ اور گوشت کو اکٹھا کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک اس سے مراد صرف یہ ہے کہ بکری کے بچے کو اس کی ماں کے دودھ میں نہیں ابالنا چاہیے۔ سبت کے دن کے حوالے سے بھی ان کی تشریحات ربیائی یہودیت کے ماننے والوں سے مختلف تھیں، مثلاً قرائٹ نہ تو سبت کی شمعیں جلاتے ہیں اور نہ ہی اس دن ازدواجی تعلقات رکھنے کے روادار ہیں۔ یہ کیلنڈر کے حوالے سے بھی عام یہودیوں سے مختلف ہیں اس لیے ان کے بعض تہواروں کے دنوں میں فرق بھی آجاتا ہے۔ان کی اچھی خاصی تعداد آج بھی اسرائیل سمیت دنیا کے مختلف علاقوں میں رہائش

پذیر ہے۔

عصر حاضر کے فرقے

جدیدیت، نشاۃ ثانیہ، الحاد، اور سائنس جیسے عناصر عصر حاضر کے تمام بڑے مذاہب پر اثر انداز ہوئے۔ ان مسائل نے یہودیوں کو قدیم مذہبی روایات کی مختلف تشریحات پر مجبور کیا۔ کچھ نے سختی سے قدیم یہودیت اپنانے کا فیصلہ کیا اور کچھ نے صرف اسی حد تک پرانی روایات کو زندہ رکھا جو ان کے نزدیک جدید دور میں رواج پا سکتی تھیں۔ بعض ایسے بھی رہے جنہوں نے درمیانی راہ اختیار کرنے کی کوشش کی۔ انہیں کوششوں کے نتیجے میں بہت سے نئے مذہبی فرقوں اور تحریکوں نے جنم لیا۔ ان تحریکوں میں سے بعض ایسی بھی تھیں جن کا مذہب سے تعلق خاص مقاصد کے حصول سے مشروط تھا، مثلاً صہیونیت جس کے متعلق تیسرے باب میں بیان کیا جا چکا ہے، کا مقصد علیحدہ ریاست کا قیام تھا۔ راسخ العقیدہ یہودیوں کے برعکس ان میں مذہب زیادہ رواج نہ پا سکا۔ لیکن چونکہ یہ ریاست مذہب کے نام پر قائم کی گئی تھی اس لیے دیگر یہودی گروہوں پر مذہبی پابندیاں بھی نہیں لگائی گئیں اور ان کی ضروریات کے پیش نظر قوانین بھی رائج کیے گئے۔ تاہم اس تقسیم کو بیان کرنا آسان نہیں، مثلاً اسرائیل میں اگرچہ زیادہ تر یہودی خود کو راسخ العقیدہ کہلوانا پسند نہیں کرتے لیکن زیادہ تر سیناگاگ راسخ العقیدہ نظریات ہی کی حامل ہیں۔ نئی ریاست کے قیام میں جن مذہبی لوگوں نے مدد کی تھی وہ بعد میں مذہبی صہیونیوں کے طور پر مشہور ہونے لگے یہاں تک کہ اب انہیں صہیونیت کی ایک علیحدہ شاخ کے طور پر پہچانا جانے لگا ہے۔ اسی طرح اصلاح شدہ اور رجعت پسند یہودیوں کی صہیونی شاخیں بھی موجود ہیں۔

امریکہ کا کردار بھی اس حوالے سے خصوصیت سے بیان کیا جا سکتا ہے جہاں اصلاح شدہ اور رجعت پسندوں کے ساتھ ساتھ راسخ العقیدہ یہودیت نے بھی رواج پایا۔ ان تینوں گروہوں میں تقسیم ان کی قدیم یہودیت اور ہلاخا کی پیروی کرنے میں سختی کے حساب سے کی جاتی ہے۔ اسی طرح عصر حاضر میں مسیحی یہودی اور بدھ یہودی جیسے فرقے بھی معرض وجود میں آنے لگے ہیں۔ چنانچہ یہ ممکن نہیں کے زیر نظر باب میں تمام یہودی فرقوں اور تحریکوں کو متعارف کروایا جا سکے۔ ذیل میں صرف انہیں فرقوں کا مختصر ذکر کیا جا رہا ہے جو اپنی تعداد اور مذہبی شناخت کی وجہ سے زیادہ تر یہودیوں کی نمائندگی کرتے ہیں۔

اصلاح شدہ یہودیت

اصلاح شدہ یہودی جنہیں ترقی پسند یا آزاد خیال یہودی بھی کہا جاتا ہے مذہب میں ارتقا کے قائل ہیں، الہیات پر اخلاقیات کو فوقیت دیتے ہیں اور عقلیت پسندی کی طرف مائل ہیں جو کہ ہشکالا یعنی یہودی روشن خیالی کی تحریک کے بنیادی نعروں میں سے ایک ہے۔ یہودی نشاۃ ثانیہ کے دوران جرمنی اور بعد میں امریکہ میں رواج پانے والے اس فرقے کے آغاز کے متعلق معلومات تیسرے باب میں بیان کی جاچکی ہیں۔ امریکا میں اصلاحی یہودیت نے سب سے زیادہ رواج پایا۔ تقریباً 35 فیصد امریکی یہودی خود کو اصلاح شدہ تصور کرتے ہیں۔ یہ سب سے پہلا یہودی گروہ تھا جس نے امریکا میں اپنے آپ کو رسمی طور پر منظم کر کے ایک نظریے سے فرقے کی شکل اختیار کر لی۔ اس میں امریکا کی آزاد خیالی کا بھی دخل ہو سکتا ہے کیونکہ یہاں راسخ العقیدہ یہودیت زیادہ اثر و رسوخ قائم نہیں کر سکی۔

اصلاح شدہ یہودیت میں اس تیزی سے تبدیلیاں آئی ہیں کہ اس کو روایتی اور نو اصلاحی یہودیت میں بھی تقسیم کیا جانے لگا ہے۔ ان کے ہاں مذہبی رسومات کی پیروی اس لیے نہیں ہوتی کہ یہ خدا کا حکم ہے بلکہ یہ ان رسومات کو انسان کے ذاتی انتخاب کی وجہ سے اپنانے کا نقطہ نظر رکھتے ہیں۔ لہذا ان کا ہر فرد عبادات کو اپنے ذوق کے مطابق ادا کرتا ہے۔ ان کے ہاں توریت کو خدا کا قانون نہیں سمجھا جاتا بلکہ اسے انسانی تعلیمات کا درجہ حاصل ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ سمجھتے ہیں کہ مذہب خدائی قانون نہیں بلکہ انسان کی تخلیق کردہ تعلیمات ہیں جن میں بوقت ضرورت تبدیلی کی جانی چاہیے تاکہ یہ کوئی ساکت و جامد شے نہ بن کر رہ جائے۔ اسی لیے یہ کہتے ہیں کہ عبرانی بائیبل لفظ بہ لفظ خدا کی ودیعت کردا نہیں بلکہ اس کی تکمیل تاریخ کے مختلف ادوار میں مختلف لوگوں نے اپنی فہم و فراست سے کی ہے۔ تلمود موسیٰؑ کا فراہم کردہ زبانی قانون نہیں ہے بلکہ اس کو بھی بعد کے انسانوں نے تخلیق کیا ہے۔ اس پر بھی بطور الہامی کلام یقین نہیں کرنا چاہیے۔[28] چنانچہ اصلاح شدہ یہودی ایک ہی وقت میں مختلف عقائد و تصورات کے حامل ہو سکتے ہیں جن میں وقت اور ضرورت کے اعتبار سے تبدیلی و ارتقا ممکن ہے۔ نو اصلاحی یہودی مزاج میں زیادہ تر راسخ العقیدہ یہودیوں کے مماثل ہیں جو دعاؤں، سبت کی پیروی اور عبادات میں قدیم یہودیت کے علمبردار ہیں۔ تاہم راسخ العقیدہ یہودیوں کے برعکس یہ ان عبادات کو خدائی قانون

تسلیم کرنے کی بجائے ذاتی انتخاب قرار دیتے ہیں۔ اب ان میں توریت کی تلاوت کو بھی عام رواج مل رہا ہے جس کا تہواروں جیسے بار/بات متسواہ وغیرہ میں خصوصی اہتمام کیا جاتا ہے۔ اس کی ایک وجہ ان کے ہاں مرد و زن کی برابری کی تحریکوں کا فروغ بھی ہو سکتا ہے کیونکہ ان کی متعدد سینگاگ اور دیگر اداروں میں عورتوں کو ربی، قائدین اور منتظمین بھی منتخب کیا جانے لگا ہے۔[29]

یہ لوگ چونکہ مذہب کے اصولوں کو قابل تغیر مانتے ہیں اس وجہ سے زمانے میں جاری عوامل ان کے مذہبی معاملات میں مداخلت کرتے رہتے ہیں۔ ان کے ارد گرد اٹھنے والی مختلف تحریکیں، مثلاً نسوانیت، الحاد یا اشتراکیت وغیرہ ان کی عبادات اور رسومات کو متاثر کرتی ہیں۔ مساوات انسانی کے نئے نظریات کے تحت ان لوگوں نے مذہب میں ہم جنس پرستوں، فوک روک موسیقی اور نو روایت پرستی کو بھی شامل کر لیا ہے۔[30] بین المذاہب شادیوں کو بھی برا نہیں سمجھا جاتا۔ اس حوالے سے انہوں نے کچھ قوانین تشکیل دینے کی کوشش ضرور کی تھی لیکن وہ تاحال رواج نہیں پا سکے۔ یہودیت کی جانچ کے لیے ایک عرصہ تک انہوں نے ماں یا باپ میں سے کسی ایک کا یہودی ہونا لازمی قرار دیے رکھا اور بعد میں ماں اور باپ دونوں کا یہودی ہونا ضروری سمجھنے لگے۔ دیگر یہودی فرقوں کے نزدیک یہ دونوں طرزِ عمل ہی درست نہیں سمجھے جاتے۔ وہ خیال کرتے ہیں کہ اس طرح اصلاح شدہ یہودیوں نے ہلاخا کو تبدیل کرنے کی کوشش کی ہے۔ چنانچہ جن لوگوں کو یہ یہودی سمجھتے ہیں دیگر یہودی فرقوں کے نزدیک وہ اور ان کی اولادیں غیر یہودی ہیں۔

وحی کے متعلق ان کے نظریے میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ وحی، روایتی اصلاحی یہودیت کی طرح نو اصلاحی یہودیت میں بھی ایک مسلسل عمل سمجھا جاتا ہے جو کوہ سینا پر ختم نہیں ہو گئی بلکہ عقل کے توسط سے بنی اسرائیل میں جاری و ساری ہے۔ اس لحاظ سے ہر اصلاح شدہ یہودی کا مذہبی تعلیم حاصل کرنا بھی ضروری سمجھا جاتا ہے اور اس کو مذہب کی ذاتی، من چاہی تشریح کرنے کی اجازت بھی دی جاتی ہے۔ ان وجوہات کی بنیاد پر یہ دیگر یہودی گروہوں کی تنقید کا نشانہ بھی بنتے رہے ہیں۔ البتہ نو اصلاح شدہ یہودیت میں اس حوالے سے کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ ان میں البتہ نیا ارتقا یہ ہوا ہے کہ پہلے پہل ان کے ہاں رواج پانے والا تصورِ خدا فرد/جسم کی طرح تھا لیکن بعد میں خدا کو دنیا میں جاری و ساری روحانی طاقت سمجھا جانے لگا جو کائنات اور انسان کو

زندگی کے معنی عطا کرتا ہے۔اس طرح انہیں وحی کے ارتقائی عمل کو بیان کرنے میں بھی آسانی ہوئی ہے۔اس ضمن میں ایک اصلاحی ربی کا قول ہے: "خدا ایک زندہ/جاری خدا ہے نہ کہ ایسا خدا جس نے ایک دفعہ خود کو اور اپنے کلام کو سینا پر نازل کیا اور اب وہ چپ ہے۔"[31] چونکہ ان کے ہاں خدا کے نظریے میں بھی ارتقا ہوا ہے لہذا اسی حساب سے اب نئی سیدور بھی ترتیب دی جارہی ہیں۔ 1971 کے ایک سروے کے مطابق خدا کے متعلق اصلاح شدہ یہودیوں میں درج ذیل رویے پائے جاتے تھے:

1. 17 فیصد خدا کے روایتی نظریے پر یقین رکھتے تھے۔
2. 49 فیصد اپنے ذاتی عقائد کے مطابق خدا کو مانتے تھے۔
3. 21 فیصد خدا کے وجود کا ادراک نہیں رکھتے تھے۔
4. 4 فیصد خود کو ملحد سمجھتے تھے۔[32]

ان میں سے زیادہ تر حیات بعد الموت کے عقیدے کو مانتے ہیں لیکن سمجھتے ہیں کہ یہ جسمانی نہیں بلکہ روحانی ہو گی۔ سیاسی اعتبار سے یہ صہیونیوں کے طرزِ عمل کے حق میں ہیں۔ اسرائیلی ریاست کے علیحدہ قیام میں اصلاح شدہ یہودیوں نے ہر موڑ پر مالی و سیاسی معاونت جاری رکھی تھی۔ اب ان کے ہاں جن بچوں کو ربی بننا ہوتا ہے وہ اپنی تعلیم کا ابتدائی سال ہیبریو یونین کالج کی یروشلم والی شاخ میں مکمل کرتے ہیں۔ اسرائیل میں عبرانی کو سرکاری زبان کا درجہ مل گیا ہے اس لیے ان کی عبادات میں بھی اب عبرانی زبان کو ترجیح ملنی شروع ہو گئی ہے جبکہ روایتی اصلاحی یہودیت میں جرمن اور انگریزی سمیت دیگر زبانوں میں عبادات کو رواج دیا گیا تھا جس کے لیے خصوصی طور پر سیدور بھی تصنیف کی گئی تھیں اور معابد بھی بنائے گئے تھے۔ عصر حاضر میں ان کے مشہور ادارے درج ذیل ہیں:

1. Advancing Temple Institutional Development (ATID)

یہ ادارہ شمالی امریکا میں پیشہ وارانہ تعلقات کو فروغ دیتا ہے اور وسائل کا اشتراک کرتا ہے۔

2. American Conference of Cantors (ACC)

یہ معبدوں، سیناگاگ اور گرجاؤں میں گانے والے طائفوں کی تنظیم ہے جس میں 450 طائفے شامل ہیں۔ یہ لوگ دیگر اداروں کے ساتھ مل کر یہودی عبادات کے لیے موسیقی ترتیب دیتے

ہیں اور اراکین کی پیشہ وارانہ تربیت کرتے ہیں۔

3. Association of Reform Zionist of America (ARZA)

اس ادارے کا مقصد امریکی اصلاح شدہ یہودیوں کی صہیونی شناخت کا تحفظ ہے۔

4. International Federation of Reform and Progressive Religious Zionists (ARZENU)

1980 سے قائم شدہ اس سیاسی ادارے کا مقصد عالمی صہیونی اداروں کے مابین تعلقات کا فروغ اور اسرائیلی حکومتی اداروں میں اصلاحی یہودیت کی اقدار کا تحفظ ہے۔

5. Association of Reform Jewish Educators (ARJE)

اس ادارے کا مقصد اصلاحی یہودیت کی پیشہ وارانہ تعلیم کا فروغ ہے۔

6. Brit Milah Program of Reform Judaism

اس ادارے کا مقصد اصلاحی یہودیوں میں بریت میلا کی رسم کی ادائیگی میں مدد فراہم کرنا اور جراحوں کی تربیت کرنا ہے۔

7. Canadian Association of Reform Zionists (ARZA Canada)

اس ادارے کا مقصد کینیڈا کے اصلاح شدہ یہودیت میں صہیونیت کا فروغ اور اسرائیل میں اصلاحی یہودیت کی اقدار کا تحفظ ہے۔

8. Central Conference of American Rabbis (CCAR)

اس قدیم ترین ادارے کا مقصد اصلاح شدہ ربیوں کی تربیت اور یہودیت کا فروغ ہے۔

9. Early Childhood Educators of Reform Judaism (ECE-RJ)

اس ادارے کا مقصد ابتدائی تعلیمی نصاب کے لیے منتظمین، اساتذہ اور متعلقین کی مدد کرنا ہے۔

10. Hebrew Union College-Jewish Institute of Religion (HUC-JIR)

1875 سے قائم شدہ اس ادارے کا مقصد اصلاحی یہودیت کی پیشہ وارانہ تعلیم کا فروغ ہے۔ اس کی تین شاخیں امریکہ میں موجود ہیں اور ایک شاخ یروشلم میں واقع ہے۔

11.Israel Religious Action Center (IRAC)

1987 میں قائم ہونے والے اس ادارے کا مقصد اسرائیل کے اندر قانونی چارہ جوئی اور نشر اشاعت کے ذریعے مساوات، معاشرتی انصاف اور مذہبی تکثیریت کا فروغ ہے۔

12.Israel Movement for Reform and Progressive Judaism (IMPJ)

اصلاحی یہودیت کا ایک بڑا ادارہ جس کے تحت بہت سے ذیلی ادارے اسرائیل میں کام کر رہے ہیں۔ درج بالا ادارہ بھی اسی ادارے ہی کی ایک شاخ ہے۔

13.Men of Reform Judaism (MRJ)

اس ادارے کا مقصد اصلاحی یہودیوں میں اخوت اور مقامی طور پر منظم مردوں کے حلقوں کے قیام کا فروغ ہے۔

14.National Association for Temple Administration (NATA)

1941 سے قائم شدہ اس ادارے کا مقصد سیناگاگ اور اس کے منتظمین کی تربیت ہے۔

15.The Reform Jewish Youth Movement (NFTY)

75 برس پرانے اس ادارے کا مقصد نوجوان اصلاحی یہودیوں کی تربیت ہے۔

16.Program and Engagement Professionals of Reform Judaism (PEP-RJ)

2001 سے قائم اس ادارے کا مقصد اصلاحی یہودیت سے متعلقہ پروگرام منعقد کروانا اور تعلیم و تربیت کو فروغ دینا ہے۔

17.The Reform Jewish Community of Canada (RJCC)

ایک بڑا ادارہ جس کے تحت کینیڈا کے زیادہ تر اصلاحی ادارے کام کر رہے ہیں۔ اس کے اراکین کی تعداد 30000 ہے۔

18.Reform Pension Board (RPB)

اس ادارے کا مقصد ریٹائرمنٹ اور انشورنس جیسی خدمات کی فراہمی ہے۔

19.Religious Action Center of Reform Judaism (RAC)

60 برس پرانے اس ادارے کا مقصد واشنگٹن میں اصلاحی یہودیوں کے لیے معاشرتی عدل کی فراہمی ہے۔

20.Union for Reform Judaism (URJ)

شمالی امریکہ کا ایک بڑا ادارہ جو اصلاحی یہودیوں کی آواز ہے۔ زیرِ نظر تحریکوں کی فہرست اور مختصر تعارف کا بیشتر حصہ بھی اسی ادارے کی ویب سائٹ سے لیا گیا ہے۔

21.Women of Reform Judaism (WRJ)

1913 سے قائم شدہ اس ادارے کا مقصد اصلاحی یہودی خواتین کی تربیت ہے۔

22.World Union for Progressive Judaism (WUPJ)

1.8 ملین اراکین کے ساتھ 45 ممالک میں پھیلے اس ادارے سے اصلاحی اور نو تشکیلی یہودیت کی بہت سی شاخیں اور ادارے وابستہ ہیں۔ 1926 سے یہ ادارہ دنیا کے مختلف گوشوں میں اصلاحی یہودیت کے فروغ کے لیے کوشاں ہے۔

رجعت پسند یہودیت

رجعت پسند یا "مسورتی" یعنی روایت پرست یہودی، اصلاح شدہ اور راسخ العقیدہ یہودیوں کے مابین ہیں۔ بعض افکار میں انہوں نے روایت پسندی کو اپنایا ہے اور بعض افکار اصلاحی یہودیت سے مستعار ہیں۔ ان کا مقصد یہ ہے کہ یہودیت کی پیروی کرتے ہوئے جدید دنیا سے رشتہ استوار رکھا جائے۔ امریکا میں تقریباً 18 فیصد یہودی رجعت پسند ہیں۔ یہ بھی وحی میں ارتقا کے قائل ہیں تاہم ان کے ہاں کسی معاملے میں فوری ردعمل کی بجائے تدریجاً تبدیلی کی طرف جایا جاتا ہے۔ ہلاخا میں تبدیلی یا نئے معنی اخذ کرنے کا حق ہر کسی کو حاصل نہیں۔ صرف محتاط مطالعے کے بعد باہمی صلاح مشورے سے نئی تبدیلی تجویز کی جاتی ہے۔ اسی لیے رجعت پسند یہودیت کا بانی زیخاریس فرینکل (1801-1875) کو مانا جاتا ہے جن کا خیال تھا کہ عقل کی بنیاد پر مذہبی اصلاح کرنے کے لیے علمیت لازمی جزو ہے۔ وہ خود پہلے اصلاحی یہودیت کے حامی تھے۔ بعد ازاں 1845 میں انہوں نے اس فرقے سے اس لیے کنارہ کشی اختیار کرلی کہ اصلاحی یہودیوں کے برعکس وہ یہ سمجھتے تھے کہ عبادات میں عبرانی زبان کو فوقیت دی جانی چاہیے۔[33] بعد میں سلیمان شختر (1847-1915) جیسے مفکرین نے مذہب میں سائنسی

مطالعے خصوصاً تاریخی طریقہ تحقیق کو فروغ دے کر رجعت پسندیت کو مزید مستحکم کیا اور یونائیٹڈ سیناگاگ آف امریکہ جیسے ادارے کی بنیاد رکھی۔ شختر کا خیال تھا کہ رجعت پسند یہودیت میں روایتی اور غیر روایتی یہودی عناصر کو یکجا کرنا چاہیے۔ ان افکار نے رجعت پسند یہودیوں کو بنیادیں فراہم کیں اور بیسویں صدی کے وسط میں یہ باقاعدہ فرقے کی شکل اختیار کر گیا۔ گذشتہ کچھ دہائیوں سے اسرائیل میں بھی رجعت پسند یہودیت کو کافی فروغ ملا ہے لیکن وہاں یہ مسورتی یہودیت کے نام سے مشہور ہے۔

خدا کا تصور ان کے ہاں راسخ العقیدہ یہودیوں ہی کی طرح ہے جو قادر مطلق، خالق کل اور ہر چیز کا جاننے والا ہے۔ یہ مانتے ہیں کہ توریت خدا نے نازل کی لیکن اس کو مکمل اور حتمی کلام تسلیم نہیں کرتے البتہ یہ سمجھتے ہیں کہ کاتبین توریت نے اسے خدا کی مرضی کے مطابق تصنیف کیا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ عبرانی بائبل کی دیگر کتب کی نسبت توریت کی تکمیل میں الہامی عناصر زیادہ کارفرما نظر آتے ہیں۔ وحی ان کے نزدیک ہر زمانے میں جاری و ساری رہتی ہے اس لیے یہودیوں کی ہر نسل خدا کا نیا کلام دریافت کرتی رہے گی۔ تلمود ان کے خیال میں الہامی عناصر اور انسانی کاوش دونوں کا نتیجہ ہے۔ کتب مقدسہ پر مجموعی طور پر غیر یہودی تہذیبوں اور روایات کے اثر کو تسلیم کرتے ہوئے انہیں تاریخی کتب کے طور پر مانتے ہیں۔ حیات بعد الموت کے عقیدے میں یہ اصلاح شدہ یہودیوں کے حامی ہیں۔

اصلاحی یہودیوں کے برعکس ان کے ہاں اخلاقی اقدار کے ساتھ ساتھ رسمی عبادات کی بھی پابندی کی جاتی ہے۔ وقت اور ضرورت کے تحت یہ ہلاخا میں بھی تبدیلی کے قائل ہیں۔[34] اس کے لیے انہوں نے باقاعدہ ایک ادارہ بنایا ہے جسے کمیٹی برائے یہودی اصول و قوانین کہتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ ہلاخا الہامی نہیں بلکہ ربیوں کا تخلیق کردہ مذہبی ادب ہے اس لیے زمانے کے مطابق اس میں تبدیلیاں ہوتی رہیں گی، مثلاً سبت کے دن یہودیوں کو منع کیا گیا ہے کہ وہ کوئی کام سرانجام نہیں دے سکتے۔ اگر کسی کا گھر سیناگاگ سے دور ہے تو کیا اس کا گاڑی چلا کر آنا کام میں شمار ہوگا یا نہیں؟ راسخ العقیدہ یہودی گاڑی چلانے کو کام تصور کرتے ہیں لیکن رجعت پسند یہودی اسے کام شمار نہیں کرتے۔ لہذا وہ گاڑی چلا کر سیناگاگ آنا جائز سمجھتے ہیں۔[35] دیکھنے کو یہ عام سا معاملہ لگتا ہے لیکن اس کا رجعت پسند یہودیت کے فروغ سے گہرا تعلق ہے۔

1940 اور 1950 کے درمیان شہروں کے قرب و جوار میں بسنے والے لوگ رجعت پسند یہودیوں کی سیناگاگ سے متاثر ہو کر عبادت کے لیے وہاں آنے لگے تھے۔ یہ وہ یہودی تھے جو راسخ العقیدہ یہودیت کی سختی کے قائل بھی نہیں تھے اور اصلاح شدہ یہودیت کی سی جدت اپنانے کے لیے بھی راضی نہیں تھے۔ یہ شہروں سے دور بستے تھے اس وجہ سے سبت کی عبادات میں شمولیت ان کے لیے دشوار تھی۔ اس دشواری کی وجہ سے سبت کو گاڑی چلانا جائز کر لیا گیا۔

راسخ العقیدہ یہودیوں کے برعکس اور اصلاح شدہ یہودیوں کی طرح یہ نئی اسرائیلی ریاست کے قیام کو درست سمجھتے ہیں اور اس کی تعمیر و ترقی کے لیے کوشاں رہنے میں فخر محسوس کرتے ہیں۔ چونکہ ان کا خیال ہے کہ اسرائیل کی ابتدا اور انتہا یہودی ہی ہیں اس لیے انہیں بھی نسلی تعصب کا شکار سمجھا جاتا ہے۔ شختر نے کلال یسرائیل یعنی "پوری دنیا کی یہودی برادری" کا ایک تصور پیش کیا تھا جس کے مطابق تمام یہودیوں کو ایک قوم ماننا اور ہر یہودی کو اہمیت دینا ضروری ہے۔ اس لحاظ سے ان کے ہاں قومیت اور مذہب کو الگ الگ کرنا ممکن نہیں ہے۔ پیدائشی یہودی ان کے ہاں وہ ہوتا ہے جس کی ماں یہودی ہو۔ نو یہودی کے لیے ختنہ اور مک وے کو ضروری سمجھتے ہیں۔

اصلاح شدہ یہودیوں ہی کی طرح یہ مرد اور عورت کی برابری کے قائل ہیں اور بعض عبادات اور تہوار، جن میں عورتوں کو شامل نہیں کیا جاتا تھا، ان میں بھی عورت کی شمولیت کو جائز سمجھتے ہیں۔ جیسا کہ چھٹے باب میں بیان کیا جا چکا ہے کہ شادی بیاہ کے موقع پر رجعت پسند یہودیوں کے ہاں لڑکی بھی توریت کی تلاوت کرتی ہے اور لڑکے کو انگوٹھی بھی پہناتی ہے۔ عورتوں کو ربی، قائدین اور منتظمین وغیرہ بننے کی بھی اجازت ہے۔ اصلاح شدہ یہودیوں کی طرح ان میں بھی بین المذاہب شادیوں کا رواج بھی عام ہے۔ البتہ ایسے قوانین بنائے جا رہے ہیں جن کے ذریعے بین المذاہب شادیوں کی حوصلہ شکنی کی جا سکے۔ سیناگاگ میں مرد و عورت دونوں اکٹھے عبادات میں شریک ہو سکتے ہیں۔ رجعت پسند یہودیت کے مشہور ادارے درج ذیل ہیں:

1. Assembly of Masorti Synagogues

اس ادارے کا مقصد برطانیہ کے رجعت پسند یہودیوں کی سیناگاگ کی نظامت ہے۔

2. Federation of Jewish Men's Clubs

یہ ادارہ مردوں کے پروگرام منعقد کرواتا ہے۔اس کے تحت 200 سے زائد کلب ہیں۔ مستقل اراکین کی تعداد 20،000 سے زائد ہے۔

3. The Jewish Theological Seminary

1886 سے قائم شدہ اس ادارے کا مقصد تحقیق وتدوین اور رجعت پسند یہودیت کا فروغ ہے۔ اس کے تحت مختلف تعلیمی ادارے چل رہے ہیں۔

4. Masorti Movement

یہ ادارہ اسرائیل میں رجعت پسند یہودیت کے مفادات کا خیال رکھتا ہے۔

5. Mercaz USA

یہ ادارہ رجعت پسند یہودیت کے صہیونی مقاصد کا نگران ہے۔

6. Mercaz Canada

یہ ادارہ کینیڈا کے رجعت پسند یہودیوں کے صہیونیت سے متعلق معاملات کا نگران ہے۔

7. National Ramah Commission

یہ ادارہ رجعت پسند یہودی نوجوانوں اور بچوں کے امریکا اور دیگر ممالک میں کیمپ منعقد کرتا ہے۔

8. Cantors Assembly

یہ رجعت پسند یہودیوں کا پیشہ وارانہ طائفہ ہے۔

9. The Jewish Museum

یہ رجعت پسند یہودیوں کا عجائب خانہ ہے جہاں ماہر فن یہودیوں کے فن پارے موجود ہیں۔

10. Masorti Olami

ایک بڑا ادارہ جس کے تحت متعدد ذیلی ادارے کام کر رہے ہیں۔اس ادارے کا مقصد رجعت پسند یہودیت اور عالمی یہودی برادری کے اتحاد کو فروغ دینا ہے۔

11. North American Association of Synagogue Executives

یہ ادارہ رجعت پسند یہودیوں کی سیناگاگ کے منتظمین کو مدد فراہم کرتا ہے۔

12. United Synagogue of Conservative Judaism

رجعت پسند یہودیت کا سب سے بڑا ادارہ جس کی بنیاد سلیمان شختر نے رکھی تھی۔

13. Women's League for Conservative Judaism

1913 سے قائم شدہ اس ادارے کے تحت رجعت پسند یہودی خواتین کی 600 سے زائد تنظیمیں کام کر رہی ہیں۔

14. Schechter Rabbinical Seminary

اس ادارے کا کام پیشہ وارانہ رجعت پسند ربیوں کی تربیت ہے۔

15. Jewish Youth Directors Association

اس ادارے کا مقصد شمالی امریکہ میں رجعت پسند نوجوانوں کی پیشہ وارانہ تربیت ہے۔

16. Seminario Rabinico Latinoamericano

یہ ادارہ ارجنٹینا میں رجعت پسند یہودیت کے فروغ کے لیے کوشاں ہے۔

17. Jewish Educator's Assembly

اس ادارے کا مقصد شمالی امریکہ میں یہودیوں کو پیشہ وارانہ تعلیم فراہم کرنا ہے۔

18. The Conservative Yeshiva

یہ اسرائیل میں قائم رجعت پسند یہودیوں کا مدرسہ ہے۔

19. Zacharias Frankel College

جرمنی میں قائم اس ادارے کا مقصد یورپی یہودیوں کی روحانی ضروریات کا خیال رکھنا ہے۔

راسخ العقیدہ یہودیت

راسخ العقیدہ یہودی، فریسیوں اور ربیوں کے وارث ہیں جو درج شدہ اور زبانی دونوں قوانین کو الہامی سمجھتے ہیں، خدا، حیات بعد الموت، آخرت اور فرشتوں کے روایتی تصور کو اپناتے ہیں اور عقل کی بجائے کتب مقدسہ کو فوقیت دیتے ہیں۔ اصلاح شدہ اور رجعت پسند یہودیت کے رد عمل میں راسخ العقیدہ یہودیت کو رسمی طور پر فروغ حاصل ہوا۔ ورنہ اس سے پہلے تک یہودیوں میں ایسی کوئی تحریک یا فرقہ موجود نہیں تھا۔ "راسخ العقیدہ" کی اصطلاح ان یہودیوں کے لیے مستعمل ہوئی جنہوں نے روشن خیالی کی مخالفت کی تھی۔ سفاردی یہودی جب تک مسلمانوں کے زیر اثر تھے انہوں نے علمی طور پر بہت ترقی کی۔ ربیائی یہودیت کے متعدد مراکز،

سپین اور عراق میں قائم کیے۔ مسلم حکومتوں کے زوال کے ساتھ ہی ربیائی یہودیت میں مرکزیت بھی ختم ہوتی چلی گئی جس کی وجہ سے بہت سے سفاردی یہودیوں نے امریکہ اور اسرائیل ہجرت کی۔ بعد ازاں، تقریباً 1840 کی دہائی میں جرمنی سے نکلنے والے اشکنازی یہودی بھی امریکہ ہی میں بستے چلے گئے۔ امریکہ میں 10 فیصد یہودی خود کو راسخ العقیدہ مانتے ہیں۔ عصر حاضر میں ربیائی یہودیت کی پیروی کرنے والے مختلف یہودی گروہوں اور تحریکوں کو مجموعی طور پر راسخ العقیدہ کے نام سے پکارا جاتا ہے تاہم ان کی کوئی ایسی مرکزی انجمن، تنظیم یا سیناگاگ موجود نہیں ہے جو مجموعی طور پر معاملات پر نظر رکھتی ہو۔ اس لیے روایتی یہودیت کی پیروی میں یہ لوگ مختلف نظریات کے حامل ہیں۔

نظریات کے اختلاف کی بنیاد ان کی مزید شاخیں جیسے "انتہائی راسخ العقیدہ یہودی" یا "جدید راسخ العقیدہ یہودی" وغیرہ بھی بنتی جارہی ہیں۔ انتہائی راسخ العقیدہ یہودی جنہیں حریدی یہودی بھی کہا جاتا ہے ربیائی یہودیت کے اصولوں کی سختی سے پیروی کرنے کی وجہ سے بنیاد پرست سمجھے جاتے ہیں۔ میل جول میں محتاط رہتے ہیں اور عموماً دیگر یہودی گروہوں سے زیادہ تعلقات قائم نہیں کرتے۔ حسیدی اور یشیویش ان کی دو ذیلی شاخیں ہیں۔ اول الذکر ایک روحانی گروہ ہے جبکہ ثانی الذکر روحانیت کی مخالفت کرتے ہیں اور عقلیت پسند ہیں۔

جدید راسخ العقیدہ یہودی اس کوشش میں ہیں کہ توریت کے احکامات اور ہلاخا کو جدید معاشرے کے مطابق بیان کیا جاسکے۔ اس کے لیے "تورااُمداع/توریت وسائنس" کا ایک فلسفہ وجود میں لایا گیا ہے جو اس بات پر زور دیتا ہے کہ سائنسی علوم اور توریت کے احکامات میں باہم تضاد نہیں ہے۔ لہذا یہ علوم، توریت کی رو سے پڑھے جانے چاہیں۔ 1990 کی دہائی میں ان کی ایک نئی شاخ "متفاہم راسخ العقیدہ" وجود میں آئی جس کی بنیاد ایک امریکی ربی افی ویس (پیدائش 1944) نے رکھی۔ اس نئی شاخ کے حامیوں کا کہنا ہے کہ ہلاخا میں نرمی کی گنجائش اس سے کہیں زیادہ ہے جتنی دیگر راسخ العقیدہ یہودی بیان کرتے ہیں۔ ویس کے مطابق یہ نئی شاخ ابراہیمؑ اور سارہؓ کے خیمے کی طرح ہے جو "ہر طرف سے کھلا تھا اور نہ صرف ان کو خوش آمدید کہا جاتا تھا جو اندر آتے تھے بلکہ اس خیمے سے باہر نکل کر قرب وجوار سے گزرنے والوں کا خیر مقدم بھی کیا جاتا تھا، انہیں توریت کے پانیوں سے سیراب ہونے کی ترغیب دی جاتی تھی۔"[36] لہذا یہ لوگ

عقلیت پسندی کی طرف مائل ہیں، تمام یہودیوں کو قبول کرتے ہیں اور خواتین کے کردار کو اجاگر کرنے والے سمجھے جاتے ہیں۔

ابتدا میں راسخ العقیدہ دوسرے یہودی گروہوں کو سخت تنقید کا نشانہ بناتے تھے تاہم وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ انہوں نے معتدل مزاج اپنالیا ہے۔ اب ان کی سیناگاگ میں آنے والوں کے مذہبی تشخص کو زیادہ اہمیت نہیں دی جاتی۔ آج کے اسرائیل میں زیادہ تر سیناگاگ راسخ العقیدہ نظریات کی حامل ہیں لیکن وہاں دیگر فرقے بھی عبادت کے لیے جاتے ہیں۔ یہ توریت کی تمام وصیتوں پر یقین رکھتے ہیں اور جتنا ہو سکے ان کی پیروی کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کے ہاں دن میں تین بار نماز ادا کرنا ضروری ہے۔ زیادہ تر عبادات عبرانی زبان ہی میں ہوتی ہیں البتہ کچھ جدید راسخ العقیدہ سیناگاگ نے انگریزی میں بھی عبادات کو رواج دینا شروع کیا ہے۔

سیناگاگ میں مرد وزن کے اختلاط کو اچھا نہیں سمجھا جاتا۔ نہ ہی راسخ العقیدہ سیناگاگ میں عورتوں کو مردوں کی نمازیں یا توریت پڑھانے اور مذہبی گیت گانے کی اجازت ہوتی ہے۔ عبادات کے دوران سر ڈھانپنے کو فوقیت دی جاتی ہے۔ عورتیں خصوصی طور پر اپنے بالوں کو بھی ڈھکتی ہیں۔ مرد عام طور پر عبادات کے دوران تالیت اور تفیلین کا استعمال کرتے ہیں۔[37] تفیلین چمڑے سے بنے چھوٹے چھوٹے صندوق ہوتے ہیں جن میں چمڑے ہی کی ڈوری ہوتی ہے۔ ایک صندوق کو آنکھوں کے درمیان سر پر باندھا جاتا ہے اور دوسرے کو ہاتھ کے ارد گرد لپیٹ لیا جاتا ہے۔ راسخ العقیدہ یہودی اس کا حکم توریت سے لیتے ہیں جس میں کہا گیا ہے "یہ تمہارے ہاتھ پر بندھے دھاگے کی طرح ہے اور یہ تمہاری آنکھوں کے سامنے ایک نشان کی طرح ہے۔ یہ اُسے یاد کرنے میں مدد کرتا ہے کہ خداوند اپنی عظیم قدرت سے ہم لوگوں کو مصر سے باہر لایا۔"[38] اصلاح شدہ اور رجعت پسند یہودیوں میں عورتیں بھی تفیلین کا استعمال کرتی ہیں جبکہ راسخ العقیدہ یہودیوں میں صرف مرد ہی اسے پہننے کے مجاز سمجھے جاتے ہیں۔

مجموعی طور پر ان کے ہاں کوشر یعنی حلال کھانے، سبت اور مک وے یعنی طہارت کا خصوصی خیال رکھا جاتا ہے۔ یہ بنی اسرائیل کو خدا کی منتخب قوم سمجھتے ہیں جس کا کام دیگر قوموں کو ہدایت کی طرف لانا ہے۔ بیشتر اس بات پر متفق ہیں کہ موجودہ اسرائیل کا قیام مذہبی اعتبار سے

درست نہیں۔ خدا کی جب مرضی ہو گی وہ مسیح موعود کے ذریعے دنیا پر امن نازل کرے گا اور بنی اسرائیل کو ارض موعود سے نوازے گا۔ اس کے ساتھ ساتھ ان میں ایسے مذہبی لوگ بھی موجود تھے جو اسرائیل بننے کے حق میں تھے۔ انہیں اب "مذہبی صہیونی" کہا جانے لگا ہے۔ یہ لوگ اسرائیلی سرزمین، اسرائیلی قوم اور اسرائیلی توریت کا نعرہ بلند کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ اسرائیل میں مذہبی لحاظ سے سب سے طاقتور ادارے یعنی "ربی اعظم اسرائیل" کا عہدہ راسخ العقیدہ یہودیوں ہی کے پاس ہے جس کا کام نو یہودیوں کی تصدیق اور دیگر مذہبی فیصلے کرنا ہے۔ ان کے درج ذیل دیگر مشہور ادارے ہیں:

1. Rabbinical Council of America

امریکی راسخ العقیدہ ربیوں پر مشتمل یہ سب سے بڑا ادارہ ہے جو 1923 میں قائم کیا گیا۔

2. The Union of Orthodox Jewish Congregations

1898 سے قائم اس ادارے کا مقصد مختلف سینگاگ کی تنظیم، نوجوان یہودیوں کی تربیت، کوشر غذا کے سرٹیفکیٹ اور مختلف معاشرتی و تربیتی پروگرام منعقد کروانا ہے۔

3. Yeshivat Chovevei Torah

اس ادارے کا مقصد جدید راسخ العقیدہ یہودیوں کی پیشہ وارانہ تربیت ہے۔

4. Yeshiva University

ایک بڑا تعلیمی ادارہ جہاں تورااُمداع کے فلسفہ کے پیش نظر نصابِ تعلیم کو رواج دیا گیا ہے۔

نواشترا کی یہودیت

نواشترا کی یہودیت کے قیام کا سہرا مشہور ربی مردخائی کپلن (1881-1983) کے سر باندھا جاتا ہے جس کے مطابق یہودیت کو مذہب کی بجائے بطور تہذیب دیکھا جانا چاہیے۔ لہذا نواشترا کی یہودی تاریخ، زبان، ثقافت، معاشرتی طرزِ عمل اور اسرائیلی ریاست کو خصوصی اہمیت دیتے ہیں۔ کپلن نے 1934 میں **یہودیت بطور تہذیب** لکھ کر اس تحریک کو مضبوط بنیادیں فراہم کیں اور اگلے برس **نواشترا کی میگزین** شروع کیا جو اس فرقے کے فروغ کا سبب بنا۔[39] اس فرقے کے حامی ہم جنس پرستوں کو خوش آمدید کہتے ہیں اور مرد و زن کی برابری کے قائل ہیں۔ کپلن کی بیٹی جوڈیتھ کپلن (1909-1996) وہ پہلی یہودی خاتون تھیں جن کی بات متسواہ ادا

کی گئی۔اس فرقے کے عقائد درج ذیل ہیں:

1. یہودیت انسانی فطری کاوش کا ارتقائی نتیجہ ہے۔الہامی شفاعت کا کوئی وجود نہیں ہے۔
2. یہودیت ایک ایسی مذہبی تہذیب ہے جو ارتقا کے عمل سے گزری ہے۔
3. خدا کے متعلق روایتی نظریات رد کر دیے جائیں۔ خدا در حقیقت تمام قدرتی طاقتوں یا عوامل کا مجموعہ ہے جو انسان کی ذاتی تکمیل اور اخلاقی درستی متعین کرتا ہے۔
4. توریت خدا کا کلام نہیں؛ یہ محض یہودی قوم کے معاشرتی اور تاریخی ارتقا کا نتیجہ ہے۔
5. یہ تصور کہ خدا نے یہودی قوم کو کسی خاص مقصد کے لیے منتخب کیا ہے، اخلاقی طور پر دفاع کے قابل نہیں کیونکہ جو بھی یہ عقیدہ رکھتا ہے وہ ایک قوم کی افضیلت اور دیگر اقوام کی تردید کرتا ہے۔
6. صیہونیت اور "علیا" (اسرائیل ہجرت کرنا) اچھا اقدام ہیں۔
7. ربیوں کی طرح عام لوگوں کو بھی مذہبی مسائل میں فیصلہ کا اختیار ہے۔

انسانیت پسند یہودیت

یہ فرقہ ان یہودیوں پر مبنی ہے جو خدا کا ادراک نہیں رکھتے اور وحی کے الہامی ہونے سے انکار کرتے ہیں۔ اس لیے جب ان سے خدا کے متعلق پوچھا جاتا ہے تو زیادہ تر یہ خاموشی اختیار کرتے ہیں یا یہ کہتے ہیں کہ انہیں اس بات کا علم نہیں کہ خدا کا وجود ہے یا نہیں۔ یہ انسانیت کے جدید فلسفے پر یقین رکھنے والے ہیں اور یہودی رسوم رواج پر عمل، خدا پر یقین کیے بغیر کرتے ہیں۔ اس فرقے کی ابتدا کو مشہور اصلاحی ربی شیر ون تھیوڈر وائن (1928-2007) سے منسوب کیا جاتا ہے۔

سیاہ یہودیت

سیاہ یہودیت کی اصطلاح افریقی یہودیوں کے لیے مستعمل ہے۔ ان میں وہ تمام لوگ شامل ہیں جو یا تو پیدائشی یہودی تھے یا بعد میں اس مذہب سے منسلک ہوئے۔ یہ دیگر یہودیوں کے ساتھ اپنی شناخت قائم کرنا پسند نہیں کرتے اور زیادہ تر خود کو یہودی کہنے کی بجائے عبرانی اسرائیلی کہتے ہیں۔ ان کی ابتدا کے متعلق وثوق سے کچھ کہنا دشوار ہے۔ یہ سمجھا جاتا ہے کہ سیاہ یہودی ربیائی یہودیت کے فروغ سے پہلے ہی دیگر یہودیوں سے جدا ہو گئے تھے یا رومیوں کے

دور میں مظالم سے تنگ آکر انہوں نے افریقہ میں پناہ لی تھی۔ لمبے عرصے تک دیگر یہودیوں سے دور رہنے کی وجہ سے مذہبی اعتبار سے یہ دیگر یہودیوں سے مختلف سمجھے جاتے ہیں۔

مشقی سوالات

مختصر سوالات

1. سامری کون ہیں؟
2. سامری کن کتابوں کو مانتے ہیں؟
3. سامریوں میں جبلِ جرزیم کی کیا اہمیت ہے؟
4. کتابِ عزرا سامریوں کے متعلق کیا بتاتی ہے؟
5. حسیدی کون تھے؟
6. فریسی کون تھے؟
7. فلاویس یوسفیس کون تھا؟
8. فریسیوں کے عقائد کیا تھے؟
9. صدوقی کون تھے؟
10. صدوقیوں کے عقائد کیا تھے؟
11. اسینی کون تھے؟
12. اسینیوں کے عقائد کیا تھے؟
13. اسینی کن پیشوں سے منسلک تھے؟
14. اسینی کھانے کی کیا اہمیت تھی؟
15. زیلوٹ کون تھے؟
16. سیکاری کون تھے؟
17. زیلوٹ کا کیا انجام ہوا؟
18. تھراپیٹی کون تھے؟
19. تھراپیٹیوں کے عقائد کیا تھے؟
20. تھراپیٹی کھانے کی کیا اہمیت تھی؟
21. قرائٹ کون ہیں؟
22. قرائٹ کے عقائد کیا ہیں؟
23. قرائٹ کا بانی کسے سمجھا جاتا ہے؟
24. توبیاس بن موسی کون تھا؟
25. قرائٹ کی توریت کے متعلق کیا رائے ہے؟
26. عصر حاضر کے یہودی فرقے کیسے وجود میں آئے؟
27. اصلاح شدہ یہودی کون ہیں؟
28. اصلاحی یہودیوں کے عقائد کیا ہیں؟
29. نواصلاحی یہودی کون ہیں؟
30. اصلاح شدہ یہودیوں کی توریت کے متعلق کیا رائے ہے؟
31. اصلاح شدہ یہودیوں کی وحی کے متعلق کیا رائے ہے؟
32. اصلاح شدہ یہودیوں کی خدا کے متعلق کیا رائے ہے؟

33. اصلاح شدہ یہودیوں کی حیات بعد الموت کے متعلق کیا رائے ہے؟
34. رجعت پسند یہودیوں کے عقائد کیا ہیں؟
35. رجعت پسند یہودی کون ہیں؟
36. مسورتی یہودی کون ہیں؟
37. رجعت پسند یہودیت کا بانی کسے مانا جاتا ہے؟
38. سیلمان شختر نے رجعت پسندیت کو کیسے فروغ دیا؟
39. رجعت پسند یہودیوں کی وحی کے متعلق کیا رائے ہے؟
40. رجعت پسند یہودیوں کی خدا کے متعلق کیا رائے ہے؟
41. رجعت پسند یہودیوں کی توریت کے متعلق کیا رائے ہے؟
42. رجعت پسند یہودیوں کی ہلاخا کے متعلق کیا رائے ہے؟
43. کلال یسرائیل کیا ہے؟
44. راسخ العقیدہ یہودی کون ہیں؟
45. راسخ العقیدہ یہودیوں کے عقائد کیا ہیں؟
46. امریکہ میں راسخ العقیدہ یہودی کہاں سے آئے؟
47. انتہائی راسخ العقیدہ یہودی کون ہیں؟
48. جدید راسخ العقیدہ یہودی کون ہیں؟
49. حریدی کون ہیں؟
50. یشیوش کون ہیں؟
51. تورااُمداع کیا ہے؟
52. متفاہم راسخ العقیدہ کون ہیں؟
53. تفیلین کسے کہتے ہیں؟
54. کوشر کسے کہتے ہیں؟
55. مذہبی صہیونی کون ہیں؟
56. ربیِ اعظم اسرائیل کیا ہے؟
57. نواشترا کی یہودی کون ہیں؟
58. نواشترا کیوں کے عقائد کیا ہیں؟
59. مردخائی کپلن کون ہے؟
60. جوڈیتھ کپلن کون ہے؟
61. انسانیت پسند یہودی کون ہیں؟
62. سیاہ یہودی کون ہیں؟

تفصیلی سوالات

1. سامریوں اور حسیدیوں پر نوٹ لکھیں۔
2. فریسیوں اور صدوقیوں کا تقابل کریں۔
3. صدوقیوں پر نوٹ لکھیں۔
4. فریسیوں پر نوٹ لکھیں۔
5. اسینیوں پر نوٹ لکھیں۔
6. زیلوٹ پر نوٹ لکھیں۔

7. تھراپیٹیوں پر نوٹ لکھیں۔
8. اسینیوں اور تھراپیٹیوں کا تقابل کریں۔
9. قرائٹ پر نوٹ لکھیں۔
10. اصلاحی یہودیوں پر نوٹ لکھیں۔
11. رجعت پسند یہودیوں پر نوٹ لکھیں۔
12. راسخ العقیدہ یہودیوں پر نوٹ لکھیں۔
13. اصلاحی اور رجعت پسند یہودیوں کا تقابل کریں۔
14. اصلاحی اور راسخ العقیدہ یہودیوں کا تقابل کریں۔
15. اصلاحی اور نو اشتر کی یہودیوں کا تقابل کریں۔
16. رجعت پسند اور راسخ العقیدہ یہودیوں کا تقابل کریں۔
17. رجعت پسند اور نو اشتراکی یہودیوں کا تقابل کریں۔
18. راسخ العقیدہ اور نو اشتراکی یہودیوں کا تقابل کریں۔

حوالہ جات

[1] اول سلاطین 12: 28-31

[2] Frederick J. Murphy, *Early Judaism from the Exile to the Time of Jesus* (Peabody: Hendrickson Publishers, Inc, 2002), 285.

[3] Eliezer Segal, *Judaism: The Ebook* (JBE Online Books, 2009), 15.

[4] http: //www.bbc.com/travel/story/20180828-the-last-of-the-good-samaritans, accessed on 5-8-2021.

[5] دوم سلاطین 32:17

[6] عزرا 4

[7] Sandgren, *Vines Intertwined: A History of Jews and Christians from the Babylonian Exile to the Advent of Islam*, 181.

[8] اول مکابیین 42:2

[9] Martin Hengel, *Judaism and Hellenism: Studies in their Encounter in Palestine during the Early Hellenistic Period*, trans. John Bowden (Philadelphia: Fortress Press, 1981), 178.

[10] Mansoor, *Jewish History and Thought: An Introduction*, 87.

[11]Flavius Josephus, *The Jewish War of Flavius Josephus : With His Autobiography*, ed. Isaac Taylor (London: Houlston and Stoneman, 1847), 205.

[12]Cohn-Sherbok and Cohn-Sherbok, *A Short History of Judaism*, 37.

[13]Étienne Nodet, "Asidaioi and Essenes," in *Flores Florentino: Dead Sea Scrolls and Other Early Jewish Studies in Honour of Florentino García Martínez*, ed. Anthony Hilhorst, Émile Puech, and Eibert Tigchelaar (Boston: Brill, 2007), 82.

[14]Mansoor, *Jewish History and Thought: An Introduction*, 90.

[15]Grabbe, *An Introduction to Second Temple Judaism: History and Religion of the Jews in the Time of Nehemiah, the Maccabees, Hillel and Jesus* 59.

[16]Lupovitch, *Jews and Judaism in World History*, 37.

[17]Mansoor, *Jewish History and Thought: An Introduction*, 92.

[18]Murphy, *Early Judaism from the Exile to the Time of Jesus*, 173.

[19]Segal, *Judaism: The Ebook*, 24.

[20]Mansoor, *Jewish History and Thought: An Introduction*, 91.

[21]Lupovitch, *Jews and Judaism in World History*, 40.

[22]Dennis E. Smith, *From Symposium to Eucharist: The Banquet in the Early Christian World* (Minneapolis: Fortress Press, 2003), 159.

[23]Emil Schurer, *The History of the Jewish People in the Age of Jesus Christ (175 B.C.-A.D. 135)*, 2nd ed. (Edinburgh: T. & T. Clark Ltd., 1979), 2:591.

[24]Ibid., 592.

[25]Moshe Gil, "The Origins of the Karaites," in *Karaite Judaism: A Guide to its History and Literary Sources* ed. Meira Poluack (Boston: Brill, 2003), 114.

[26]Efron, Weitzman, and Lehmann, *The Jews: A History*, 159.

[27]خروج 19:23

[28] Azriela Jaffe *Two Jews Can Still Be a Mixed Marriage: Reconciling Differences Over Judaism in Your Marriage* (New

Jersey: Career Press, 2000), 21.

[29] Dan Cohn-Sherbok, *Modern Judaism* (London: Macmillan, 1996), 90.

[30] Lance J. Sussman, "Reform Judaism," in *Encyclopedia of American Jewish History*, ed. Stephen H. Norwood and Eunice G. Pollack (Santa Barbara: ABC-CLIO, Inc., 2008), 74.

[31]Cohn-Sherbok, *Modern Judaism*, 89.

[32]Ibid., 92.

[33]Ibid., 102.

[34] Azriela Jaffe *Two Jews Can Still Be a Mixed Marriage: Reconciling Differences Over Judaism in Your Marriage*, 19.

[35] Segal, *Judaism: The Ebook*, 121.

[36] https: //www.tabletmag.com/sections/belief/articles/defining-open-orthodoxy, accessed on 17-5-2021.

[37] Azriela Jaffe *Two Jews Can Still Be a Mixed Marriage: Reconciling Differences Over Judaism in Your Marriage*, 18.

[38]خروج 16:13

[39]Cohn-Sherbok, *Modern Judaism*, 131.

آٹھواں باب: روحانی نظام

یہودی روحانیت کے ابتدائی مظاہر

روحانیت، باطنیت، سریت یا تصوف کی اصطلاحیں عموماً ایک ایسے مخفی نظام کو بیان کرنے کے لیے استعمال کی جاتی ہیں جو مادی دنیا سے مختلف ہوتے ہوئے بھی اپنا تعلق اس سے جوڑے رکھتا ہے۔ یہودیت کا روحانی نظام بھی کم و بیش انہیں صفات کا حامل ہے۔ خدا سے تعلق، تخلیقِ کائنات پر گفتگو اور مقدس کتب کے روحانی معانی کی تلاش ایک یہودی صوفی کا نصب العین ہے۔ یہودیت کے روحانی ادوار کو زمانی اعتبار سے چار حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:

باب ہشتم کے اہم نکات

1. یہودی روحانیت کا تعارف۔
2. حزقی ایل کے روحانی تجربات۔
3. مرکبہ یہودیت کا فروغ۔
4. حسیدی اشکناز کا تعارف۔
5. تخلیق کائنات کا بیان۔
6. صفر یتزیرا، بہیر اور زوہر کا بیان۔
7. قبالہ، اس کی ذیلی تحریکیں اور حسیدیت کا تعارف۔

1. بائیبل کا دور جس میں روحانی نظریات اور تحریکیں تو دکھائی نہیں دیتیں لیکن اس دور کے مذہبی تجربات نے بعد میں آنے والے صوفیا کو روحانیت سے روشناس کروایا۔
2. ہیکل کی دوسری تباہی کا دور جس میں ایسے روحانی نظریات وجود پانے لگے تھے جن کی بنیاد مذہب پر رکھنے کی کوشش کی جا رہی تھی۔
3. قبالہ کا دور جس میں منظم انداز میں روحانی تعلیمات کو بحیثیتِ مجموعی بیان کیا جا رہا تھا۔
4. حسیدی دور جس میں روحانیت سے نئے مذہبی محسوسات نے جنم لیا۔[1]

یہودی روحانیت میں زیادہ تر مذہبی تجربات کی کوئی عقلی توجیہ پیش کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی جاتی کیونکہ یہ خیال کیا جاتا ہے کہ ان تجربات تک عقل کی رسائی ممکن نہیں ہے۔ اس کا یہ مطلب بھی نہیں ہے کہ یہ تجربات عقلیت کی مخالفت کرتے ہیں، مثلاً کچھ ایسے صوفیا بھی گزرے ہیں جنہوں نے باقاعدہ عقلیت پسندی کو رواج دیا ہے۔ ان میں ابن میمون خاصے مشہور ہیں جنہیں ان کے فلسفیانہ طرز بیان کی وجہ سے "عقلی صوفی" کہا جاتا ہے۔ ابتدائی ربی ادب جسے اگادہ بھی کہا جاتا ہے، میں ان مذہبی تجربات کو جس طرح بیان کیا گیا ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ ان تجربات میں سریت کا عنصر بھی شامل ہوتا ہے۔ ان کو بیان سرگوشیوں میں کیا جاتا ہے تاکہ

بات صرف مخصوص لوگوں تک پہنچے۔اس کی وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ چونکہ یہ خدا کا ذکر ہے تو اس ذکر کو صرف ان لوگوں تک پہنچنا چاہیے جو حلیم اور خاموش الطبع ہوں، جو جلدی غصے میں نہ آتے ہوں، معتدل مزاج ہوں اور بدلہ لینے کی چاہت دبائے رکھنے پر قادر ہوں۔[2] اس لیے تمام یہودی روحانیت کو نہیں اپناتے۔ کچھ کو علمی طور پر اس قابل نہیں سمجھا جاتا کہ وہ روحانی علوم کو سمجھ سکیں اور کچھ ایسے ہیں جو ان علوم کی مخالفت کی وجہ سے ان سے دور ہی رہنا پسند کرتے ہیں۔

ابراہیمؑ کے روحانی تجربات

یہودی صوفیا روحانیت کو عبرانی بائیبل ہی کے ذریعے بیان کرنا پسند کرتے ہیں جس میں متعدد ایسے واقعات درج ہیں جو خدا اور انسان کے براہ راست تعلق پر دلالت کرتے ہیں۔ یہودیت کی ابتدا کی طرح یہودی روحانیت کے رسمی ابتدا کو بھی ابراہیمؑ سے جوڑا جاتا ہے جن کو دنیا میں خدا کا دیدار نصیب ہوتا رہا۔ اسحاقؑ کی قربانی کا واقعہ اس ضمن میں خاصا اہم ہے کیونکہ جہاں یہ واقعہ ابراہیمؑ و اسحاقؑ کے لیے آزمائش، صبر اور اعتماد خداوندی کی نوید تھا وہیں روحانی لحاظ سے بھی ان کے لیے برکات کا سبب تھا۔ اس واقعے کے متعلق عبرانی بائیبل میں بیان ہے کہ جب ابراہیمؑ اپنے بیٹے کو قربان کرنے لگے اور چھری ہاتھ میں پکڑ لی تو اس وقت جنت سے ایک فرشتے نے آواز دے کر انہیں روکا کہ وہ اپنے بیٹے کو قربان نہ کریں۔ آپؑ نے اسحاقؑ کی بجائے اسی جگہ ایک مینڈھے کو ذبح کیا۔ قربانی کے اس واقعے کی وجہ سے اس جگہ کا نام "یہوہ یری" پڑ گیا جس کا مطلب ہے کہ وہ جگہ جہاں خدا دیکھتا ہے۔ کتاب پیدائش اس حوالے سے بتاتی ہے کہ خدا کو اس جگہ دیکھا جا سکتا ہے۔[3] خدا کا دیدار، اس کی محبت اور برکات کا حصول، یہودی روحانیت کا مقصد اولی ہے لہذا روحانی اعتبار سے نہ صرف یہ واقعہ بلکہ قربانی کا مقام بھی یہودیوں کے لیے اہمیت کا حامل ہے۔ اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ عبرانی بائیبل کے مطابق اس مقام کو خود خدا نے قربانی کے لیے منتخب کیا تھا۔

حزقی ایل کے روحانی تجربات

ابراہیمؑ کے بعد بھی یہ سلسلہ جاری رہا اور دیگر انبیا، مثلاً یعقوبؑ، ایوبؑ اور موسیٰؑ کو بھی دنیا میں خدا کا دیدار ہوتا رہا۔ مختلف مذہبی تجربات جو اپنی نوعیت میں خاص تھے انبیا کے رہنما تھے۔ ان میں حزقی ایلؑ کا واقعہ یہودی صوفیا کے لیے خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔ آپؑ نے ایک دن

شمال سے آندھی اور بادل اٹھتے دیکھے جن میں جانداروں کے ہیولے نظر آرہے تھے جو تعداد میں چار تھے۔ رفتہ رفتہ جب منظر واضح ہوا تو آپ نے دیکھا کہ ان جانداروں کے چار پر اور چار چہرے تھے۔ ان کے پیچھے چار پہیے تھے جن کے حلقوں میں آنکھیں تھیں۔ جانداروں کے اوپر الٹے کٹورے جیسی کوئی چیز تھی جس پر ایک تخت رکھا ہوا تھا۔ اس تخت پر انسان کی مانند کوئی سوار تھا جس کے چاروں طرف روشنی پھوٹ رہی تھی۔ اس سوار کا جلوہ خدا کے جلوے کی طرح تھا اور آواز میں خدا کی آواز جیسی گرج تھی[4] حزقی ایلؑ نے انہیں خدا کے طور پر پہچانا۔ خدا نے انہیں ایک طومار کھانے کو دیا اور بنی اسرائیل کو تنبیہ کا حکم دیا کہ اگر وہ توبہ نہیں کریں گے اور خدا کی بات نہیں مانیں گے تو ہزیمت اٹھائیں گے۔

مرکبہ روحانیت

حزقی ایل کے روحانی تجربے میں جن مخصوص جانداروں اور پہیوں کا ذکر ہے انہیں بیان کرنے کے لیے مرکبہ / مرکوہ کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے جس کا مطلب رتھ یا تاج ہے۔ اس وجہ سے یہودی یہ خیال کرتے ہیں کہ حزقی ایلؑ نے جو رتھ دیکھا تھا وہ خدا کا رتھ تھا اور اس کا سوار خدا خود تھا۔ اسی قسم کا ایک واقعہ ابراہیمؑ کی نسبت سے بھی بیان کیا جاتا ہے کہ انہیں بھی اسی قسم کا رتھ اور تاج نظر آیا تھا۔[5] ان واقعات کو بنیاد بنا کر پہلی صدی عیسوی کے یہودیوں میں مرکبہ روحانیت کی تحریک مستحکم ہونے لگی جو زیادہ تر فلسطین، بابل اور مصر میں پھیلی۔ جیسا کے ساتویں باب میں بیان کیا جا چکا ہے کہ اسینی اور تھراپیٹی یہودی فرقے اس دور میں اس قدر منظم ہو چکے تھے کہ مؤرخین کو ان کا باقاعدہ ذکر کرنے کی ضرورت محسوس ہونے لگی۔ اس دور کے فریسیوں میں بھی روحانی موضوعات پر خفیہ گفتگو ہوتی تھی جس میں زیادہ تر تخلیقِ کائنات اور حزقی ایلؑ کے روحانی تجربہ کے واقعات زیر بحث ہوتے۔[6] اس لیے یہ کہا جا سکتا ہے پہلی صدی عیسوی کا یہ دور یہودی روحانیت کو نئے معنی عطا کر رہا تھا۔ تلمود بھی اس دور کے متعلق روحانیت سے وابستہ بحثیں تخلیق کرتی رہی جو کبھی اس کے حق میں ہوتی ہیں اور کبھی مخالف۔ بعض مصنفین اس کی توجیہ یہ بیان کرتے ہیں کہ روحانیت کی مخالفت اس لیے کی جاتی تھی کہ ان امور کو مخفی رکھا جانا مقصود تھا۔[7] اس معاملے میں مشنا بتاتی ہے:

کسی کو ممنوعہ جنسی تعلقات کے موضوعات تین یا تین سے زائد افراد کے سامنے بیان نہیں کرنے

چاہیں؛ نہ ہی کسی کو تخلیق کا معاملہ اور دنیا کی ابتدا کے رازوں سے دو یا دو سے زائد افراد کو آگاہ کرنا چاہیے؛ نہ ہی کسی فردِ واحد کو خدائی رتھ کی نوعیت سے آگاہ کرنا ہے جو کہ خدا کے دنیا کو چلانے سے متعلق روحانی علم ہے، یہاں تک کہ وہ خود دانا ہو اور بیشتر امور خود ہی سمجھ لے۔[8]

اس دور کے یہودی صوفیا کی یہ خواہش ہوتی تھی کہ وہ مرکبہ کی تلاش اور سواری کر کے جنتوں تک پہنچ سکیں۔ پہلی اور دوسری صدی عیسوی کے ایسے صوفیا کے متعلق بیان کیا جاتا ہے جن کی روحیں عارضی طور پر دنیا چھوڑ کر جنتوں کا سفر کرتیں۔ ایسے لوگوں کو "مرکبہ کے سوار" کہا جاتا تھا۔ یہ سوار جنتوں میں بنے مختلف قصروں یا محلوں تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش کرتے۔ ان کا مخصوص ہدف خدا کا تاج ہوتا جو کہ قصرِ ہفتم کی زینت تھا۔ اس تاج تک پہنچنے کے لیے مرکبہ کے سواروں کو مختلف قصروں تک رسائی حاصل کرنی ہوتی جس کے لیے مخصوص روحانی قوتیں درکار ہوتیں۔ ایک قصر سے دوسرے قصر کا سفر پہلے سفر سے پُر خطر اور مشکل ہوتا۔ اس خطرے کو ان قصروں کے محافظ فرشتوں کی صورت میں بیان کیا گیا ہے جو اس تاک میں ہوتے کہ ایسے انسانوں کو ان قصروں میں جانے سے روکے رکھیں جو روحانی طور پر ابھی اس قابل نہیں ہوئے۔ ہر قصر میں داخل ہونے کے لیے تصدیق کا عمل ضروری تھا۔ عموماً تصدیق کا عمل اس قصر کے نگران فرشتے کا نام لینے سے مکمل ہو جاتا۔ تصدیق مکمل ہونے کے بعد وہ فرشتہ، سوار کا اتحادی بن جاتا اور اگلے قصر تک اس کی رسائی کے لیے مدد فراہم کرتا تاکہ وہ خدا کے تاج تک پہنچ سکے۔[9] اس تاج کی چاہت کی نسبت سے یہودیت کے ابتدائی روحانی نظام کو "تاج پر مبنی روحانیت" کہا گیا اور قصروں کی نسبت سے اس موضوع پر لکھی جانے والی کتب کو "ادب القصور" کا نام دیا گیا۔ یہودی صوفیا کو مرکبہ کی صورت میں ایک ایسا راستہ ہاتھ آگیا تھا جو ان کے لیے خدا کی قربت کا سبب تھا۔ یہ لوگ اخلاقی اقدار کی پیروی اور مخصوص عبادات جیسے روزہ اور طہارت وغیرہ کا اہتمام کرتے، خدا کے ناموں کا ورد کرتے یا مذہبی گیتوں کے ذریعے اپنی منزل کے حصول میں مگن رہتے۔[10]

تخلیق اور صفروت

صفر عبرانی زبان کا لفظ ہے جس کا مطلب فیض لیا جا سکتا ہے۔ یہودی روحانیت میں صفرِوت سے مراد وہ دس نورانی صفات ہیں جن کے ذریعے خدا اپنا ظہور کرتا ہے اور روحانی و مادی

دنیا کو تخلیق کرتا ہے۔ مرکبہ ہی کی طرح کا ایک اور گروہ بھی موجود تھا جو تخلیقِ کائنات کے روحانی عوامل کی تلاش میں سر گرداں تھا۔ اس موضوع پر ایک مشہور تصنیف **صفر یتزیرا** یعنی **کتابِ تخلیق** ہے جو غالباً دوسری صدی عیسوی میں لکھی گئی۔ اس کی ایک خاصیت اس کا اختصار ہے۔ یہاں تک کہ اس کے جامع ترین نسخوں میں بھی سولہ سو سے زائد الفاظ نہیں ہیں۔ اس کا طرزِ تحریر اور اصطلاحات کا استعمال اس بات کا شاہد ہے کہ اس کتاب کا تعلق مرکبہ سے بھی ہے۔ [11] نویں صدی عیسوی میں بھی یہ کتاب خاصی مشہور تھی کیونکہ اس دور کے مشہور یہودی فلسفی، سعدیا گاون کی لکھی اس کتاب کی ایک شرح بھی دریافت ہوئی ہے۔ **کتابِ تخلیق** کے مطابق خدا نے دنیا کی تخلیق، حکمت کے بتیس پوشیدہ راستوں کے ذریعے کی جن میں سے بائیس عبرانی حروف تہجی ہیں جبکہ دس صفروت ہیں۔ ان درج ذیل حروف کی تین قسمیں ہیں جن کی مختلف ترتیبوں کے ذریعے دنیا کی ہر چیز کی تخلیق کی گئی:

1. ا، م اور ش کو امہات حروف سمجھا جاتا ہے جن سے بالترتیب تین عناصر اصلیہ ہوا، پانی اور آگ کی تخلیق کی گئی۔ انسانی جسم میں سر کو آگ، سینے کو ہوا اور پیٹ کو پانی سے بنایا گیا۔
2. اس کے علاوہ عبرانی میں سات دوہرے حروف ہیں جن میں ب، ج، د، ک، ف، ر اور ط شامل ہیں۔ یہ دوہرے حروف ایسی چیزوں کو ظاہر کرتے ہیں جو ایک دوسرے کے عکس ہیں جیسے دو آنکھیں یا دو کان وغیرہ۔
3. تیسری قسم میں بارہ حروف ہیں جن میں ہ، و، ز، خ، ت، ی، ل، ن، س (اردو میں اس حرف کا متبادل موجود نہیں۔ قریب ترین حرف "س" ہے)، ع، ص اور ق شامل ہیں۔ یہ حروف انسانی حواس و احساسات کا اظہار ہیں جن میں دیکھنا، سننا، سونگھنا، بولنا، کھانے کی طلب، تولید کی خواہش، حرکت، غصہ، خوشی، سوچ، نیند اور کام شامل ہیں۔ یہ بارہ حروف راس چکر یا منطقۃ البروج کے بارہ آثار، بارہ مہینوں اور انسانی ڈھانچے کے بارہ حصوں کا بھی اظہار ہیں۔

یہودیوں کا ماننا ہے کہ خدا نے ہر حرف کے تین طرح کے معنی ظاہر کیے جن میں سے ایک انسانوں کی دنیا، دوسرا ستاروں اور سیاروں کی دنیا اور تیسرا وقت کے متعلق ہے جس کا اظہار سال کے گزرنے کے ذریعے ہوتا ہے۔

دس صفروت میں سب سے پہلا صفر خدا کی روح، دوسرا ہوا، تیسرا پانی اور چوتھا آگ کو

ظاہر کرتا ہے۔ بقیہ بچ جانے والے چھ صفروت چھ سمتوں کو ظاہر کرتے ہیں جن میں شمال، جنوب، مشرق، مغرب، بلندی اور گہرائی شامل ہیں۔ اس نظریہ کے مطابق یہ دس صفروت وہ قالب ہیں جن میں تمام مخلوقات ابتدا میں ڈھالی گئیں۔ اس لیے یہ مادی جسم نہیں بلکہ ہئیت کی تشکیل کرتے ہیں۔ جو ظاہری دنیا ہمارے سامنے ہے یہ صفروت کے اظہار کا نتیجہ ہے جبکہ مادے کی تشکیل بائیس حروف کے ذریعے ہوتی ہے۔ اس نظریہ کے تحت کائنات کی ہر شے پر خدا چھایا ہوا ہے۔ وہ مادے اور ہئیت کی اصل یا حقیقی وجہ ہے۔ کچھ بھی اس سے باہر نہیں ہے۔[12] یہودیت میں روایتی طور پر یہ مانا جاتا ہے کہ کائنات کی تخلیق لفظ "خدا" کے ذریعے ہوئی ہے۔ اس لحاظ سے روحانیت کی یہ تحریک اسی تصور کی وضاحت ہے۔ چونکہ یہودیت میں عبرانی مقدس زبان ہے اس لیے تخلیق کی زبان بھی اسے ہی مانا گیا ہے۔ ان تخلیقی عناصر اور اعداد ہی کے ذریعے نئے روحانی معنی اور راستوں کی تلاش متاخرین صوفیا کا بھی مقصد بن گیا۔ عصر حاضر کی مروجہ روحانی تحریکوں میں بھی انہیں کو بنیاد بنایا جاتا ہے۔ قبالہ جیسی مشہور روحانی تحریک میں تو صفروت کے ذریعے ہی خدا کی صفات کی تجسیم کی توقع کی جاتی ہے۔

حسیدی اشکناز

حسیدی اشنکاز یعنی "جرمنی کے نیک لوگ" وہ یہودی تھے جو بارہویں اور تیرہویں صدی عیسوی میں روحانیت کے فروغ کا سبب بنے۔ یہ لوگ ادب القصور، **کتاب تخلیق** اور سعدیا گون جیسے فلسفیوں اور نوافلاطونی مصنفین کی کتب کا مطالعہ کر کے یورپ میں یہودی روحانیت کے علمبردار بنے۔ تیرہویں صدی کے دوسرے حصے میں اس تحریک نے اس قدر قبولیت حاصل کی کہ سپینی قبالہ کو بھی اس کا گہرا اثر قبول کرنا پڑا۔ خود ان کے متعلق خیال کیا جاتا ہے کہ یہ مرکبہ روحانیت سے متاثر تھے۔[13] یہ ضرور ہے کہ ان میں تصورات کی وسعت مرکبہ سے زیادہ تھی، مثلاً مرکبہ میں جو تاجِ خدا کا تصور فروغ پایا یہ اس سے بھی آگے نکلتے ہوئے خدا کے ساتھ ایک ہونے کی کوشش کرتے۔ اس طرح یہ نہ صرف مرکبہ کے تصورات کو اپنا لیتے بلکہ ان تصورات میں نئی جدت بھی پیدا کرنے کی کوشش کرتے۔ اس تحریک کے تین بڑوں کا تعلق اٹلی کے مشہور کلونیمس خاندان سے تھا جو بعد ازاں جرمنی میں آباد ہوا۔ ان بڑوں کا مختصر تعارف ذیل میں درج ہے:

1. سموئیل بن کلونیمس (1120-1175) جنہیں سموئیل حسیدی بھی کہا جاتا ہے۔ انہوں نے بطور مفسرِ تلمود، شاعر اور فلسفی شہرت پائی۔ انہیں پہلا حسیدی اشکناز سمجھا جاتا ہے۔
2. یہودا بن سموئیل (1150-1217) جو سموئیل حسیدی کے بیٹے تھے۔ انہیں یہودا حسیدی یا یہودا ابن کلونیمس بھی کہا جاتا ہے۔ انہوں نے **صفر حسیدم یعنی نیکوکاروں کی کتاب** لکھی جو حسیدی اشکناز کی بنیادی کتاب ہے۔
3. علیزر بن یہودا (1176-1238) جنہوں نے **کتاب سر الاسرار** مرتب کی۔ یہ یہودا بن سموئیل کے بیٹے یا رشتہ دار تھے۔ انہیں حسیدی اشکناز کا آخری اہم رکن تصور کیا جاتا ہے۔

حسیدی اشکناز خدا کی مرضی کے سامنے سر جھکانے والے تھے جس کا بنیادی اظہار ان کی عبادات سے ہوتا جن میں علم الاعداد اور سحر کا استعمال بھی کیا جاتا رہا۔ ان کا خیال تھا کہ عبادات خدا کی رفاقت کا بہترین ذریعہ ہیں۔ یہ انسان اور خدا کے درمیان فاصلے ختم کر دیتی ہیں۔ توریت میں یعقوبؑ کے حوالے سے ایک واقعہ درج ہے کہ جب وہ حاران جا رہے تھے تو راستے میں رات ہو گئی۔ وہ رات گزارنے کے لیے کسی نامعلوم جگہ پر چلے گئے اور ایک پتھر پر سر رکھ کر سو گئے۔ انہوں نے خواب میں دیکھا کہ ایک سیڑھی زمین سے آسمان کی طرف لگی ہوئی ہے جس کے ذریعے فرشتے اوپر نیچے آ جا رہے ہیں۔ سیڑھی کے ایک سرے پر خدا موجود ہے۔[14] اس واقعہ کو بنیاد بناتے ہوئے حسیدی اشکناز یہ سمجھتے ہیں کہ عبادت بھی یعقوبؑ کے خواب کی سیڑھی ہے جو اپنے کرنے والے کو خدا کے قریب لے جاتی ہیں۔

ان کے نزدیک خدا کو عقل کے ذریعے نہیں سمجھا جا سکتا۔ اس وجہ سے توریت یا دیگر یہودی مقدس کتب میں خدا کا جو جسمانی تصور بیان کیا گیا ہے وہ "کوود" یعنی نور الہی ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ توریت میں خدا کے چہرے، ہاتھ یا انگلیوں کا جو ذکر ہے اس سے خدا کا نورانی پیکر مراد ہے۔ خدا کا جو ظہور نبیوں یا ولیوں کے سامنے مختلف انداز میں ہوا وہ بھی اس کا نور تھا نہ کہ جسم۔ اس لیے خدا کے نور کا دیدار اور قربت کسی یہودی صوفی کا مقصدِ اول ہونا چاہیے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے یہ مختلف عبادات کرتے، عاجزی اختیار کرتے، بے عزتی اور خجالت کو فخر سمجھتے، خود کو تکالیف دیتے اور جذبہ ایثار کو فروغ دینے کی کوشش کرتے۔ ان کے نزدیک شہادت خدا کی رفاقت کا اہم ترین ذریعہ تھا۔[15] جس دور میں یہ زندگی گزار رہے تھے وہاں

شہادت کے مواقع بھی بہت تھے۔اسفاردی یہودیوں کے برعکس اشکنازیوں کا یہ خیال تھا کہ اگر کسی یہودی کا مذہب زبردستی تبدیل کروایا جارہا ہو تو اسے خودکشی کرلینی چاہیے۔ یہ خودکشی اس کی شہادت ہو گی۔ جیسا کہ تیسرے باب میں بیان کیا جا چکا ہے کہ یورپ اور بطور خاص جرمنی میں یہودیوں کو سامی مخالفت کا بہت زیادہ سامنا کرنا پڑا۔ زبردستی ان کے مذہب تبدیل کروانا ایک عام بات تھی۔ لہذا حسیدیوں کے لیے شہادت کے وافر مواقع موجود تھے۔

قبالہ

قبالہ کا مطلب "حاصل شدہ" یا "روایت" ہے۔ بارہویں صدی عیسوی میں رواج پانے والی اس روحانی تحریک کو اس قدر قبولیت حاصل ہوئی کہ قبالہ کا بیان ہی یہودی روحانیت کا بیان سمجھا جانے لگا۔ وسیع تر معنوں میں اگر کہا جائے تو ہیکل کی دوسری تباہی کے بعد معرض وجود میں آنے والی مختلف یہودی روحانی تحریکوں کی نمائندگی بھی قبالہ ہی کے ذریعہ ہوتی رہی ہے۔[16] سریت، باطنیت، تخلیق اور خدا تک بلا واسطہ رسائی کے عناصر پر مبنی اس تحریک کی تعلیمات، ابتدا میں استاد سے شاگرد تک سینہ بہ سینہ منتقل ہوتی رہیں۔ تیرہویں صدی کے آغاز میں جنوبی فرانس اور شمالی سپین میں حسیدی اشکناز اور اسلامی تصوف سے متاثر ہو کر قبالہ کے مختلف مکاتب فکر بنے جنھوں نے اپنے اپنے انداز میں قبالہ کی تعلیمات کو فروغ دیا جن پر دیگر مذاہب، مثلاً اسلام اور ہندومت وغیرہ کے اثرات بھی نمایاں ہیں۔ ان مکاتبِ فکر نے باطنی اور تھیوصوفیانہ طرز کی روایات کو فروغ دیا۔ بہت سے قبالیین اس تاریخی ارتقا کی تردید کرتے ہیں۔ وہ قبالہ کی ابتدا کو تخلیق آدم کے ذریعے بیان کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ یہ روحانی تعلیمات وحی الٰہی کے ذریعے ان تک پہنچیں۔ موسیٰؑ سے جو زبانی قانون سینہ بہ سینہ منتقل ہوا، قبالہ کی تعلیمات اسی قانون کا ایک حصہ تھیں۔ یہ تعلیمات اپنی نوعیت میں مکمل ہیں جن کو کسی قسم کے ارتقا کی ضرورت نہیں ہے۔ البتہ ضرورت کے تحت خدا بار بار انہیں وحی کے ذریعے نازل کرتا رہا ہے۔

بہیر اور قبالہ کی ترویج

صفر ہا بہیر یعنی **کتاب تجلی** کی اشاعت نے قبالہ کی مختلف تشریحات کو رواج دینے میں بنیادی کردار ادا کیا۔ ساٹھ پیراگرافوں پر مبنی یہ تصنیف، کتاب پیدائش کی ایک روحانی یا علامتی

شرح ہے جو اپنی نوعیت میں استاد اور شاگرد کے مکالمات ہیں۔ اس کتاب کا بنیادی مقصد عبرانی حروف کی ساخت اور صوتیات کی وضاحت ہے۔ اس کے مصنف یا مصنفین کے بارے میں معلومات مفقود ہیں۔ قبالیین یہ سمجھتے ہیں کہ پہلی صدی عیسوی سے یہ کتاب زبانی، سینہ بہ سینہ منتقل ہوتی رہی یہاں تک بارہویں صدی عیسوی میں اسے کتابی شکل دے دی گئی۔ **بہیر** نے **کتاب تخلیق** میں بیان کردہ صفروت کے نئے تصورات پیش کیے۔ اس کے مطابق، صفروت وہ تاج یا الفاظ ہیں جن سے الٰہی قلمرو کی ساخت تشکیل پاتی ہے۔ بعض محققین کے مطابق مشہور فرانسیسی ربی، اسحاق سگی نہور (1160-1235) جنہیں اسحاق نابینا بھی کہا جاتا ہے، نے **بہیر** سے متاثر ہو کر یہ خیال پیش کیا کہ صفروت، ربوبیت کی مخفی جہت کا اظہار ہیں۔[17] قبالیین میں "عین سوف" یعنی "لا محدود" کی ایک اصطلاح استعمال ہوتی ہے۔ اسے خدا کی بنیادی حالت سمجھا جاتا ہے یعنی خدا کی وہ روحانی حالت جو مخلوقات سے تعلق سے پہلے تھی۔ عین یعنی "لا" تخلیق سے پہلے تھا۔ اس کو بطور "کلٗ" اپنی قدرت کا اس وقت پتہ چلا جب اس نے حادث یا "محدود" دنیاؤں کو تخلیق کیا۔ اسحاق نابینا نے یہ استدلال کیا کہ عین سوف کے پہلے صفر کا اظہار "فکر الٰہی" کی صورت میں ہوا جس سے بعد میں بقیہ صفروت تشکیل پائے۔ یہ ایک طرح سے کائنات کی تخلیق کی وضاحت بھی تھی اور یہودی صوفیا کے لیے مقاصد کا تعین بھی۔ بعد میں آنے والے صوفیا نے اس تصور کی ارتقائی شکلیں پیش کیں۔ اس ارتقا نے فکر الٰہی کے تصور کو "مشیت الٰہی" سے بدل دیا۔

نبوی قبالہ

نبوی قبالہ کو قبالہ ہی کا ایک ذیلی مکتبہ فکر سمجھا جا سکتا ہے جس کو مشہور ہسپانوی صوفی ابراہیم ابو العفیا (1240-1291) نے رواج دیا۔ اس کے دعوی نبوت، ربیائی ادب سے دوری اور نوافلاطونی فلسفہ کی حمایت کی وجہ سے ربیوں کے حلقوں میں اسے زیادہ پسند نہیں کیا گیا۔ وہ خود ابن میمون کے فلسفہ کا اس قدر شائق تھا کہ اس کی مشہور زمانہ تصنیف **دلالۃ الحائرین** پر اس نے تین شروحات قلمبند کیں۔ **کتابِ تخلیق** پر اس کی ایک شرح کو علمی حلقوں میں بہت پذیرائی حاصل ہوئی۔ کہا جاتا ہے کہ اس نے قبالہ کے موضوع پر چھبیس کتابیں لکھیں اور مشرق قریب، اٹلی اور سسلی سمیت کئی مقامات کا سفر کیا۔ اس نے یہودی روحانیت اور جادو سے متعلق

موضوعات کا عمیق مطالعہ کیا اور "نبوی قبالہ" کے نام سے ایک روحانی جماعت کی بنیاد رکھی جس کا بنیادی مقصد انسان کو خدا کا شعور دلانا تھا۔

عبرانی حروف تہجی کو خصوصی اہمیت دیتے ہوئے اس نے ایک نئے طرز کے مراقبہ کو فروغ دیا جس میں اسم خدا پر توجہ کے ذریعے روح کو عالم محسوسات سے آزاد کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ وہ سمجھتا تھا جب روح کو آزاد کر دیا جاتا ہے تو وہ اپنے اصل کی طرف لوٹتی ہے۔ روح کچھ رکاوٹوں میں گھری ہوئی ہے جو اس کو فطرتی انسانی حدود یعنی دنیاوی چیزوں تک محدود کرتی ہیں اور الٰہی عناصر جو اس کے نیچے یا ارد گرد موجود ہیں، کی زد میں آنے سے بچاتی ہیں۔ اس وقت انسان اپنے تراشیدہ احساسات اور جذبات تک محدود ہو کر رہ جاتا ہے۔ وہ اپنے دنیاوی اعمال کی تکمیل تو کر لیتا ہے لیکن خدا کا ادراک نہیں کر پاتا۔ جب تک وہ ان حدود میں ہے اس کی رسائی روحانی موجودات تک نہیں ہو سکتی۔ لہذا کوئی ایسا طریقہ کار تلاش کرنا ہو گا جو اسے فطرتی انسانی حدود سے آگے اس طرح رسائی دے سکے کہ اسے نور خدا کی شدت سے کوئی نقصان بھی نہ پہنچے۔ ایسا صرف اس وقت ہو سکتا ہے جب انسان خود کو خود سے خالی کر دے۔ اگر وہ خود کو خود سے ہی بھرلے گا تو وہ خدا کے لیے جگہ نہیں بنا پائے گا۔[18] اس کا بتایا ہو مراقبہ جس پر ہندوستانی یوگا کے نمایاں اثرات تھے، اس کے پیروکاروں کے لیے وہ طریقہ کار تھا جس سے ذہن فطرتی اشیا سے منہ موڑ کر اسم الٰہی میں مستغرق ہونے لگتا ہے۔ اس سے درجہ بہ درجہ اس کی راہ میں حائل رکاوٹیں دور ہوتی ہیں اور وہ نور الٰہی کی شدت سہنے کے قابل ہونے لگتا ہے۔

اس کا خیال تھا اس طرح نبیوں کی سی بصیرت کا حصول ممکن تھا۔ دوسرے لفظوں میں خدا سے محبت کا جو راستہ وہ بیان کرتا ہے وہ انسان کو نبوت کی طرف لے جاتا ہے۔[19] وہ روحانیت میں جادو کی بجائے فلسفیانہ نقطہ نظر اپنانے کا قائل تھا۔ ابن میمون سے بہت متاثر تھا اور سمجھتا تھا کہ جو تشریحات وہ بیان کر رہا ہے وہ ابن میمون کے فلسفے کا تسلسل ہیں۔ اس بنیاد پر وہ کہتا تھا کہ ابن میمون کے فلسفے اور روحانیت میں کوئی تضاد نہیں ہے۔

زوہر و صفروت کی نئی تشریحات

جیسا کہ تیسرے باب میں بیان ہو چکا ہے کہ **زوہر** عبرانی بائبل کی ایسی روحانی تشریحات کا مجموعہ ہے جسے یہودی روحانیات یا قبالہ کی بنیاد مانا جاتا ہے۔ **زوہر** کے مصنف یا مرتب کنندہ کے

بارے میں محققین کی رائے میں اختلاف ہے۔ عموماً یہ سمجھا جاتا رہا کہ اس کے مصنف دوسری صدی کے ایک یہودی بزرگ شمعون باریوحائی تھے لیکن عصرِ حاضر کے زیادہ تر محققین یہ سمجھتے ہیں کہ اس کے مصنف ایک سپینی عالم موسی دے لیون (1240-1305) تھے۔ **زوہر** توریت کے لفظی معنی کی بجائے روحانی یا علامتی معنی کے ذریعے تفسیر کی کوشش ہے۔ اس موضوع پر لکھی گئی دیگر کتابوں میں اس کی حیثیت ستاروں کے جھرمٹ میں چاند کی مانند ہے۔ جس قدر مقبولیت اس کتاب کو ملی ہے شاید ہی اس موضوع پر لکھی گئی کوئی دوسری کتاب شہرت کی یہ بلندی چھو سکی ہو۔ تلمود کے بعد یہ وہ واحد کتاب ہے جسے یہودی فہرست مسلمہ میں شامل کیا گیا ہے اور ایک وقت ایسا بھی تھا کہ اسے عبرانی بائبل اور تلمود کے ہم پلہ سمجھا جاتا تھا۔[20]

کتابِ تخلیق جس نے صفروت کی عددی اہمیت کی طرف توجہ دلائی تھی، کے برعکس **زوہر** انہیں درجات کے طور پر بیان کرتی ہے۔ یہ درجے تخلیقی طاقت اور الٰہی مظہر کا اظہار ہیں۔ ربوبیت کی پوشیدہ گہرائیوں سے صفروت کا اظہار شعلے کی مانند ہوتا ہے۔ صفروت اوپر سے نیچے کی طرف پے درپے جاری ہوتے ہیں اور تخلیق کے عمل میں حصہ ڈالتے ہیں۔ ان کو سمجھنا قدرے دشوار ہے کیونکہ ہر ایک صفر کے متعدد معنی اور درجے ہیں جن کی وجہ سے ان کے بیان میں اختلاف ایک عام سی بات ہے، مثلاً یہ کہ صفروت عین سوف کے وہ اسما بھی ہیں جن کے ساتھ اس نے خود کو موسوم کیا، یہ اس کی مخفی طرز زندگی اور انسان کے روبرو اس کے اظہار کے نمائندہ بھی ہیں، یہ دس کے دس مل کر خدا کا عظیم ترین نام یہوہ بھی بناتے ہیں اور انہیں خدا کا چہرہ، اس کی پوشاک اور اس کا درخت بھی کہا جاتا ہے۔ اپنے آپ میں یہ "اتحاد کی دنیا" بھی تخلیق کرتے ہیں جو ان چار ان دیکھی دنیاؤں میں سے ایک ہے جو عین سوف اور "علیحدگی کی دنیا" کے مابین ہیں۔ علیحدگی کی دنیا وہ جگہ ہے جہاں انسان رہتا ہے۔[21] زیادہ تر صفروت کے ساتھ بائبل میں مذکور کسی شخصیت کو منسلک کیا جاتا ہے۔ ان شخصیات کے ذریعہ صفروت اور صفروت کے ذریعہ ان شخصیات کو سمجھنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ مجموعی طور پر یہ صفروت اس بات کا اظہار ہیں کہ کس طرح ایک غیر منقسم، لامحدود اور ناقابل فہم خدا ایک محدود دنیا کے تمام عوامل میں کارفرما ہے۔

ان صفروت کے نام، عمومی ترتیب اور مختصر تعارف ذیل میں درج کیا جا رہا ہے:

1. کیتیر یعنی تاج جس کو عین سوف سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔ یہ نقطہ آغاز ہے جس کی کوئی

وضاحت پیش نہیں کی جاسکتی۔ یہ مشیت الہی اور ہر مسرت و شادمانی کا ماخذ ہے۔اس میں وہ تمام طاقتیں موجود ہیں جو روح کو متحرک کرتی ہیں۔

2. خوخمہ یعنی حکمت جس میں تمام اشیا کا بنیادی اور حقیقی تصور موجود ہے۔ یہ تخلیقی قوت سے مالا مال ہے۔

3. بیناہ یعنی فہم یا ذکاوت۔ یہ ذہن کی تجزیاتی اور ترکیبی طاقت ہے جو منطقی تجزیے میں مددگار ہے۔اسے ان ہئیتوں کا مجموعہ بھی کہا جاتا ہے جو خدا کے ذہن میں موجود ہیں۔اس کے علاوہ اسے نسوانیت کے ساتھ بھی جوڑا جاتا ہے اور ایسی طاقت کے طور پر بھی بیان کیا جاتا ہے جس سے توبہ کی توفیق ملتی ہے۔

4. خیسید یعنی محبت۔اس کے ذریعے خدا کے رحم کا اظہار ہوتا ہے۔اسے محبت کا ماخذ بھی سمجھا جاتا ہے۔خیسید کے ساتھ ابراہیمؑ کی شخصیت منسلک کی جاتی ہے۔

5. دِن یعنی قوت خداوندی جس کے ذریعے وہ سزا یا جزا دیتا ہے۔اس لحاظ سے دن کو عدل کی طاقت بھی کہا جاسکتا ہے۔اس صفر کے ساتھ اسحاقؑ کی شخصیت منسلک ہے۔

6. رحیم یعنی رحمت جسے قوت جاذبہ و دافعہ کا توازن سمجھا جاتا ہے۔اس کی جگہ "تیفیریت" یعنی خوبصورتی کو بھی بطور صفر بیان کیا جاتا ہے۔اس صفر کے ساتھ یعقوبؑ کی شخصیت منسلک کی جاتی ہے۔

7. نیتسَخ یعنی غیر متزلزل استقلال جو فتح اور غلبہ کا ماخذ ہے۔ یہ کام کی تکمیل کا حوصلہ بھی ہے۔ اس صفر کے ساتھ موسیٰؑ کی شخصیت منسلک کی جاتی ہے۔

8. ہود یعنی عظمت خداوندی جو عاجزی کا ماخذ ہے۔اس صفر کے ساتھ ہودؑ اور ہارونؑ کی شخصیت منسلک کی جاتی ہے۔

9. یسود یعنی بنیاد جو کہ خدا کی تمام طاقتوں کی اساس ہے۔ یہ کائنات کو استحکام بخشتی ہے، ایک چیز سے دوسری چیز یا ایک حالت سے دوسری حالت میں جانے کا ذریعہ ہے اور دوسروں کے ساتھ تعلق اور پہچان کا سبب ہے۔اس صفر کے ساتھ یوسفؑ کی شخصیت منسلک ہے۔

ملکوت یعنی مملکت جو تمام صفروت کو ہم آہنگ اور جوڑے رکھتا ہے۔اس صفر کے ساتھ داؤدؑ کی شخصیت منسلک ہے۔اسے سکینہ بھی کہا جاتا ہے جو کہ خدا کی دنیا میں موجودگی کا اظہار ہے۔زوہر

میں سکینہ ایک نسوانی ذات ہے جسے خدا کی بیٹی یا دلہن کے طور پر بھی بیان کیا جاتا ہے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ تمام صفروت خدا اور سکینہ کے ملاپ سے وجود میں آئے اور یہی تمام اسرائیلیوں کی ماں ہے۔[22]

ان صفروت کی تین تین کی تین تکڑیاں بنائی گئیں ہیں۔ پہلی تکڑی میں پہلے تین صفروت شامل ہیں جو خدا کی اندرونی ساخت کا فکری دائرہ تشکیل دیتے ہیں۔ دوسری تکڑی میں اگلے تین صفروت شامل ہیں جو ربوبیت کی نفسیاتی یا اخلاقی سطح سے ہیں۔ آخری تکڑی میں اگلے تین صفروت شامل ہیں جو خاص فطری یا قدرتی طاقتوں کی نمائندگی کرتے ہیں۔ آخری صفر یعنی ملکوت، اعلی اور ادنی دنیاؤں میں واسطے کا کام دیتا ہے۔ ان تمام صفروت کو ایک درخت کے اعتبار سے بھی بیان کیا جاتا ہے جو اوپر سے نیچے کی طرف آرہا ہے۔ اس کی جڑ پہلا صفر، کتیر ہے جس سے دیگر صفروت نکلتے ہیں جو اس درخت کے تنے اور شاخوں کو تشکیل دیتے ہیں۔[23] اس کے علاوہ اسے آدم قدمون کے طور پر بھی بیان کیا جاتا ہے جو کہ یہودی روایات میں "ابتدائی انسان" کو کہتے ہیں۔ اپنی صفات میں یہ انسان کامل ہے لیکن یہ آدمؑ نہیں ہے۔ آدم قدمون کی ایک شبیہ جس میں مختلف صفروت کی اہمیت واضح کی گئی ہے تصویر نمبر 1 میں دیکھی جاسکتی ہے۔

ابوالعفیا نے مراقبہ کو رواج دے کر قبالیین میں وجد کو فروغ دیا تھا جبکہ زوہر میں زیادہ تر خدا کے ساتھ ایک ہو جانے پر زور دیا گیا ہے۔ خدا کے ساتھ ایک ہو جانے سے انسان اور خدا کے درمیان فاصلے ختم نہیں ہوتے بلکہ اس سے روح اور اس کے ماخذ کی یکتائی کا تصور کیا جاتا ہے۔ اس کے لیے عبرانی اصطلاح "ذوَیکوت" استعمال کی جاتی۔ یہودی صوفیا اس اصطلاح کے متعدد معانی بیان کرتے ہیں۔ کبھی اسے قرب خداوندی کے طور پر بیان کیا گیا ہے اور کبھی اس سے ایک ایسی حالت مراد لی گئی ہے جس میں انسان کسی وقت بھی خدا کے ذکر اور اس کی محبت سے غافل نہیں ہوتا۔ خدا سے محبت کا عملی اظہار اس کی عبادت ہے۔ لہٰذا **زوہر** میں عبادت کا شوق دلانے کا یہ عالم ہے کہ یہاں تک کہا گیا ہے کہ کوئی بھی شخص جب عبادت محبت سے کرتا ہے تو اس کے اور خدا کے درمیان پردے اٹھ جاتے ہیں۔ **زوہر** نے روح کے تناسخ کے ایک عقیدے **"گِلگُل"** کو بھی یہودیوں میں فروغ دیا۔ ہیکل کی دوسری تباہی کے دور کے بعد تک یہ عقیدہ یہودیوں میں موجود نہیں تھا۔ تلمود میں بھی اس کے شواہد موجود نہیں ہیں۔ شاید **بہیر** اور **زوہر** کے ذریعے ہی اس

عقیدے کو یہودیوں میں رواج ملا ہے۔اس عقیدے کے مطابق گلگل ایک ایسی منزل ہے جس کے لیے روح مختلف مدارج کا سفر کرتی ہے۔

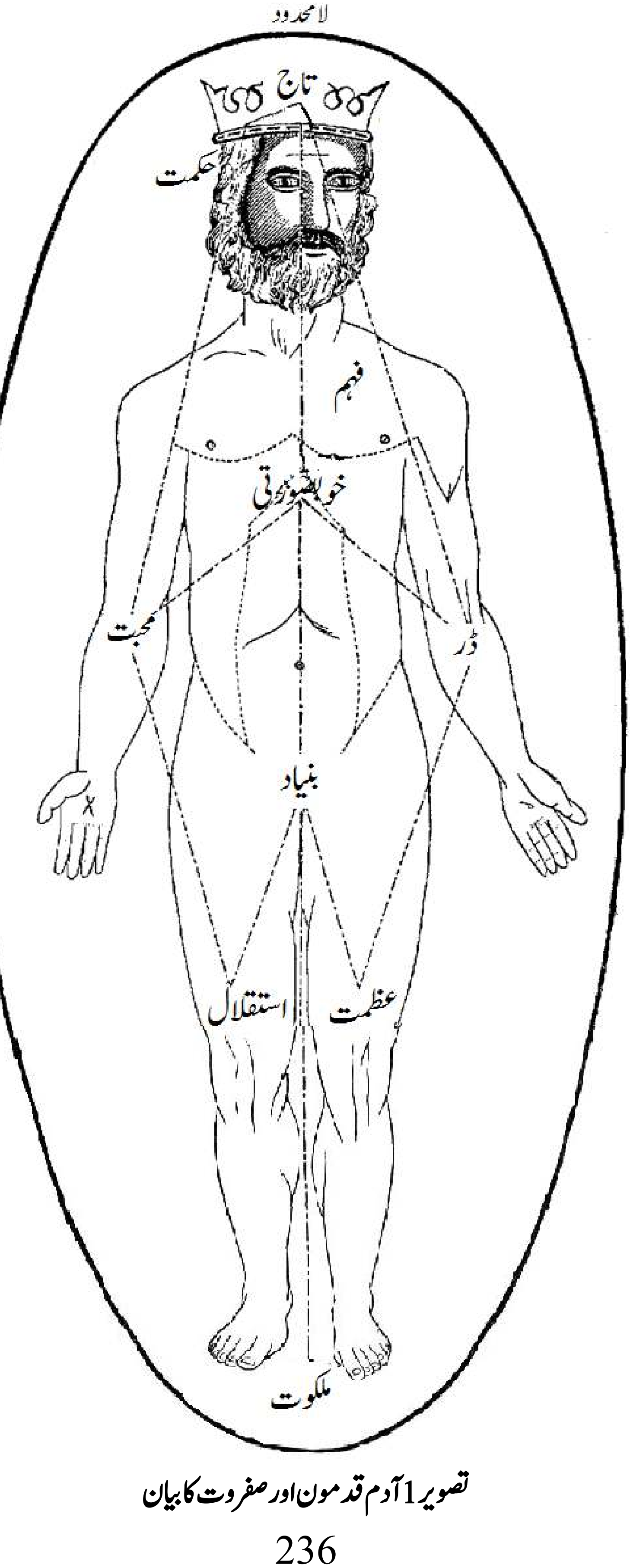

تصویر 1 آدم قدمون اور صفروت کا بیان

روح کی بھی تین حالتیں ہیں جو درج ذیل مختلف صفروت سے منسلک ہیں:

1. نفس یعنی وہ کثیف حالت جو تمام حرکات اور جسمانی خواہشات کا سبب ہے۔اس کا تعلق بنیاد کے صفروت سے ہے۔
2. روح جو اخلاقیات کی تشکیل ہے۔اس کا تعلق خوبصورتی کے صفروت کے ساتھ ہے۔
3. نشاماح جو کہ روح کی اعلیٰ ترین شکل اور عقلی استعداد ہے۔ یہ توریت کی تلاوت اور خدا کے ادراک میں مدد دیتی ہے۔اس کا تعلق حکمت کے صفروت کے ساتھ ہے۔

انسان کی موت کے بعد ہی روح، نشاماح سے آگاہ ہوتی ہے۔ روح اگر پاکیزہ اور ہر لحاظ سے مکمل ہو گی تو یہ "لامحدود، " جس سے یہ جاری ہوئی ہے، مل سکے گی۔اس طرح روح کا ان درجوں میں سفر کرنا گلگل کے ذریعے بیان کیا جاتا ہے جو کے بعد کے قبالیوں میں ایک اہم عقیدہ بن گیا۔

قبالیوں میں "تیکون" یعنی "تقویم/اصلاح" کے ایک نظریے نے بھی فروغ پایا۔اس نظریے کے مطابق کائنات میں "گناہ آدمؑ" کے ذریعے ایک قسم کی غیر آہنگی اور ناسازی پیدا ہو چکی ہے جس کی درستی تیکون کے ذریعہ ہوتی ہے۔ دنیا میں جو بھی اعمال کیے جاتے ہیں وہ نہ صرف اس جہان پر بلکہ اعلیٰ جہانوں پر بھی اثر انداز ہوتے ہیں جو ہم آہنگی یا غیر آہنگی کا سبب بنتے ہیں۔ انسان کا درجہ چونکہ فرشتوں سے اعلیٰ ہے۔ لہذا بنی اسرائیل دنیا میں جو اعمال کرتے ہیں اس کا اثر تمام جہانوں پر پڑتا ہے۔اس لحاظ سے کائنات کی تقویم یا بگاڑ کا ذمہ اسرائیلوں کے سر پر ہے۔اگر وہ اچھے اعمال کر رہے ہوں گے تو کائنات میں تقویم ہو گی اور اگر برے اعمال کر رہے ہوں گے تو اس میں بگاڑ پیدا ہو گا۔

لوری قبالہ

جیسا کہ دوسرے باب میں بیان ہو چکا ہے کہ جب سپین پر صلیبیوں کی حکومت مستحکم ہو گئی تو یہ جگہ یہودیوں کے لیے تنگ ہوتی چلی گئی اور ایک وقت ایسا آیا کہ یہودیوں کو اپنے دورِ زریں کی اس یادگار کو خیر آباد کہنا پڑا۔ سپین سے نکلنے والے زیادہ تر یہودی، سلطنت عثمانیہ میں بستے چلے گئے۔اس دور کے یہودی صوفیا میں مسیح موعود کا تصور شدت سے رواج پانے لگا۔ وہ لوگ یہ چاہتے تھے کہ کسی طرح مسیح کی آمد میں جلدی ہو جائے تا کہ دنیا میں امن و سکون قائم ہو سکے۔اس ضمن میں صفد نے خصوصی کردار ادا کیا۔اسحاق لوریا، یوسف کارو اور موسیٰ بن یعقوب

قرطبیؔ جیسے یہودی صوفیا کو صفد ہی نے جائے پناہ مہیا کی۔ اس شہر نے یہودی روحانیات کا علمبردار بن کر بہت سے صوفیا کی قبروں سے خود کو آراستہ کیا۔ قرطبیؔ نے **زوہر** کی تعلیمات کو عام کیا جو اس سے پہلے مخصوص حلقوں تک محدود تھیں۔ اس کا خیال تھا کہ صفروت "کلیم" یا برتن ہیں جن میں عین سوف کا نور بھرا ہوتا ہے جو مختلف شکلوں میں منعکس ہو سکتا ہے۔ یہ انعکاس خدا کی ربوبیت کے دنیا میں اظہار کا سبب ہے۔

قرطبیؔ کے علاوہ صفد کا ایک اور بڑا نام اسحاق لوریا کا ہے جس کا تعلق مصر سے تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اس نے اپنی زندگی کے سات قیمتی سال دریائے نیل کے کنارے **زوہر** کو سمجھنے میں صرف کیے۔ بعد ازاں، جب وہ صفد آیا تو یہاں اس نے **زوہر** ہی کو بنیاد بناتے ہوئے قبالہ کی نئی تشریحات کا نظام متعارف کروایا جس نے نہ صرف اس وقت کی یہودی روحانیت کو جلا بخشی بلکہ اٹھارویں صدی کی حسیدیت کے لیے بھی بنیادیں فراہم کیں۔ اب یہ ایک باطنی تحریک نہیں رہ گئی بلکہ ایک عقیدے کے طور پر رواج پانے لگی۔ اس کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ قبالہ کو یہودیت کا اہم ترین جزو سمجھا جانے لگا۔ اس میں نفس کشی کے ذریعے گوہر مقصود تلاش کرنے کی کوشش کی جاتی تھی۔

دیگر قبالیین کی طرح اس نے عین سوف ہی کے ارد گرد اپنا تھیوصوفیائی نظام ترتیب دیا۔ اس کے ہاں بھی بائیس عبرانی حروف تہجی اور صفروت کا تصور تقریباً دیگر صوفیا سے ملتا جلتا تھا۔ البتہ دیگر صوفیا، تخلیق کو ایک مثبت عمل جبکہ وہ اسے ایک منفی عمل تصور کرتا تھا۔ اس نے یہ نظریہ پیش کیا کہ مخلوقات کی تخلیق سے پہلے عین سوف کا نور ہر چیز پر حاوی تھا۔ یہ اپنی نوعیت میں لا محدود تھا جس کی وجہ سے کسی قسم کی تخلیق کے لیے جگہ کی گنجائش نہیں تھی۔ تخلیق کو ممکن بنانے کے لیے عین سوف نے اپنے نور کو دبایا جس سے محدود کائنات کی تخلیق کے لیے جگہ بنی۔ تخلیق کے اس عمل کی وضاحت کے لیے اس نے "تسیم تسوم" کی اصطلاح استعمال کی ہے جس کا مطلب "سکڑنا" یا "دبنا" ہے۔ تسیم تسوم منفی اس لحاظ سے ہے کہ اس نے عین سوف کو "الٰہی جلاوطنی" میں مبتلا کر دیا تاکہ مخلوقات کی تخلیق کے لیے گنجائش بن سکے۔

وہ سمجھتا تھا کہ کائنات کی ابتدائی تشکیل آدم قدمون کے طور پر ہوئی۔ بعد ازاں اسی کے اندر صفروت ترتیب پائے جن سے دیگر محدود چیزیں اور انسانی روح وجود میں آئی۔ صفروت آدم

قدمون کی آنکھوں، کان، ناک اور کانوں کے ذریعے جاری ہوئے۔[24] کلیم ان صفروت کی اوپری تہہ تھی جس میں نور بھرا ہوا تھا۔ کلیم اس قدر طاقتور نہ ثابت ہو سکے کہ تخلیق کے عمل کو پوری طرح سہار سکیں جس کی وجہ سے "شفیروت ہا کلیم" یعنی ان کے ریزہ ریزہ ہونے کا عمل وقوع پذیر ہوا۔ یہ خدا کی قدرت کے منافی ہے کہ اس کی بنائی ہوئی چیز کمزور ثابت ہو۔ شفیروت ہا کلیم درحقیقت تخلیق کی مخالفت تھی۔ یہ خدا سے بغاوت سمجھی گئی جو کہ تخلیق کے حق میں تھا۔ اسی بغاوت نے برائی کو جنم دیا۔ اب کائنات دو حصوں میں منقسم ہو گئی: نور کی دنیا جو اوپر تھی اور برائی کی دنیا جو نیچے تھی۔[25] انسان برائی اور اچھائی کے لیے میدان جنگ کی سی حیثیت اختیار کر گیا۔ اس کی فطرت میں علامتی دوئی پیدا ہوئی۔ اس دوئی کی وجہ سے اس کا جسم برائی کی طاقتوں کا محور بنا اور روح مقدس عناصر کی محافظ قرار پائی۔ تخلیقِ آدمؑ سے خدا کا مقصد تھا کہ آدمؑ برائی کی طاقتوں پر قابو پالیں گے لیکن ان کی ناکامی نے برائی کی قوتوں کو مزید طاقتور بنا دیا۔ اب خدا نے ایک انسان کے ذمہ یہ کام لگانے کی بجائے ایک پوری قوم یعنی بنی اسرائیل کو برائی سے نبرد آزما ہونے کے لیے منتخب کیا۔ بنی اسرائیل کا ہر برا کام مثلاً دیگر خداؤں کی عبادت، توریت کی طرف بے توجہی یا اخلاقی اقدار کی پامالی، برائی کو طاقتور کرتی ہے اور ہر اچھا کام برائی کو کمزور کرتا ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ بنی اسرائیل اچھے کام کر کے خدا کی قربت اور برائی کے خاتمے کی کوشش کرے۔

قبالہ کو فروغ دینے میں سباتائی زیوی (1662-1676) کا کردار خاصی اہمیت کا حامل رہا ہے۔ وہ ایک سفاردی ربی تھا جس کی تعلیمات سے متاثر ہو کر سلطنت عثمانیہ میں بسنے والے یہودیوں کی ایک بڑی تعداد اس کی معتقد ہو گئی تھی۔ بعد ازاں اس نے مسیح موعود ہونے کا دعویٰ کیا۔ اس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس کا مقدمہ جب عثمانیوں کے سامنے پیش ہوا تو اس نے اسلام قبول کر لیا یا اس کو زبردستی مسلمان بنا دیا گیا۔ تاہم اس کے بہت سے عقیدت منداس سے متنفر ہونے کی بجائے اس کو بھی اس کی کوئی حکمت عملی سمجھتے رہے۔ ایسا باور کروانے میں غزہ کے ناتھن (1643-1680) کا کردار بھی اہم ہے جس نے اپنی باتوں کے ذریعے زیوی کے لیے دیگر یہودیوں کے دل سے کدورت دور کی۔

حسیدیت

حسیدیت اٹھارویں صدی کے پالینڈ میں فروغ پانے والی ایک یہودی روحانی تحریک تھی

جس کے مختلف ذیلی گروہ یاسلاسل بھی تھے۔ یہ لوگ قبالہ کے بیشتر نظریات کو اپنائے ہوئے تھے۔ اسرائیل بن العیزر (1700-1760) جنہیں بعل شیم توو بھی کہا جاتا ہے، حسیدیت کے بانی تھے۔ بعل شیم توو کو مختصرا "بیشت "یعنی اچھا استاد بھی کہا جاتا ہے۔ اٹھارویں صدی میں فروغ پانے والی یہ تحریک ابتدائی حسیدیوں اور مشہور یہودی روحانی تحریک، حسیدی اشکناز سے مختلف تھی۔ جیسا کہ تیسرے باب میں گزر چکا ہے کہ جدید یوکرائن کی تشکیل نے یہودیوں کو مشکلات سے دوچار کر دیا۔ العیزر کے دور کا پالینڈ یہودیوں کے لیے نسبتاً پر سکون تھا۔ اس نے مختلف مقامات کا سفر کر کے اپنے نظریات کی تبلیغ کی جس سے اسے کافی مقبولیت حاصل ہوئی۔ 1740 میں اس کے شاگردوں کی اچھی خاصی تعداد موجود تھی جنہوں نے بعد میں اس کے نظریات کو پھیلانے میں اہم کردار ادا کیا۔

اگرچہ حسیدیوں کو راسخ العقیدہ یہودیوں کی طرح مذہبی لوگ سمجھا جاتا ہے تاہم ربیائی یہودیت کے نام لیواؤں اور حسیدیوں میں عداوت نے فروغ پایا جس کی وجہ سے ان پر کفر کے فتاوی بھی لگائے گئے۔ ان کے مخالفین کا کہنا تھا کہ یہ لوگ قدامت پرست ہیں، توریت کی تلاوت میں سستی کرتے ہیں، عبادات میں تجاوز کرتے ہیں اور اشکنازی سیدور استعمال نہیں کرتے۔ اس مخالفت میں اس وقت مزید اضافہ ہوا جب یعقوب یوسف نامی ایک حسیدی صوفی نے اپنی تصانیف میں ربیائی یہودیت کو آڑے ہاتھوں لیا۔ نتیجتاً راسخ العقیدہ یہودیوں نے ان کے ساتھ تعلقات ختم کرنے کا اعلان کر دیا اور یوسف کی کتب کو نذر آتش کرنے کا حکم نامہ جاری کیا۔ روسی حکومت سے درخواست کی گئی کہ ان پر پابندی لگائی جائے۔ اس وجہ سے بہت سے حسیدی قائدین پابند سلاسل بھی ہوئے۔ بعد ازاں ان پر پابندیوں کو ختم کر دیا گیا۔

حسیدیت نے ایک طرف تو لوری قبالہ کے بعض نظریات کو اپنایا اور دوسری طرف نفس کشی جیسے تصورات کار د کیا۔ تسیم تسوم کو یہ ایک ظاہری عمل کے طور پر دیکھتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ چونکہ خدا ہر جگہ موجود ہے لہذا اس کا نور ہر جگہ پھیلا ہوا ہے۔ اس کی قربت ہر کسی کو، ہر جگہ، ہر وقت اور ہر حالت میں دستیاب ہے۔ لازمی نہیں ہے کہ عبادات ہی خدا کی قربت کا ذریعہ ہوں۔ روزمرہ کے کاموں میں بھی انسان خدا کی قربت حاصل کر سکتا ہے۔ ان نظریات کو فروغ دے کر حسیدیوں نے یہ تصور دیا کہ روحانیت خاص لوگوں تک محدود نہیں ہے بلکہ عام یہودی

بھی اپنے روزمرہ کے کاموں میں اس کے حصول کی کوشش کر سکتے ہیں۔اس وجہ سے حسیدی، رقص، خوشی اور گانے کو بھی عبادت کا درجہ دیتے ہیں۔ان کے ہاں یہ نظریہ بھی موجود ہے کہ جب کوئی نیک شخص (صدیق/ربی) روحانیت کا اعلی مقام حاصل کر لیتا ہے تو وہ دیگر لوگوں کے لیے بھی اس مقام کے حصول میں معاون ثابت ہوتا ہے۔

تمت بالخیر

مشقی سوالات

مختصر سوالات

1. یہودی روحانیت کا موضوع کیا ہے؟
2. یہودی روحانیت کے کتنے ادوار ہیں؟
3. یہودی روحانیت کو مخفی کیوں رکھا جاتا ہے؟
4. یہودی روحانیت میں اسحاقؑ کے ذبح کے واقعہ کی کیا اہمیت ہے؟
5. حزقی ایلؑ کو کیا روحانی تجربہ ہوا؟
6. مشنا یہودی روحانیت کے متعلق کیا بتاتی ہے؟
7. مرکبہ کیا ہے؟
8. مرکبہ کی تحریک کہاں پھیلی؟
9. مرکبہ کا سوار کسے کہا جاتا ہے؟
10. ادب القصور کسے کہتے ہیں؟
11. صفر کسے کہتے ہیں؟
12. صفر یتزیر کیا ہے؟
13. صفر یتزیر کے مطابق دنیا کیسے بنی؟
14. امہات حروف سے کیا تخلیق ہوا؟
15. عبرانی دوہرے حروف کونسے ہیں؟
16. بارہ حروف سے کیا تخلیق ہوا؟
17. عبرانی حروف کے تین طرح کے معنی کونسے ہیں؟
18. صفر یتزیر صفروت کے متعلق کیا بتاتی ہے؟
19. حسیدی اشکناز کون تھے؟
20. سموئیل بن کلونیمس کون تھا؟
21. یہودا بن سموئیل کون تھا؟
22. علیزر بن یہودا کون تھا؟
23. حسیدی اشکناز عبادت کے متعلق کیا نظریہ رکھتے تھے؟
24. حسیدی اشکناز خدا کی تجسیم کے متعلق کیا نظریہ رکھتے ہیں؟

25. حسیدی اشکناز قرب خدا کے لیے کیا تعلیمات دیتے ہیں؟
26. قبالہ کیا ہے؟
27. قبالہ کی ابتدا کیسے ہوئی؟
28. بہیر کسے کہتے ہیں؟
29. اسحاق سگی نہور کون تھا؟
30. عین سوف کیا ہے؟
31. نبوی قبالہ کیا ہے؟
32. ابراہیم ابوالعفیا کون تھا؟
33. ابراہیم ابو العفیا روح کے متعلق کیا نظریہ رکھتا تھا؟
34. ابو العفیا، ابن میمون کے متعلق کیا کہتا تھا؟
35. موسی دے لیون کون تھا؟
36. زوہر کسے کہتے ہیں؟
37. صفروت کے مختلف معانی کیا ہیں؟
38. سفیروت کے نام لکھیں۔
39. کیتیر سے کیا مراد ہے؟
40. خوخمہ سے کیا مراد ہے؟
41. بیناہ سے کیا مراد ہے؟
42. صفر خیسید سے کیا مراد ہے؟
43. صفر دن سے کیا مراد ہے؟
44. رحیم سے کیا مراد ہے؟
45. تیفیریت سے کیا مراد ہے؟
46. نیتسخ سے کیا مراد ہے؟
47. صفر ہود سے کیا مراد ہے؟
48. صفر ملکوت سے کیا مراد ہے؟
49. یسود سے کیا مراد ہے؟
50. سکینہ سے کیا مراد ہے؟
51. آدم قدمون سے کیا مراد ہے؟
52. ذویکوت کسے کہتے ہیں؟
53. گلگل کسے کہتے ہیں؟
54. روح کی تین حالتیں کونسی ہیں؟
55. تیکون کسے کہتے ہیں؟
56. لوری قبالہ سے کیا مراد ہے؟
57. صفد کیوں مشہور ہے؟
58. موسی بن یعقوب قرطبیؔ کون تھا؟
59. اسحاق لوریا کون تھا؟
60. شیفروت ہاکلیم سے کیا مراد ہے؟
61. تسیم تسوم کسے کہتے ہیں؟
62. کلیم کسے کہتے ہیں؟
63. لوری قبالہ میں تخلیق سے کیا مراد لی گئی ہے؟
64. لوریوں کے نزدیک برائی کی تخلیق کیسے ہوئی؟
65. حسیدیوں اور قبالیوں کے نظریات میں سباتائی زیوی کون ہے؟

کیا فرق ہے؟

66. حسیدیت پر نوٹ لکھیں۔

تفصیلی سوالات

1. یہودیت کے روحانی نظام کا تعارف کروائیں۔
2. تنک میں موجود روحانی واقعات پر نوٹ لکھیں۔
3. مرکبہ روحانیت پر نوٹ لکھیں۔
4. تخلیق اور صفروت پر نوٹ لکھیں۔
5. حسیدی اشکنازپر نوٹ لکھیں۔
6. مرکبہ روحانیت اور حسیدی اشکناز کا تقابل کریں۔
7. بہیر اور زوہر نے قبالہ کی ترویج میں کیا کردار ادا کیا؟
8. صفروت کی مختلف تشریحات پر نوٹ لکھیں
9. قبالہ پر نوٹ لکھیں۔
10. نبوی اور لوری قبالہ کا تقابل کریں۔

حوالہ جات

[1]Ernst Muller, *History of Jewish Mysticism* (Oxford: East and West Library, 1946), 10-11.

[2]Dan Cohn-Sherbok, *Jewish Mysticism: An Anthology* (Oxford: Oneworld Publications, 1995), 15-16.

[3]پیدائش 22

[4]حزقی ایل 1

[5] Sidney Spencer, *Mysticism in World Religions* (Baltimore: Penguin Books, 1963), 176.

[6]Gershom G. Scholem, *Major Trends in Jewish Mysticism* (New York: Schocken Books, 1971), 42.

[7]Muller, *History of Jewish Mysticism*, 43.

[8]Mishnah Chagigah 2

[9]Segal, *Judaism: The Ebook*, 184.

[10]Spencer, *Mysticism in World Religions*, 178.
[11]Scholem, *Major Trends in Jewish Mysticism*, 75.
[12]Cohn-Sherbok, *Jewish Mysticism: An Anthology*, 16-18.

[13]Scholem, *Major Trends in Jewish Mysticism*, 84.

[14]پیدائش 28

[15]Cohn-Sherbok, *Jewish Mysticism: An Anthology*, 19.

[16]Gershom Scholem, Kabblah (New York: Meridian, 1978), 3.

[17]Cohn-Sherbok, *Jewish Mysticism: An Anthology*, 22.

[18]Scholem, *Major Trends in Jewish Mysticism*, 131-32.

[19]Spencer, *Mysticism in World Religions*, 188.

[20]Scholem, *Major Trends in Jewish Mysticism*, 156.

[21]Spencer, *Mysticism in World Religions*, 190-91.

[22]Ibid., 192.

[23]Cohn-Sherbok, *Jewish Mysticism: An Anthology*, 25.
[24]Sanford L. Drob, *Kabbalah and Postmodernism: A Dialogue*, ed. Yudit Kornberg Greenberg, Studies in Judaism (New York: Peter Lang, 2009), 26.

[25]Cohn-Sherbok, *Jewish Mysticism: An Anthology*, 34-35.

کتابیات

Aharoni, Yohanan. *The Jewish People: An Illustrated History*. New York: Contiuum, 2006.

Alfonso, Esperanza. *Islamic Culture through Jewish Eyes: Al-Andalus from the Tenth to Twelfth Century*. London: Routledge, 2008.

Angel, Marc D. "Jews in the Ottoman Empire." In *Encyclopedia of the Jewish Diaspora: Origins, Experiences, and Culture*, edited by Avrum M. Ehrlich. Santa Barbara: ABC-CLIO, 2009.

Ashtor, Eliyahu. "Egypt: Arab Period." In *Encyclopaedia Judaica*, edited by Michael Berenbaum and Fred Skolnik. Detroit: Macmillan Reference US, 2007.

Atkinson, Kenneth. *Judaism*. Philadelphia: Chelsea House Publishers, 2004.

Ayalon, Yaron. "The Wiley-Blackwell History of Jews and Judaism." In *The Wiley-Blackwell Histories of Religion*, edited by Alan T. Levenson. West Sussex: Wiley-Blackwell, 2012.

Azriela Jaffe *Two Jews Can Still Be a Mixed Marriage: Reconciling Differences Over Judaism in Your Marriage*. New Jersey: Career Press, 2000.

Bahat, Dan. "The Herodian Temple." In *The Cambridge History of Judaism: The Early Roman Period*, edited by William David Davie and Louis Finkelstein. Cambridge: Cambridge University Press, 2008.

Bashan, Eliezer. "Omar Ibn Al-Khaṭṭāb." In *Encyclopaedia Judaica*, edited by Michael Berenbaum and Fred Skolnik. Detroit: Macmillan Reference US, 2007.

Ben-Sasson, Hayim Hillel. *A History of the Jewish People*. Cambridge: Harvard University Press, 1976.

Biale, David. *Cultures of the Jews: A New History*. New York: Schocken Books, 2010.

Cassel, D. *Manual of Jewish History and Literature*. Translated by Mrs. Henry Lucas. London: Macmillan, 1913.

Cohen, Mark R. "Jews in the Mamlūk Environment: The Crisis of 1442 (A Geniza Study)." *Bulletin of the School of Oriental and African Studies, University of London* 47, no. 3 (1984): 425-48.

Cohn-Sherbok, Dan. *Jewish Mysticism: An Anthology*. Oxford: Oneworld Publications, 1995.

———. *Judaism*. London: Routledge, 1999.

———. *Judaism: History, Belief and Practice*. London: Routledge, 2003.

———. *Modern Judaism*. London: Macmillan, 1996.

Cohn-Sherbok, Lavinia, and Dan Cohn-Sherbok. *A Short History of Judaism*. Oxford: Oneworld, 1994.

———. *A Short Introduction to Judaism*. Oxford: Oneworld, 1997.

Donin, Hayim Galevy. *To Be a Jew: A Guide to Jewish Observance in Contemporary Life*. New York: Basic Books Inc, 1972.

Dosick, Wayne. *Living Judaism: The Complete Guide to Jewish Belief, Tradition, and Practice*. HarperCollins ebooks, 2009.

Drob, Sanford L. *Kabbalah and Postmodernism: A Dialogue*. Studies in Judaism. edited by Yudit Kornberg Greenberg New York: Peter Lang, 2009.

Efron, John, Steven Weitzman, and Matthias Lehmann. *The Jews: A History*. London: Routledge, 2016.

Eisenberg, Ronald L. *What the Rabbis Said*. California: Praeger, 2010.

Gigot, Francis E. *Outlines of Jewish History: From Abraham to Our Lord*. New York: Benziget Broghers, 1905.

Gil, Moshe. "The Origins of the Karaites." In *Karaite Judaism: A Guide to its History and Literary Sources* edited by Meira Poluack. Boston: Brill, 2003.

Gilbert, Martin. *In Ishmael's House: A History of Jews in Muslim Lands*. London: Yale University Press, 2010.

Grabbe, Lester L. *An Introduction to Second Temple Judaism: History and Religion of the Jews in the Time of Nehemiah, the Maccabees, Hillel and Jesus* London: T&T Clark International, 2010.

Grayzel, Solomon. *A History of the Jews: From the Destruction of Judah in 586 BC to the Present Arab Israeli Conflict* New York: The Jewish Publication Society of America, 1968.

Halbertal, Moshe. *Maimonides: Life and Thought*. New Jersey: Princeton University Press, 2015.

Harris, Maurice H. *History of the Mediaeval Jews: From the Moslem Conquest of Spain to the Discovery of America*. New York: Bloch Publishing, 1921.

Harvey, E. Goldberg. *Jewish Passages: Cycles of Jewish Life*. 1 ed. London: University of California Press, 2003.

Hengel, Martin. *Judaism and Hellenism: Studies in their Encounter in Palestine during the Early Hellenistic Period*. Translated by John Bowden. Philadelphia: Fortress Press, 1981.

Hogan, Matthew. "The 1948 Massacre at Deir Yassin Revisited." *Historian* 63, no. 2 (2001).

Johnson, Paul. *A History of the Jews*. New York: Harper Peennial 1988.

Josephus, Flavius. *The Jewish War of Flavius Josephus : With His Autobiography*. edited by Isaac Taylor London: Houlston and Stoneman, 1847.

Kalir, Joseph. *Introduction to Judaism*. Washington, D.C: University Press of America, 1980.

Kaplan, Dana Evan. *American Reform Judaism: An Introduction*. London: Rutgers University Press, 2003.

Kaplan, Marion A. *Jewish Daily Life in Germany 1618–1945*. New York: Oxford University Press, 2005.

Karady, Victor. *The Jews of Europe in the Modern Era: A Socio-historical Outline*. Central European University Press: Budapest, 2004.

Kent, Charles Foster. *A History of the Jewish People During the Babylonian, Persian, and Greek Periods*. New York: Charles Scribners's Sons, 1899.

Koner, Melvin. *Unsettled: An Anthropology of Jews*. New York: Penguin, 2004.

Lange, Nicholas de. *An Introduction to Judaism*. Cambridge: Cambridge University Press, 2004.

Lupovitch, Howard N. *Jews and Judaism in World History*. London: Routledge, 2010.

Magnus, Katie. *Outlines of Jewish History: B.C 586 to C.E 1885*. Londin: Longiaians, Green, and Co., 1886.

Maimonides, Moses. *The Guide for the Perplexed*. Translated by Michael Friedländer. Skokie: Varda Books, 1904.

Mansoor, Menahem. *Jewish History and Thought: An Introduction*. New York: KTAV Publishing House, 1991.

Martin, Sean. *The Black Death*. Harpenden: Pocket Essentials, 2007.

Menocal, María Rosa. *The Ornament of the World: How Muslims, Jews, and Christians Created a Culture of Tolerance*. New

York: Little, Brown and Company, 2002.

Moore, Gorge Foot. *Judaism In the First Centuries of the Christian Era: The Age of Tannaim*. Massachusetts: Hendrickson Publishers, Inc., 1960.

Morrison, Martha A., and Stephen F. Brown. *Judaism*. World Religions. edited by Joanne O'Brien and Martin Palmer New York: Chelsea House Publishers, 2009.

Muller, Ernst. *History of Jewish Mysticism*. Oxford: East and West Library, 1946.

Murphy, Frederick J. *Early Judaism from the Exile to the Time of Jesus*. Peabody: Hendrickson Publishers, Inc, 2002.

Nissan, Rubin. *Time and Life Cycle in Talmud and Midrash: Socio-Anthropological Perspectives*. First Edition ed. Boston: Academic Studies Press, 2008.

Nodet, Etienne. *A Search for the Origins of Judaism: From Joshua to the Mishnah*. Translated by Ed Crowley. Sheffield: Sheffield Academic Press, 1997.

Nodet, Étienne. "Asidaioi and Essenes." In *Flores Florentino: Dead Sea Scrolls and Other Early Jewish Studies in Honour of Florentino García Martínez*, edited by Anthony Hilhorst, Émile Puech and Eibert Tigchelaar. Boston: Brill, 2007.

Orlinsky, Harry M. "The Septuagint and its Hebrew Text." In *The Cambridge History of Judaism: The Hellenistic Age*, edited by William David Davie and Louis Finkelstein. Cambridge: Cambridge University Press, 2008.

Roitman, Jessica Vance. *The Same but Different?: Inter-cultural Trade and the Sephardim,1595–1640*. Brill's series in Jewish Studies. edited by David S. Katz. Vol. 42, Boston: Brill, 2011.

Roth, Cecil. *The Jewish Contribution To Civilization*. New York: Harper & Brothers Publishers, 1940.

Rozen, Minna. "The Ottoman Jews." In *The Cambridge History of Turkey: The Later Ottoman Empire, 1603 – 1839*, edited by Suraiya N. Faroqhi. New York: Cambridge University Press, 2006.

Sandgren, Leo Duprée. *Vines Intertwined: A History of Jews and Christians from the Babylonian Exile to the Advent of Islam*. Peabody: Hendrickson Publishers, 2010.

Schloss, Chaim. *2000 Years of Jewish History: From the Destruction of the Second Bais Hamikdash Until the Twentieth Century*. Jerusalem: Feldheim Publishers, 2002.

Scholem, Gershom G. *Major Trends in Jewish Mysticism*. New York: Schocken Books, 1971.

Schurer, Emil. *The History of the Jewish People in the Age of Jesus Christ (175 B.C.-A.D. 135)*. 2nd ed. Edinburgh: T. & T. Clark Ltd., 1979.

Segal, Eliezer. *Judaism: The Ebook*. JBE Online Books, 2009.

Smallwood, E. Mary. *The Jews under Roman Rule: From Pompey to Diocletian* Lieden: Brill, 1976.

Smith, Dennis E. *From Symposium to Eucharist: The Banquet in the Early Christian World*. Minneapolis: Fortress Press, 2003.

Spencer, Sidney. *Mysticism in World Religions*. Baltimore: Penguin Books, 1963.

Steinberg, Milton. *Basic Judaism*. New York: HBJ, 1975.

Stillman, Norman A. *The Jews of the Arab Lands: A History and Source Book*. Philadelphia: The Jewish Publication Society of America, 1979.

Sussman, Lance J. "Reform Judaism." In *Encyclopedia of American Jewish History*, edited by Stephen H. Norwood and Eunice G. Pollack. Santa Barbara: ABC-CLIO, Inc., 2008.

Weitzman, Michael P. *The Syriac Version of the Old Testament (University of Cambridge Oriental Publications)*. New York: Cambridge University Press, 1999.

Wylen, Stephen M. *The Jews in the Time of Jesus: An Introduction*. New York: Paulist Press, 1996.

ڈار، بشیر احمد، **تاریخ تصوف: قبل از اسلام**۔ لاہور: مکتبہ جدید پریس، 2013ء۔

رانا، احسان الحق، **یہودیت و مسیحیت**۔ لاہور: مسلم اکادمی، 1981ء۔

سید، رضی الدین، **یہودی سیاست: ماضی سے حال تک**۔ لاہور: شرکت الامتیاز، 2018ء۔

شرر، عبدالحلیم۔ **تاریخ یہود**۔ لکھنؤ: دلگداز پریس، 1925۔

مودودی، ابوالاعلی، **یہودیت قرآن کی روشنی میں**۔ لاہور: ادارہ ترجمان القرآن، 2000ء۔

ABOUT THE AUTHOR

Zohaib Ahmad is Assistant Professor in the Faculty of Islamic Learning at the Islamia University of Bahawalpur, Pakistan. His interest in Judaism and Islam underlies his research into Maryam Jameelah (née Margret Marcus), an American Jew who converted to Islam and migrated to Pakistan. As a member of Islamia's Department of World Religions and Interfaith Harmony, he is currently developing a Master's program in comparative religion. This background well qualifies him to author what to my knowledge is the first academic treatment in Urdu of Judaism as a world religion.

Written for students who likely have either no knowledge of Judaism— especially from Jewish viewpoints—or else come to the subject with preconceptions highly colored by political and religious polemics, this book offers a comprehensive introduction to the Jewish tradition from religious, historical, and cultural perspectives. After touching on the always vexing question of just who is a Jew, Professor Ahmed takes up the history of Jews and Judaism from biblical times to the present. He provides an expansive view of foundational Jewish religious literature, covering not only the Tanakh (the Jewish "Bible") and the Talmud (the sacred Oral Law) but a host of other rabbinic commentaries and extra-rabbinic writings as well. Later chapters deal with central religious ideas and practices, life-cycle rituals and the annual festival calendar, sectarianism ancient and modern, and mysticism.

Displaying wide familiarity with Jewish scholarship, this book is intended to provide an introduction to the oldest Abrahamic religion and a framework for carrying on informed conversations both with and about Jews and their faith.

Charles L. Cohen, E. Gordon Fox Professor Emeritus, University of Wisconsin-Madison; Former Director, Lubar Institute for the Study of the Abrahamic Religions

ISBN 978-969-7988-04-4

9 789697 988044